یادگار حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی

برہان

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی دینی ماہنامہ

DEC

مرتب

عمید الرحمٰن عثمانی

اس شمارے میں

زرِ تعاون
فی پرچہ ۶ روپے
سالانہ ۷۲ روپے
کمپیوٹر کتابت
CREATIVE VISION

جملہ خط وکتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ
منیجر ماہنامہ برہان
4136 - اردو بازار جامع مسجد دہلی-110006 * فون نمبر 3262815

عمید الرحمٰن عثمانی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے۔ اور اس کا آئین سیکولر قدروں پر ہی مرتب کیا گیا ہے۔ آئین سازوں نے بہت سوچ سمجھ کر اور ملک کے تمام جغرافیائی حالات کے پیش نظر آئین تشکیل دیا تھا جس کے تحت ہندوستان میں ہر شخص کو مذہبی آزادی دی گئی ہے۔ کوئی بھی ہندوستانی باشندہ اپنی خواہش و مرضی سے کسی بھی مذہب کو اپنا سکتا ہے۔ مذہبی بنیاد پر کسی کے ساتھ بھی کوئی بھید بھاؤ یا امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جائے گا یعنی ہندوستان کا آئین ہر مذہب کے ماننے والے کو اسکے جان و مال کی گارنٹی دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی بھی مذہب کو برا کہتا ہے یا کسی فرد کو اس کے مذہب کی بنا پر کسی طرح کا نقصان پہونچاتا ہے تو ہندوستان کے آئین میں ایسے اشخاص کے خلاف سخت ترین قوانین ہیں جن کی بنا پر اسے سخت سے سخت سزا دی جاسکتی ہے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کے سیکولر آئین کی غیر ممالک میں بھی بڑی تعریف و ستائش کی جاتی ہے۔ ہندوستان کے سیکولر آئین کو ہر ملک میں پسند کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے ہندوستان کا درجہ دوسرے ممالک میں اونچا ہے۔ ہندوستان کا وقار اسی وجہ سے بلند و بالا ہے۔ ہر ملک میں ہندوستان کے سیکولر آئین کی وجہ سے ہندوستان کی عزت و توقیر ہے۔ اور یہ بات ہر ہندوستانی کے لئے فخر و انبساط کا باعث ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہندوستان کے فرقہ پرستوں کو اس سے پریشانی لاحق ہے۔ وہ اپنے عمل و کردار اور شرمناک حرکتوں سے ہندوستان کے اس قابل تعریف و ستائش سیکولر آئین کی دھجیاں اڑانے میں کوئی شرم و عار محسوس نہیں کرتے ہیں۔ بابری مسجد کی انہدام پر ان فرقہ پرستوں نے جس فخر و مسرت کا اظہار کیا اس سے نہ صرف ہندوستان کی عزت خاک میں ملی بلکہ ہندوستان پر اس شرمناک واقعہ کی وجہ سے جو مصیبتوں کے پہاڑ نازل ہوئے اسے دیکھتے ہوئے ہمیں یہ کہنے میں کوئی جھجھک نہیں ہے کہ ہندوستان کے سب سے بڑے دشمن و غدار یہ ہی فرقہ پرست ہیں جو ہندوستان

کو دوسرے ممالک میں بدنام کرنے پر تلے ہوئے ہیں ۔ فرقہ وارانہ فسادات تو ہوتے ہی رہتے ہیں اور اس میں بے گناہ دبے قصور افراد مارے جاتے ہیں بچے یتیم ہوتے ہیں اور عورتیں بیوہ ہوتی ہیں اور یہ فرقہ پرست ان کی مصیبتوں اور پریشانیوں پر اپنے یہاں لعی کے چراغ جلاتے ہیں ایسے لوگ ملک اور معاشرہ پر دھبہ ہیں لیکن یہاں عجیب صورت حال ہے ایسے فرقہ پرست تنگ نظر افراد اکڑ کر دندناتے پھرتے ہیں ۔ اپنے کو "ہیرو" کہلواتے ہیں ۔ جبکہ یہ لوگ تو اس قابل ہیں کہ ان پر ہر طرف تھوتھو ہو ان کو ہر جگہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے ان پر ہر طرح کی لعنت و پھٹکار برسائی جائے ۔

گجرات ، مدھیہ پردیش ، یوپی اور اڑیسہ میں عیسائیوں پر شرمناک حملے ہوئے عیسائی مشنریوں کے خلاف شر انگیز مہم چلائی گئی اور ان کو ملک کے لئے زبردست خطرہ بتا کر ان کے خلاف ایسی فضا بنائی گئی جس سے ان کے لئے ہندوستان میں نفرت ہی نفرت پیدا ہو چنانچہ فرقہ پرست اپنے اس ناپاک مقصد میں کامیاب ہوئے جس کے نتیجہ میں گجرات کے مختلف علاقوں میں گرجا گھروں اسکولوں ، اسپتالوں اور عبادت گھروں پر حملے کئے گئے انکیں توڑا پھوڑا اور نذر آتش کیا گیا گجرات میں ایسے ۲۸ واقعات ہوئے ہیں جس کی وجہ سے ہندوستان باہر کی دنیا میں بدنام و رسوا ہوا ہے امریکہ ، برطانیہ پوپ پال اور عالمی کلیسا نے انتہائی سخت الفاظ میں ان غیر انسانی اور مذہب دشمن کارروائیوں کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کی ہے ۔

حکومت ہند کو صاف الفاظ میں بتادیا ہے کہ اگر ان واقعات کے خلاف مؤثر ، ٹھوس اور نتیجہ خیز کارروائی نہیں کی گئی تو پھر وہ غور کریں گے کہ عیسائیوں کی جان و مال کے لئے کیا کرنا چاہیئے ۔ ابھی عیسائیوں پر حملے کے خلاف آواز اٹھائی جارہی تھی کہ اس درمیان میں اڑیسہ کے منوہر پور میں آسٹریلیا کے مشنری اور ان کے دو معصوم بچوں کو ایک جیپ میں زندہ جلا دینے کا افسوسناک و شرمناک اور دل دہلا دینے والا واقعہ رونما ہو گیا جس سے ہر ہندوستانی کا سر شرم و ندامت سے جھک گیا ۔ آسٹریلیا کا یہ بے گناہ مقتول مشنری تقریباً تیس سال سے اپنا وطن چھوڑ کر ہندوستان کے دیہاتوں میں

غریب و بے سہارا مجبور و بیکس بیمار و معذور لاغر افراد کی دل و جان سے بے لوث خدمت میں منہمک تھا۔ اپنے آرام و آسائش کو خیر باد کہتے ہوئے اس نے ہندوستان کے بے سہارا باشندوں کی ہر طرح تیمار داری کرنا اپنی زندگی کا نصب العین بنا رکھا تھا۔ ایسے خادم انسانیت کو فرقہ پرستوں نے جس درندگی سے اس کے دو معصوم بچوں کے ساتھ اس کی بوڑھی بیوی کی موجودگی میں زندہ جلایا ہے اسے اب تک کی درندگی سے زیادہ شرمناک درندگی کی تاریخ میں دیکھا جائے گا اور اس تصورِ احساس نے ہمارے رونگٹے کھڑے کر دیئے ہیں کہ جب آنے والی نسلیں اس درندگی کی تاریخ کا مطالعہ کریں گی تو وہ ہندوستانی عوام کے بارے میں کس قدر بُرے خیالات اپنے دل و دماغ میں پیدا کریں گی۔ موجودہ حکومت کے بارے میں ہم کیا خیال ظاہر کریں جبکہ ہندوستان میں اس سے پہلے کانگریس کی بھی لمبے عرصے تک حکومت قائم رہی ہے۔ اس دوران میں مسلم اقلیت پر جو ظلم وستم روا رکھا گیا وہ بھی دردناک صورت سے کم نہیں ہے۔

کیا لوگ بھول گئے ہیں کہ علی گڑھ، جمشید پور، بھوپال و ساگر مدھیہ پردیش، بھاگلپور، مالیگاؤں و بھیونڈی، ملیانہ و ہاشم پورہ وغیرہ میں کس قدر ظلم وستم ہوا اس وقت ظلم وستم کا نشانہ عیسائی نہیں مسلمان تھے۔ کانگریس سیکولر قدروں کی امین کہتی ہے کیا اس نے اپنے دورِ اقتدار میں ان واقعات کے ملزموں کو نشاندہی کی انھیں پکڑا انھیں کسی قسم کی سزا دی! آج بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت ہے تو زبردست شور و غوغا ہے سب حکومت کو تو موردِ الزام ٹھہرا رہے ہیں مگر کوئی اس بات پر غور کرنے کو تیار نہیں ہے کہ آخر کب تک ہندوستان میں اس قسم کے واقعات ہوتے رہیں گے اور آخر یہ واقعات کیوں ہو رہے ہیں۔ جبکہ اس ملک کے آئین میں اس قسم کے واقعات ہونیکی کسی بھی طرح اجازت نہیں ہے۔ فرقہ وارانہ ذہنیت ہندوستانی سماج سے کس طرح دور کی جائے لمحہ فکریہ ہے نہ کہ یہ کہ یہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے دور میں ہوا ہے اس لئے اس کی چاروں طرف سے مذمت کی جائے۔ آج بھارتیہ جنتا پارٹی حکمراں ہے۔ کل کانگریس یا یونائیٹڈ فرنٹ کی ہندوستان میں حکمرانی تھی اس وقت بھی فرقہ وارانہ فسادات ہوتے تھے۔ انتہائی شرمناک اور

درندگی کے واقعات رونما ہوئے بابری مسجد کا انہدام بھی کانگریس کی مرکزی حکومت کے دور میں ہوا۔ ہمارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ان فرقہ وارانہ و شرمناک واقعات کا الزام کانگریس بھارتیہ جنتا پارٹی یا کسی دیگر پارٹی پر لگا کر ایک طرف بیٹھ جانا یہ فرقہ وارانہ ذہنیت کے خلاف اپنی اپنی ذمہ داری کو ایمانداری کے ساتھ نبھانا نہیں ہے بلکہ سیاسی مفاد پرستی، خودغرضی مطلب برآوری کے زمرہ ہی میں اسے دیکھا جائے گا۔ فرقہ وارانہ فسادات و واقعات پر سیاسی لیڈران جس طرح اپنا ردِ عمل ظاہر کرتے ہیں ہمیں تو اس پر ان کی نیت ہی پر شبہ ہوتا ہے۔ وہ ان فسادات کے خلاف سنجیدگی و ایمانداری سے مشوش نہیں ہیں۔ ان فسادات کے خلاف آج بھارتیہ جنتا پارٹی کو موردِ الزام ٹھہرا کر اس کی سخت سے سخت الفاظ میں مذمت کر دی جائے گی ————
لیکن اگر یہ ہی فسادات و شرمناک واقعات کسی غیر بھارتیہ جنتا پارٹی یا کانگریس کے دورِ اقتدار میں ہو جاتے ہیں تو پھر اس کی بھی مذمت کرنی پڑے گی۔ مذمت کرتے رہیئے اس میں وقت گنواتے رہیئے آج بھارتیہ جنتا پارٹی کل کانگریس کی پرسوں کسی اور پارٹی کی، کوئی یہ نہیں سوچتا کہ آخر جب ہمارا آئین سیکولر ہے اور ہندوستانی عوام کا مزاج سیکولر ہے مسا دیانہ ہے تو پھر ایسے واقعات کیوں ہوتے ہیں کیا صورت ہو ایسی کہ جس سے آئندہ ایسے دردناک اور شرمناک واقعات رونما ہوں ہی نہ۔
برہان کا نظریہ اس سلسلے میں صاف ہے کہ ہمارے سیاسی راہ نماؤں کو اصل مرض کی تشخیص کر کے اس کے علاج کی طرف سنجیدگی و متانت کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے۔ فرقہ وارانہ ذہنیت کی تلاش اور نشاندہی کرنی چاہیئے جس کی وجہ سے یہ فرقہ وارانہ فسادات ہوتے ہیں!

گجرات و مدھیہ پردیش وغیرہ جگہوں پر عیسائیوں پر حالیہ حملوں کے سلسلے میں بعض سیاسی جماعتوں کے لیڈروں نے بجرنگ دل، وشو ہندو پریشد اور آر ایس ایس پر الزامات کی بوچھار شروع کر دی ہے ان کے خیال میں ان حملوں کے پیچھے ان ہی مذکورہ بالا ہندوتو پر مشتمل تنظیموں کا ہاتھ ہے لیکن ہم انتہائی عاجزی و انکساری کے ساتھ ان لیڈران سے یہ معلوم کرنا چاہیں گے کہ مالیگاؤں و بھیونڈی، علی گڑھ، ساگر و جمشید پور ملیانہ و ہاشم پورہ وغیرہ میں جب بھیانک فرقہ وارانہ فسادات رونما ہوئے تھے اور جسمیں غریب ولاچار اقلیت کا جان و مال کا بے حساب نقصان ہوا تھا اس وقت

کیا یہ مذکورہ بالا تنظیمیں موجود تھیں ؟ اس وقت سیکولر قدروں کی امین کانگریس مضبوط اکثریت کے ساتھ حکمراں تھی اور سیکولرزم کا مضبوط ستون پنڈت جواہر لال نہرو بلا شرکت غیرے کے مسلّمہ ہندوستان کے راہنما تھے۔ ان کے بعد ان کی صاحبزادی شریمتی اندرا گاندھی کے دور اقتدار میں بھی فرقہ وارانہ فسادات موجودہ فسادات سے بھی زیادہ سخت بھیانک ہوتے رہے اور آج تو ان فرقہ وارانہ فسادات کی کی مذمت کرنے اور ان فسادات کے شکار افراد سے ہمدردی رکھنے والے کثیر تعداد میں ہر جماعت میں چاروں طرف نظر بھی آتے ہیں۔ اس وقت تو کوئی ان فسادات کی اس طرح مذمت بھی نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی فسادات کے شکار لوگوں سے ہمدردی کرنے والا بھی نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ الٹا فسادات کے شکار افراد ہی کو موردِ الزام ٹھہرایا جاتا تھا۔ آج صورت حال بالکل مختلف ہے آج فرقہ وارانہ فسادات کو بُرا کہنے اور اسکے شکار افراد سے ہمدردی کی آواز بلند ہوتی ہے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن سے بھی اور اخبارات سے بھی۔ پہلے تو یہ سب باتیں بھی نادار د تھیں۔

لہٰذا ہماری رائے میں فرقہ وارانہ ذہنیت کو کس طرح ختم کیا جائے اور یہ فرقہ وارانہ فسادات کا مسئلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کس طرح ختم کیا جائے وہ کیا حل ہے جس سے ہندوستان سے یہ لعنت مٹ جائے تہس نہس ہو جائے۔ ارباب حل وعقد کو اس طرف اپنی تمام تر توجہ مرکوز کر دینی چاہیئے۔

ہمارے ملک کے ایک سابق کارٹونسٹ اور حال کے شیو سینا چیف بال ٹھاکرے بھی عجیب و غریب دماغ کے انسان ہیں۔ انھیں غصّہ آتا ہے تو کبھی ہندوستانی فلم کے پردہ کے شہنشاہ یوسف خاں پر من گھڑت الزامات لگانا شروع کر دیتے ہیں اور کبھی ایسی ایسی باتیں منہ سے نکالنے لگتے ہیں جو کسی پاگل انسان پر تو زیبا دیتی ہیں مگر اچھے بھلے مانس انسان پر قطعاً اس کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ابھی حال ہی میں انہوں نے ہندوستان میں پاکستانی کھلاڑیوں کو کرکٹ میچ نہ کھیلنے دینے کی دھمکی دے ڈالی۔ انہوں نے ساتھ میں یہ بھی کہہ ڈالا

کہ تمام ملک میں شیو سینا کے ورکر کسی بھی جگہ پاکستانی کھلاڑیوں کے میچ کو نہ ہونے دینے کے لئے میرے حکم کے منتظر رہیں گے۔ چنانچہ ان کے حکم کی تعمیل یا کسی دیگر کے حکم کی تعمیل سے کچھ سر پھروں نے دہلی میں کھیل اسٹیڈیم کی پچ ہی کھود ڈالی، جبکہ اس جگہ شیو سینا چیف کی دھمکیوں کی وجہ سے زبردست پولس پہرہ تھا۔ اور اس کے کچھ دن بعد ہی بمبئی میں ہندوستانی کرکٹ کنٹرول بورڈ کے دفتر میں بھی کچھ شرپسندوں نے زبردست توڑ پھوڑ اور آتشزنی کی واردات انجام دے ڈالی۔ جس کے نتیجہ میں ہندوستانی کرکٹ کنٹرول بورڈ کا قیمتی سامان یادگار و تاریخی اور نادر و نایاب تمغے وغیرہ ضائع ہو کر رہے۔ کروڑوں روپے کا نقصان جو ہوا وہ الگ ہے۔ اس کے بعد ہندوستان کے وزیر داخلہ بہادر شیو سینا چیف سے ملاقات کرنے ان کے دولت کدہ پر حاضری سے مشرف ہوئے تو نہ معلوم کیا راز و نیاز ہوا کہ شیو سینا چیف ایک سال تک پاکستانی کھلاڑیوں کے ہندوستان میں کرکٹ کھیلنے کے لئے رضامند ہو گئے۔ گویا شیو سینا چیف کی انگلیوں پر ہندوستان کا ڈھانچہ چل رہا ہے۔ حکومت اور پولس سب بے بس ہیں۔ فوج کیا کرے۔ اس کی خدمات سے یہ سیاسی راہنما مستفیض ہونا ایسے موقع پر باعث شرم سمجھتے ہیں؟

اس موقع پر وزیر اعظم اٹل بہاری کا یہ جملہ خوب لطیفہ کے طور پر یاد رہے گا کہ یہ رات کے اندھیرے میں کوئی سورما پچ نہیں کھودا کرتا۔ یہ بہادری نہیں ہے۔ اگر بہادری دکھانی ہے تو سرحدوں پر جا کر غیر ملکی دشمنوں کا مقابلہ کیا جائے۔" اس کے جواب میں شیو سینا چیف نے فرمایا کہ ہم بہادر ہیں ہمیں ہتھیار مہیا کئے جائیں تاکہ ہم سرحد پر جا کر اپنی بہادری کے جوہر بھی دکھا دیں۔" شیو سینا چیف کے اس جواب پر نئی دہلی سے شائع ہونے والے کثیر الاشاعت ہندی اخبار نو بھارت ٹائمز کے اداریہ میں اس لاجواب جملے نے بڑا ہی مزہ دیدیا کہ "کیا پچ کھودنے کے لئے حکومت سے پھاوڑے مانگے تھے جو سرحد پر دشمنوں سے لوہا لینے کے لئے ہتھیار مانگے جا رہے ہیں۔" اسے کہتے ہیں نہلے پہ دہلہ۔")

ہندوستان اور پاکستان دو پڑوسی ملک ہیں۔ ان کا فائدہ آپس میں دشمنی کشیدگی

میں نہیں بلکہ دوستی میں ہے ۔ اور بقول وزیر اعظم جناب اٹل بہاری باجپئی، پڑوسی کبھی الگ نہیں ہو سکتا ہے ۔ اس لئے دونوں ملک ہمسایہ پڑوسی پڑوسی محبت و بھائی چارہ کے ساتھ اپنے اپنے ملک کے عوام کی فلاح و ترقی اور روشن مستقبل کے لئے اپنی تمام تر توانائی صرف کریں تو یہ دونوں ہی کے لئے ہر لحاظ سے بہتر ہوگا ۔ ہتھیاروں کی دوڑ میں فوجی ساز و سامان کے لئے ایک دوسرے سے سبقت لیجانے کی خواہش سے دونوں میں کسی ملک کا بھلا نہ ہوگا نہ ہی عوام کی اقتصادی حالت میں سدھار ہوگا اور نہ ہی مہنگائی پر قابو پایا جا سکے گا ۔ مقام شکر ہے کہ دونوں ملک کے عوام اور ان کے راہنماؤں نے اس حقیقت اور ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے آپس میں فروعی اختلافات کو دور کرنے کے لئے بات چیت و آمد و رفت کا سلسلہ شروع کر دیا ہے ۔ اور اس کی شروعات ہندوستان کے وزیر اعظم جناب اٹل بہاری باجپئی نے واگھہ بوڈر سے بذریعہ بس لاہور جاکر کی ہے ۔ ۲۱ فروری سنہ ۱۹۹۹ء ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کی تاریخ میں ایک یادگاروں کے طور پر یاد رکھا جائے گا کہ اس دن ہندوستان کے وزیر اعظم بس میں بیٹھ کر لاہور پہنچے جہاں ان کا گرم جوشی کے ساتھ استقبال کرنے کے لئے پاکستان کے وزیر اعظم جناب محمد نواز شریف موجود تھے ۔ اور ان کے ساتھ دونوں ملکوں کے عوام کی نیک تمنائیں نیک خواہشات ہیں ۔ جس طرح ان دونوں ملکوں کے راہنماؤں نے حقیقت و سچائی کا احساس کرتے ہوئے دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے اور دونوں ملکوں کے عوام نے اس پر جو جوش و خروش کا مظاہرہ کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے ہمیں امید ہے کہ اب وہ دن دور نہیں جس طرح دونوں جرمنی اپنے آپسی اختلافات کو مٹا کر ایک ہو گئے اسی طرح ہندوستان اور پاکستان بھی اپنے اپنے اختلافات کو مٹا کر یا بالائے طاق رکھ دوستی و محبت اور بھائی چارگی کے اٹوٹ رشتے میں بندھ جائیں گے ۔ انشاء اللہ ۔

قطعاتِ تاریخ وفاتِ شعراء

(قسط ۲)

عبدالرؤف خاں۔ اودئی کلاں (راج) ۳۲۳۲۰۱

داغ :۔ نواب مرزا داغ ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ بدن چہارشنبہ کے دن دہلی میں پیدا ہوئے والد کا نام نواب شمس الدین خاں تھا۔ شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ استاذ ذوق کے شاگرد تھے۔ غدر کے بعد ۱۲۷۲ھ میں رامپور چلے گئے اور تقریباً پینتالیس سال رامپور میں رہے۔ بعد ازاں ۱۳۰۵ھ میں حیدرآباد پہونچے اور سلطانِ دکن کے دربار میں باریاب ہوئے، اور شرف یابی کی یہ تاریخ کہی۔

قدم بوس حضرت کا حاصل ہوا　　　بڑے شوق سے اور ارمان سے

حضوری کی تاریخ پوچھیں اگر　　　یہ کہدو "ملے داغ سلطان سے"[1] ۱۳۰۵ھ

دورانِ سر اور وجع مفاصل (گٹھیا) کی شکایت تھی آخر کار فالج میں وہ نویں ذلحجہ ۱۳۲۲ھ/۱۴ فروری ۱۹۰۵ء کو دنیا سے رخصت ہوئے۔ اس طرح اردو شاعری کا خاتمہ داغ کی ذات پر ہوا۔ اور کہنے والے نے سچ کہا کہ :۔ جناب داغ کا مرنا ہے شاعری کی موت　　وہ مر گئے ہیں تو سمجھو کہ اس کی آئی موت

ان کی وفات کے بے شمار قطعاتِ تاریخ ہیں۔ اُن میں سے چند یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

نویں ذی الحجہ کی شب ہوئے رخصت　　　داغ چھاتی پہ داغ دھر بھی گئے

غل قیامت پہ عیدِ قرباں میں

ہائے وہ داغ آج مر ہی گئے[2] ۱۳۲۲ھ

---

[1] واقعات دارالحکومت دہلی ۲: ۴۵۰

[2] ایضاً ص ۴۵۷ مادہ میں تاریخ مکمل کرنے کے لئے "گئے" کے خلاف اصول ۳۰ عدد لئے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم اختلافی مسائل کے تحت لکھ چکے ہیں۔

نواب عبدالعزیز صاحب ولّا مدراسی نے یہ قطعہ کہا:

میرے استاد داغ نام آور — جو سرِ جمع تھے ہر مقابل پر

اس زمانے میں اُنکی فکرِ بلند — آسماں تھی زمینِ مشکل پر

بلبلِ ہند تھی زباں ان کی — مستند تھی لبِ عنادل پر

آج دنیا سے کر گئے وہ سفر — واصلِ حق ہیں پہلی منزل پر

ہو گیا آج اُن کا بیڑا پار — رہ گئے ہم تڑپ کے ساحل پر

مصرعِ سال ہے فغانِ ولّا

"ہائے وہ داغ دے گئے دل پر" ۱۳۲۲ھ

شفق رضوی عماد پوری نے صنعتِ معجمہ میں درج ذیل قطعہ تاریخ موزوں کیا:

بزمِ سخن میں روشنی پھیلی ہوئی تھی جنکی آہ — چل گئی صرصرِ اجل ہو گیا گل وہی چراغ

لیکے حروفِ معجمہ ہاتفِ غیب نے شفق

سالِ وفات کہدیا: "شاعرِ بیعدیل داغ" ۱۳۲۲ھ

یعنی ش + ب + ی + ی + غ = ۱۳۲۲ھ

داغ کے دیوان گلزارِ داغ میں ایک مشہور شعر ہے:-

آج راہی جہاں سے داغ ہوا — خانۂ عشق بے چراغ ہوا

"اس شعر کے پہلے مصرع سے کئی شعراء نے تاریخیں کہیں یعنی توارد ہوا۔ چند تاریخیں ملاحظہ ہوں، جناب آزاد صاحب شیخ پوری شاگردِ امیر نے تخرجہ سے یہ خالی تاریخ کہی:

داغ کا داغ اور امیر کا داغ — دلِ آزاد داغ داغ ہوا

مصرعۂ سال کہہ کے "دم" نکلا

"آج راہی جہاں سے داغ ہوا" ۱۳۶۶-۴۴=۱۳۲۲ھ

۳ھ غرائب الجمل ص ۳۵ عزیز المطابع حیدرآباد ۱۹۰۸ء

۴ھ گنجینۂ تواریخ از شفق رضوی ص ۲۸ آزاد پریس ڈالی گنج لکھنؤ ۱۳۴۹ھ

۵ھ تاریخ لطیف ص ۳۵ -

جناب کاظم حسین صاحب نے بھی اسی مصرع کو مادۂ تاریخ بنایا تھا:

ہے یہ دیوان داغ کا مصرع　　" آج راہی جہاں سے داغ ہوا"
تھے وہ مقبول اس کی ہے یہ دلیل　　ہوگیا سچ زباں سے جو نکلا

"دم" جو نکلا تو تھا یہ عیسوی سال (کذا ہجری سال)
" آج راہی جہاں سے داغ ہوا"[6] ۱۳۶۶-۴۴=۱۳۲۲ھ

قاضی سید مقصود حسن حیرت شاہجہاں پوری سررشتہ دار عدالتِ خفیہ گیا بیار شاگرد داغ کو بھی توارد ہوا:۔

دست بُرد خزاں سے اے حیرت　　ہائے ویران سخن کا باغ ہوا
مبتلا درد و غم میں ہے ہر ایک　　دل ہوا، دم ہوا، دماغ ہوا
لوگ اجڑا دیار کہتے ہیں　　آج دلی کا گل چراغ ہوا

" دم نکلتا ہے سن کے یہ تاریخ
" آج راہی جہاں سے داغ ہوا"[7] ۱۳۲۲ھ

حافظ سلام الدین صاحب نادر رئیس اجمیر نے بھی اسی مصرع کو مادّہ بنایا!۔

لکھئے نادر مٹا کے " دلی" کو　　آج راہی جہاں سے داغ ہوا[8] ۱۳۲۲ھ

جناب شفق رضوی نے سنہ الٰہی میں بھی تاریخِ وفاتِ داغ برآمد کی:۔

چل بسے افسوس داغ دہلوی　　گل ہوا اردو زباں کا اک چراغ
بے تکلف نام نامی سے شفق
سنہ الٰہی ہے " فصیح الملک داغ" = ۱۳۱۴ سنہ الٰہی اکبر شاہی

---

[6] نشید کاظم ص ۱۳۲
[7] واقعاتِ دارالحکومت دہلی ۲: ۴۵۷
[8] گنجینۂ تواریخ ص ۲۸

صنعت ترصیع میں یعنی جس کے ہر مصرع سے سال برآمد ہو، یہ قطعہ ملاحظہ ہو:-

"نہاں سوزاں و صالِ داغ ہوا" ۱۳۲۲　　" نامناسب ملالِ داغ ہوا" ۱۳۲۲ھ

"نوہی ذلحجہ ماہتاب گیا" 〃　　" روز امجد زوال داغ ہوا" 〃

" ماہِ ذی حجہ میں ہوئی شب وصل" 〃　　" رنج اکبر مآلِ داغ ہوا" 〃

" گیا دنیا سے لطفِ زینتِ شعر" 〃　　" انقطاعِ جمالِ داغ ہوا" 〃

" سن کے یک لخت یہ کلام بدیع" 〃　　" فکر بد انتقالِ داغ ہوا" ۱۹۰۵ء

" اے عطا کیا کہوں رضائے حق" ۱۳۲۲ھ

" لایقِ فہم حالِ داغ ہوا" ۱۳۲۲ھ

" نواب مرزا داغ " سے ہجری سنہ ۱۳۲۲ نیز مرزا خاں داغ " سے عیسوی سنہ ۱۹۰۵ء برآمد ہو رہا ہے باقی بہت سے قطعات کو نظر انداز کیا جاتا ہے:

جلال :- میر ضامن علی جلال لکھنوی ۱۲۵۰ھ/ ۱۸۳۴ء میں پیدا ہوئے شعر و سخن کا ذوق بچپن سے تھا۔ نواب رامپور اور نواب مانگرول کے یہاں ملازم رہے۔ اخیر عمر میں لکھنؤ واپس آگئے اور بعمر چہتّر سال ۴ر شوال ۱۳۲۷ھ مطابق ۲۰ر اکتوبر ۱۹۰۹ء کو راہی ملک بقا ہوئے۔ اُن کے صاحبزادے کمال لکھنوی نے تاریخ کہی:

مہ شوال کی تاریخ چوتھی　　وہ بدھ کا روز تھا آفت کا ساماں

وہ شاعر اٹھ گیا بزم جہاں سے　　کمالِ شاعری جس پر تھا نازاں

کمال آنکھوں سے پنہاں ہیں جلال آج

" چھپا ہے شاعری کا مہر تاباں " [نلہ]

جناب شفق رضوی نے دو قطعات کہے ان میں سے دوسرا یہاں درج کیا جاتا ہے:-

---

نلہ　دوماہی" اکادمی" لکھنؤ جولائی تا دسمبر ۱۹۹۱ جلد ۲ شمارہ ۱-۳ ص ۸۹ بحوالہ لکھنؤ کے چند نامور شعرا جلد اول۔

کیسے کیسے اٹھ گئے اردو زباں کے سرپرست جن کے اٹھ جانے کا دل سے اٹھ نہیں سکتا ملال
تھے امیرؔ کشور یعنی امیر مینائی لکھنؤ! تھے فصیح الملک داغؔ دہلوی شیریں مقال
ایک کے بعد ایک اس دارِ فنا سے چل بسے تھے جو اک ہمسر اُن کے سیّد ضامن جلالؔ
وہ بھی دنیا سے سدھارے لکو شفق سال وفات
"حیف اک نایاب شاعر تھے جلالِ باکمال"[11] ۱۳۲۷ھ

محمد حنیف علی رعبؔ نے نو بند پر مشتمل ایک ترجیع بند مرثیہ کہا جس میں ننانوے اشعار ہیں۔ جس کے آخری بند کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

کیوں نہ اندوہ زا ہو اس کی وفات زندہ سازِ سخن تھی جس کی ذات
کہہ رہا ہوں جلالؔ کو مردہ جو ہے فیضِ سخن سے عینِ حیات
فخر تھا خاندانِ ناسخؔ کا رعبؔ وہ عارفِ رموز و نکات
یہی مصرع ہے بس وفات کا سال
"مرگِ ناسخؔ ہے وائے مرگِ جلالؔ"[12] ۱۳۲۷ھ

نسیمؔ :- مولوی شبیر حسین نسیمؔ بھرتپوری، جن سے راجستھان کا اردو شاعری کے فلک پر روشن ہے، ۱۳۲۷ھ میں فوت ہوئے۔ علامہ سیمابؔ اکبرآبادی نے نہایت عبرت اور حسرت انگیز قطعۂ تاریخ کہا:-

سیمابؔ کل ہوا جو مرا اک جگہ گزر بے چارگی یہاں مجھے سر پیٹتے ملی
پوچھا جو میں نے اُس سے یہ کس کا مزار ہے
بولی "یہی ہے قبرِ نسیمؔ بھرت پوری"[13] ۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء)

---

[11] گنجینۂ تواریخ ص ۲۸۔

[12] کلیاتِ رعبؔ ص ص ۶۵-۳۶۴۔

[13] تاریخ لطیف ص ۵۸۔

یہ قطعہ صنعت مرموز میں ہے ۔

تسلیم :۔ منشی امیر اللہ تسلیم ۱۸۲۰ء میں فیض آباد کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ میں آکر قیام کیا۔ وہ نسیم دہلوی کے شاگرد تھے۔ اپنے عہد میں شاعری کے چوتھے رکن تھے۔ درج ذیل مشہور شعر تسلیم ہی کا ہے :۔

ہائے کب تک نہ میں گھبراؤں گا اے دشتِ جنوں　　　اب تو دامن بھی نہیں ہے کہ بہل جاؤں گا

۱۳۲۹ھ/۱۹۱۱ء میں اکیانوے برس کی عمر میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔ شفق نے تاریخ کہی :۔

جن سے روشن تھا نام مومن کا　　　تھے وہ تسلیم یادگار نسیم

سالِ تاریخ فی البدیہہ شفق

لکھ دے : "روحِ نسیم تھے تسلیم"[۱۴]　　۱۳۲۹ھ

شبلی :۔ مورخِ ہند علامہ شبلی نعمانی، علامہ لاثانی کی ذاتِ گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ موصوف نے ۲۹ر ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ / ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو سفرِ آخرت اختیار کیا۔ حفیظ اللہ خاں حفیظ سکروری اعظم گڑھی نے فارسی زبان میں تاریخ کہی :۔

حسرتا و احسرتا و احسرتا　　　از جہاں فخرِ جہاں شبلی برفت

بہرِ تاریخِ وفاتِ او حفیظ　　　گفت رضواں : "در جناں شبلی برفت"[۱۵]　۱۳۳۲ھ

حالی : خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی کا انتقال ۱۱ر صفر ۱۳۳۳ھ/۳۰ر دسمبر ۱۹۱۴ء کو ہوا۔ یہ تاریخ ہوئی، مگر تاریخ گو کا نام معلوم نہ ہو سکا نہ حوالہ نوٹ کر سکا :۔

اب شاعرانِ ہند میں صد حیف وہ نہ تھا　　　حالی سا قوم میں کوئی رہبر نہیں رہا

غالب کا فیض یافتہ سید کا چہیتا　　　نواب شیفتہ کا وہ دلبر نہیں رہا

---

[۱۴] گنجینۂ تواریخ ص ۲۹ ۔

[۱۵] ماہنامہ معارف اعظم گڑھ اگست ۱۹۸۹ء ص ۱۵۳ ۔

ہاتف نے عیسوی میں کہا سالِ ارتحال
"افسوس کہ مدارِ سخنور نہیں رہا" ۱۹۱۴ء

جالب دہلوی نے فارسی میں قطعۂ تاریخ کہا، جس کا حاملِ تاریخ شعر ہے :-

کس چو پرسد سالِ تاریخِ وفاتش حالیا گو بمش "حالی گزشت از دورِ گردونِ جہاں"[16] ۱۳۳۳ھ

شفق رضوی نے مذکورہ دونوں بزرگوں کا یہ مرثیہ کہا :-

خاک اڑاتی ہے کیوں سر پہ زمیں بار بار پیرہن نیلگوں پہنے ہے کیوں آسماں؟
چاک گریباں ہیں گل غنچے ہیں کیوں سرنگوں صحنِ چمن میں ہیں کیوں بلبلیں محوِ فغاں؟
نثر ہے کیوں سوگوار، نظم ہے کیوں ماتمی دیتی ہے کیوں تعزیت علم کو اردو زباں؟
دیدہ و دل دونوں ہیں جنکے لئے نوحہ گر! اٹھ گئے دُہرے ادیب چل بسے دو نکتہ داں
شبلی مرحوم کا پہلے سنا واقعہ رحلتِ حالی کی پھر آئی خبر ناگہاں
دیکھ لیں اک بیت میں پڑھ کے جو ہیں اہل فن دونوں کے رحلت کے سال صاف شفق ہیں عیاں

"شبلی مرحوم تھے طوطیٔ دہر اک ادیب" ۱۳۳۲ھ
"حالی جنت مکاں سعدیٔ ہندوستاں"[17] ۱۳۳۲ھ

اکبر الہ آبادی :- سید اکبر حسین رضوی نام۔ ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء تاریخ ولادت ہے۔ وہ اپنے زمانے کی عظیم ہستی تھے۔ اردو شاعری میں انہوں نے ایک نئے طرز کی بنا ڈالی جس کے وہ خود ہی موجد اور خود ہی خاتم تھے۔ اکبر کی خاص شہرت ان کی ظرافت، بذلہ سنجی اور لطیف طنزیات پر مبنی ہے ۶ محرم ۱۳۴۰ھ ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء میں رحلت کی۔ شفق رضوی نے تاریخ کہی۔

یوم جمعہ ستہ ماہِ محرم۔ قبل عصر اک زبانِ حال کے کامل سخنور چل بسے
لکھ مع نام و لقب تاریخ کا مصرع شفق
"عارفِ صالح لسان العصر اکبر چل بسے"[18] ۱۳۴۰ھ

---

[16] تاریخ لطیف ص ۳۳ [17] گنجینۂ تواریخ ص ص ۳۱-۳۰ [18] حوالہ مذکور ص ۳۱ -

چکبست :۔ پنڈت برج نارائن چکبست کی ولادت ۱۹ر جنوری ۱۸۸۲ء کو فیض آباد اپنے ننھیال میں ہوئی۔ پانچ سال کی عمر میں اپنی والدہ کے ساتھ لکھنؤ آئے۔ اُس وقت والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ اردو اور فارسی کی تعلیم ایک مولوی صاحب سے گھر پر ہی حاصل کی، ازاں بعد بی اے۔ ایل ایل بی کیا۔ تقریباً ۴۳ سال کی عمر میں ۱۲ر فروری ۱۹۲۶ء کو رائے بریلی اسٹیشن پر جسم کے سیدھی طرف فالج گرنے سے موت واقع ہوگئی۔ ان کی ایک غزل کا مشہور شعر ہے :۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب　　موت کیا ہے انھیں اجزاء کا پریشاں ہونا

کسی طباع تاریخ گو نے تدخلہ کے ساتھ مصرعۂ آخر سے تاریخ کہی :۔

اُن کے مصرع ہی سے تاریخ ہے ہمراہ "عزا"　　۷۸

"موت کیا ہے انھیں اجزاء کا پریشاں ہونا"　　۱۲۶۶ = ۱۳۴۴ھ

پروفیسر حامد حسن قادری صاحب نے چکبست کی کم عمری میں وفات کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے ذوق کے مشہور شعر :۔

کھل کے گل کچھ تو بہار اپنی صبا دکھلا گئے　　حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

کے آخری مصرع کو مادہ بناتے ہوئے تخرجہ میں یہ تاریخ کہی :۔

دل پکار اُٹھا جو ٹوٹا اس طرح "جورِ فلک"　　۳۳۹

"حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے"　　۲۲۶۵-۳۳۹ = ۱۹۲۶ء

(جاری)

---

۱۹ دیکھئے ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی بابت فروری ۱۹۸۳ء ص ۶۔

۲۰ قادری ذکر حفظ گرامر انگریزی حصہ ص ۱۲۸۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور مسلم جانبازانِ حریت

قسط ۲

ڈاکٹر مختار احمد مکی ریڈر و صدر شعبۂ سیاسیات کریم سٹی کالج جمشید پور بہار

سپاہیوں کے علاوہ بڑی تعداد میں آس پاس کے دیہی عوام اور مجاہدین بھی مختلف علاقوں سے آکر اس میں جوق در جوق شامل ہوتے گئے اور تبدریج ان کی تعداد بڑھ کر صرف دہلی میں ستر اسی ہزار تک پہنچ گئی اس جنگ میں خواتین بھی کسی مرد سے پیچھے نہیں تھیں بقول خواجہ حسن نظامی ایک سبز پوش عورت شہر کے لوگوں کو جہاد کے لئے آمادہ کرتی اور کہتی کہ چلو تمہیں خدا نے بہشت میں بلایا ہے شہر کے لوگ اس کی مجاہدانہ صدا سن کر ساتھ ہو جاتے وہ خود بھی ایک بہادر سپاہی کی طرح میدان میں لڑتی بھی تھی کبھی سوار کبھی پیادہ یا تلوار اور بندوق مہارت کے ساتھ چلاتی تھی اس کی ہمت و شجاعت دیکھ کر دوسروں کا حوصلہ بڑھتا (۵) تحریک میں شامل مختلف لوگوں کے مقاصد الگ الگ تھے مثلاً راسخ العقیدہ مسلمان خلافت راشدہ کے نمونہ پر ایک اسلامی ریاست کا قیام چاہتے تھے تو فوجی اپنے مذہب کے دفاع اور اپنے لئے ترقی کے مواقع کے حصول کے خواہاں تھے حکمراں طبقہ اپنی کھوئی ہوئی حکومت کو حاصل کرنا چاہتا تھا تو زمیندار اپنی زمینداری کی بحالی کے لئے کوشاں تھے عوام الناس تبدیل مذہب اور اپنے دین اور دھرم کی بحالی کے لئے سرگرداں تھے ۔ اور انہیں مغلیہ سلطنت کے دوبارہ قیام سے اپنا مقصد پورا ہوتا نظر آرہا تھا۔ اس طرح تمام لوگوں کے مقاصد تو الگ الگ تھے لیکن ان سب کے عمومی دشمن انگریز تھے اور مقصد کے اس اتحاد نے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون پر آمادہ کیا تھا۔ ان کے ایک اعلان نامے میں عام شہریوں سے اپیل کی گئی تھی کہ "ہموطنوں اور مذہب کے وفادار شیدائیوں اٹھو، اٹھو۔ تم سب ایک ساتھ اٹھو فرنگی کافروں کو نیست و نابود کرنے کے لئے جنھوں نے عدل و انصاف کے ہر اصول کو پاؤں تلے روند ڈالا جو ہمارے مذہب کے درپے ہے جس نے ہمارا راج چھین لیا ہمارے ملک کو خاک میں ملانے کا ارادہ کر لیا ہے صرف ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ ہے کہ خوں ریز جنگ کی جائے ۔ یہ آزادی کے لئے جہاد ہے یہ حق و انصاف کے لئے مذہبی جنگ ہے ۔ (۶)

اور محمدن، سرسید احمد خاں، الیگزینڈر ڈف اور سر جان کے [illegible] جیسے [illegible]
[illegible] انقلاب کے پس پشت مسلمانوں کی کوشش کو خاص دخل تھا [illegible]
انہوں نے لئے پٹنہ کے وہابیوں کو ذمہ دار مانا ہے بقول ریکس باغی کا دوسرا نام مسلمان ہے معدودے
چند کو چھوڑ کر مسلمانوں کی اکثریت اس جدوجہد میں شامل تھی علماء اور مذہبی طبقہ اس میں پیش پیش
تھے، اور انھوں نے ہی اس کو بنیاد اور فلسفہ فراہم کیا۔ ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا گیا جس کے معنی
تھے کہ مسلمانوں پر جہاد فرض ہے ورنہ کسی آزاد مسلم ملک کو وہ ہجرت کر جائیں اور کسی ناگزیر مجبوری
کے باعث انگریزوں کے ماتحت رہنا پڑے تو حکومت کا تختہ پلٹنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے
رہنا چاہئے انگریز غاصبوں کے ساتھ دوستی یا آشتی ممکن نہیں بلکہ یہ قطعی طور پر حرام ہے اسطرح
جہاد جیسے مشترک مقصد کے لئے نہ صرف فتوی جاری کئے گئے اور عام عوام کو اس میں شرکت کی
تلقین کی گئی بلکہ علماء نے اپنا سب کچھ اس میں جھونک دیا سید احمد شہید کی تحریک سے وابستہ
علماء اور عوام اس میں نمایاں رہے کیونکہ ان لوگوں نے انگریزوں کے خلاف ایک باضابطہ فوجی
مہم پچھلے پچاس سالوں سے جاری رکھی تھی اور ان کے خفیہ مراکز ہندوستان کے طول وعرض میں
پھیلے ہوئے تھے۔ کے قاتلے ٹونک، جے پور، ہانسی، حصار، بھوپال، الہ آباد، گوڑگاؤں، نجیب آباد
حیدرآباد اور نصیرآباد وغیرہ سے ہزاروں کی تعداد میں ۲۵ رجون سے نئی دہلی میں جمع ہونے شروع
ہوگئے وہ لوگ مفتی صدرالدین سے خاص عقیدت رکھتے تھے ان کے علاوہ مولانا مملوک علی حاجی
امداد اللہ مہاجر مکی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، رشید احمد گنگوہی مولانا سرفراز علی، مولانا فضل الحق
خیرآبادی۔ مولانا لیاقت علی، مولانا پیر محمد (پٹنہ) وغیرہ گرچہ اس تحریک کے محرک تو نہیں تھے لیکن
تحریک شروع ہونے کے بعد اس کو کامیاب بنانے کی کوشش میں نہ صرف لگ گئے بلکہ گوشہ
نشینی اور تعلیم و تدریس کا مشغلہ چھوڑ کر مجاہدین کے ساتھ میدان میں شمشیر سنبھال لی دوسری
جانب علماء صادقپور مولانا عنایت علی کی سرکردگی میں بحیثیت تنظیم گرچہ اس تحریک سے
الگ رہے اور اسے ہر لوٹنگ غدر بود اور فساد سے زیادہ نہیں سمجھا اس کے باوجود سرحد پر
انگریزوں کے خلاف اپنا محاذ باقی رکھا اور بقول ولیم ہنٹر ۱۸۵۰ء تا ۱۸۵۷ء سولہ فوجی مہمات
بھیجنے کی ضرورت پڑتی جس میں باقاعدہ فوجیوں کی تعداد ۶۰ ہزار تک پہونچ گئی بے قاعدہ

...ج اور امدادی پولیس اس کے علاوہ تھی۔ (...)

۱۸۵۷ء کے واقعات کا ایک سرسری جائزہ اس تحریک سے وابستہ مسلمانوں کی حصہ داری کو واضح کرتا ہے

۲ جولائی ۱۸۵۷ء کو جنرل بخت خاں اپنی منظم اور باضابطہ فوج جس میں ۱۴ ہزار کا لشکر چند توپ تین شہسواروں کی رجمنٹ اور چار لاکھ روپیہ تھا مزید یہ کہ انہوں نے اپنے سپاہیوں کو چھ ماہ کی تنخواہ پیشگی دے رکھی تھی لے کر دہلی پہونچے اس وقت دہلی میں انتشار وافتراق اور بدنظمی کا دور دورہ تھا ہر جانب لوٹ کھسوٹ اور افراتفری مچی ہوئی تھی خود مغل شہزادوں نے نے بڑا ادھم مچا رکھا تھا ان کی نااہلی اور فنون جنگ سے ناواقفیت نے انقلابی فوجیوں میں شدید قسم کا انتشار اور بدنظمی پیدا کر دی تھی۔ بادشاہ کو جب بخت خاں کی خوش اسلوبی، سلیقہ اور فوج کی تنظیم کا پتہ چلا تو اپنے حضور طلب کرکے فرزند بنا لیا اور کمانڈر انچیف بناتے ہوئے معز الدولہ جنرل اور لارڈ گورنر بہادر کا خطاب عطا کیا اور پورے شہر میں منادی کرادی کہ جملہ افواج جو دہلی میں موجود ہیں انہیں سے جنگی احکامات حاصل کریں گے اس طرح وہ علماء اور بادشاہ کی پشت پناہی کے باعث دہلی میں اس تحریک کے قائد کی شکل میں ابھرے جنرل بخت خاں ایک روہیلہ نوجوان تھے اور انگریزی افواج میں بطور صوبہ دار بریلی میں کام کر چکے تھے۔ پہلی انگریز افغان جنگ میں جلال آباد میں بہادرانہ کارنامہ انجام دینے کے عوض توپ خانہ کا سب سے بڑا افسر مقرر کئے گئے تھے۔ روہیلکھنڈ میں آزادی کی اس تحریک کو منظم کرنے کے بعد دہلی کی جانب انہوں نے کوچ کیا جنرل بخت خاں میں انگریز مخالف رجحانات کی وجہ ان کے پیر مولوی سرفراز علی تھے۔ جو خفیہ طور پر بیعت جہاد لے رہے تھے انہیں کے یہاں غوث محمد خاں، مولوی امام خاں، عبدالغفار خاں وغیرہ نے جہاد کا فیصلہ کیا اور روہیلکھنڈ کا مناسب انتظام کرنے کے بعد ہی مرہٹہ سردار نانا راؤ کے بھائی بالا راؤ کے ساتھ دہلی کے لئے کوچ کیا اور وہاں ہندوستانی افواج کو منظم کیا مولانا فضل الحق اور دوسرے علماء سے مل کر جہاد کا فتویٰ حاصل کیا اس کے ساتھ ہی تمام سپاہیوں کے درمیان جن کی تعداد ستر تا اسی ہزار تھی ایک حلف نامہ بھی تقسیم کروایا جس میں عہد لیا گیا تھا کہ آخر دم تک لڑتے رہیں گے انگریزی افواج

کے ساتھ ان کی کئی جھڑپیں ہوئیں لیکن اس میں جنرل بخت خاں کو ہی کامیابی ملتی رہی وہ فوج میں نئی اسپرٹ کے ترجمان تھے اور بقول ولیم فوربس "محاصرہ کے زمانہ میں باغیوں نے متعدد حملے کئے جو ان کی لیاقت کا بہترین ثبوت تھا ان حملوں کی تعداد ۳۶ تھی اور ہر حملہ نہایت ہی منظم اور باقاعدہ ہوتا تھا" (۸) ایک دوسرے مصنف چارلس بال کے مطابق "دشمنوں نے سڑک پر ایک ایک انچ زمین کے لیے لڑائی لڑی تھی اور بڑے استقلال کے ساتھ یکے بعد دیگرے ہر مقام پر قبضہ کیا" (۹) خواجہ حسن نظامی کے الفاظ میں "بخت خاں ایک ایسا لائق افسر تھا کہ اگر اس کے کاموں میں مزاحمت نہ کی جاتی تو وہ آخری زمانہ کا سب سے بڑا فاتح ہوتا اور ہندوستان کا بچہ بچہ اس کے نام پر فخر کرتا اس کا حملہ نہایت دلیرانہ اور پوری باقاعدگی اور فوجی اصول کے ساتھ ہوتے تھے ..... قسمت نے بخت خاں کو ناکام رکھا ورنہ عجب نہیں تھا کہ وہ ہندوستان کا تاجدار بن جاتا اور انگریزوں کو ملک سے خارج کرنے کے بعد تیموریوں کی کمزور ہستی کو بھی درمیان سے دور کر دیتا اور دوسرا شیر شاہ ہندوستان کی تاریخ میں لکھا جاتا" (۱۰)

انگریزوں نے اس درمیان حسب روایات اپنا سازشی چکر جاری رکھا، زینت محل، مرزا مغل اور دوسرے شاہزدگان کو، حکیم احسن اللہ خاں، منشی رجب علی اور الٰہی بخش کے ذریعہ اپنا ہمنوا بنایا یہ لوگ جنرل بخت کے کاموں میں روڑے اٹکانے لگے اس کی بھرپور مخالفت کی گئی۔ قلعہ کی ایک ایک خبر چمن لال اور بالمکند کے ذریعہ انگریزوں کو ملتی رہتی بارود کے کارخانہ میں باجرا رنگا جانے لگا۔ شمرو بیگم کی حویلی میں جہاں باغیوں کے اسلحہ کا سب سے بڑا گودام تھا اور تقریباً سات سو من بارود بھرا ہوا تھا آگ لگوادی گئی اور اس طرح سے تمام آلات حرب بیکار ہو گئے۔ جنرل بخت خاں کے خلاف مختلف سازشیں رچی جانے لگیں اس طرح فتح شکست میں تبدیل ہوتی چلی گئی اس کے باوجود ۱۹ ستمبر تک وہ دہلی میں انگریزوں کے یلغار روکنے میں کامیاب رہے لیکن دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوتے دیکھ کر وہ لکھنؤ کے لئے براہ بدایوں اور فرخ آباد اپنی بقیہ افواج کے ساتھ نکل گئے تاکہ اس جدوجہد کو دوسرے مراکز سے جاری رکھا جاسکے، دہلی چھوڑنے

سے قبل ہر ممکن الفاظ اور طریقہ سے بہادر شاہ ظفر کو اپنے ساتھ چلنے کی درخواست کی کہ دہلی کی شکست جدوجہد کا خاتمہ نہیں ہے اور دوسرے مراکز سے یہ جنگ جاری رکھی جائے گی۔ لیکن بادشاہ نے دہلی کے قیام کو ہی بہتر جانا مولانا احمد شاہ صاحب کے ساتھ انہوں نے لکھنؤ اور شاہجہاں پور میں متعدد لڑائیاں لڑیں لیکن شاہ صاحب کی شہادت کے بعد وہ روپوش ہوگئے۔ شمس العلماء ذکاء اللہ دہلوی انگریز دوستی میں جنرل بخت کو کمبخت خاں کے نام سے یاد کرتے ہیں لیکن اس دور کے مختلف یادداشتوں کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کمان ان کے ہاتھ میں آتے ہی انگریزوں کو دن میں تارے نظر آنے لگے انگریز لشکر کے کمانڈر انچیف بار بار بدلے گئے اور ہر مرتبہ ناکام رہے کوئی اس غم میں مرگیا کوئی مستعفی ہوا اور کوئی واپس بلا لیا گیا۔ جواہر لال نہرو کے لفظوں میں اگر دہلی کی ساری جنگ کے تاج بہادر شاہ ظفر تھے اور ہاتھ پاؤں ہندو اور مسلمان تھے تو اس جنگ کا دماغ بخت خاں تھے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی کا خیال ہے کہ " بخت خاں روہیلوں کی ضرب المثل تنظیمی صلاحیتوں کا مظہر تھا اس میں مقصد کا خلوص بھی تھا اور عسکری تنظیم کا جذبہ بھی اگر مغل شاہزادے اس کے ساتھ تعاون کر جاتے یا آخر میں بہادر شاہ اس کے مشورہ پر عمل کر لیتا تو بہت سے واقعات کا رخ بدل جاتا۔ (۱۱)

آگرہ کے علماء برطانوی حکومت کے مخالف تھے اور عیسائیوں کے خلاف مناظرہ میں نمایاں طور پر حصہ لیتے بعد ازاں ان لوگوں نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں بھی حصہ لیا ان میں ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی رحمت اللہ وغیرہ خاص تھے۔ ڈاکٹر وزیر خاں ولد محمد نذیر خاں کا تعلق بہار کے ایک زمیندار گھرانہ سے تھا۔ ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیئے وہ لندن گئے اور وہیں اسسٹنٹ سرجن کے عہدہ پر مقرر ہوئے فاضل اوقات میں انہوں نے بائبل اور توریت کا گہرا مطالعہ کیا ہندوستان کی واپسی پر کلکتہ اسپتال میں بطور ڈاکٹر مقرر ہوئے وہاں سے آگرہ تبدیلی کر دیئے گئے اور تاج محل کے قریب محلہ کا غذان میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور ایک مجلس علماء قائم کی آگرہ ان دنوں مناظرانہ تاریخ میں نمایاں تھا جبکہ عیسائی پادری اسلامی تعلیمات کو چیلنج کر رہے تھے ایک پادری فنڈر نے علماء اسلام کو چیلنج کیا اور ڈاکٹر وزیر خاں مولوی رحمت اللہ کیرانوی وغیرہ نے اسے قبول کیا۔ ۱۰ اپریل ۱۸۵۴ء کو یہ مناظرہ آگرہ میں ہوا اور فنڈر کو شکست ہوئی اور اس نے ولایت کی راہ لی ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں باشندگانِ

آگرہ بھی شریک تھے۔ ان لوگوں نے مولانا رحمت اللہ کو اپنا سربراہ مقرر کیا گوجر لیڈر چودھری عظیم الدین
اور ڈاکٹر وزیر خاں وغیرہ برطانوی افواج کے ساتھ چار ماہ تک برسرپیکار رہے شکست کے بعد
وزیر خاں اور مولوی فیض خاں دہلی چلے گئے اور سقوط دہلی کے بعد وہ جنرل بخت خاں کے ساتھ ہی
لکھنؤ پہونچے اور وہاں سے حجاز کے لئے روانہ ہوگئے۔

انگریزوں کے خلاف ایک بڑا محاذ اودھ کا تھا۔ جہاں ۳۰ رمئی ۱۸۵۷ء سے اس تحریک نے زور
پکڑا اس کے روح رواں واجد علی شاہ کی ایک بیگم حضرت محل تھیں میرٹھ کے حادثہ کے بعد ہی لکھنؤ
میں حضرت محل نے اپنی مزاحمتی تحریک کا آغاز کیا اور یہ پہلا موقعہ تھا کہ سیاسی طور پر بیدار شیعہ
حکومت نے سنیوں کے ساتھ مل کر حکومت برطانیہ کے خلاف جہاد چھیڑ رکھا تھا۔ ۲ جولائی کو مجاہدین نے
ریزیڈنسی کا گھراؤ کیا اور ریزیڈنٹ ہنری لارنس کو قتل کر دیا اپنے بیٹے برجیس قدر کو اودھ کا حکمراں بنانے کا
اعلان کرنے کے بعد خود ان کی ولی عہد اور سرپرست مقرر ہوئیں اور ۱۶ رمارچ ۱۸۵۸ء تک لکھنؤ کو
انگریزوں کے دوبارہ تسلط سے بچائے رکھا لکھنؤ میں مختلف مقامات پر یہ اعلان چسپاں تھے۔
"ہندوؤ۔ مسلمانو! متحد ہوکر اٹھو اور ایک ہی بار میں ملک کی قسمت کا فیصلہ کردو کیونکہ اگر یہ موقع ہاتھ
سے نکال دیا گیا تو تم لوگوں کے لئے اپنی جانیں بچانے کا موقعہ بھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ یہ آخری موقعہ ہے
آج یا کبھی نہیں"۔ (۱۲)

حضرت محل ایک پردہ نشین خاتون تھیں اور پردہ میں رہتے ہوئے عنان حکومت پوری ذمہ داری
کے ساتھ سنبھالے ہوئے تھیں اور ضرورت پڑنے پر خود بھی میدان جنگ میں ہاتھی یا گھوڑے پر سوار
لڑنے والوں کی براہ راست ہمت افزائی اور مدد کے لئے پہونچ جاتیں۔ ہڈسن جس نے دہلی میں
دھوکہ سے بہادر شاہ ظفر کے بیٹے مرزا مغل کو قتل کیا تھا سقوط دہلی کے بعد اپنی بہادری دکھلانے کے
لئے لکھنؤ پہونچا تو گرفتار کر لیا گیا اور بیگم حضرت محل نے اس کے لئے بغیر کسی چون وچرا کے سزائے موت
تجویز کی۔ خود ان کی مدد اور مشورہ کے لئے ممن خاں، مولوی احمد اللہ شاہ، شاہزادہ فیروز شاہ
محمد علی عرف جیمی گرین، مولانا فضل الحق خیرآبادی جیسے افراد موجود تھے۔ شاہ گنج کے تعلقہ دار راجہ
مان سنگھ بھی اپنی ۹ ہزار افواج کے ساتھ حضرت محل کی مدد کے لئے پہونچ گئے تھے ۱۴ رمئی ۱۸۵۸ء
کو جب حضرت محل کو سقوط لکھنؤ کا احساس ہوا تو شہادت کی تمنا میں جنگ جاری رکھی۔ پانچ ہزار سے زائد

مجاہدین نے اپنی جانیں بھی انگریزوں سے لڑتے ہوئے دے دیں لیکن مولانا احمد اللہ شاہ نے ان کو اور برجیس قدر کو زیر دستی وہاں سے نکالا اور انہیں بریلی کی جانب روانہ کیا (۱۳) وہاں سے وہ مولانا احمد اللہ شاہ کی مدد کے لیے شاہجہاں پور پہونچ گئیں لیکن وہاں بھی ناکامی کی صورت میں نیپال کے نیا کوٹ چلی گئیں۔ جہاں نیپال کے راجہ رانا جنگ بہادر نے بڑا عزت و احترام کے ساتھ ان کی وفات (۱۸۷۴ء) تک اپنا مہمان بنائے رکھا اور کھٹمنڈو چوک کی ہندوستانی مسجد کے پاس مدفون ہوئیں ایک انگریز مصنف رسل کو اس بات کا اعتراف ہے کہ حضرت محل جنگ جاری رکھنے [illegible] جانب تھیں جبکہ ایک دوسرے مصنف ہامس کا خیال ہے کہ وہ اپنی صلاحیت اور حکمت عملی میں جھانسی [illegible] (۱۴)

احمد اللہ شاہ مدراسی ولد محمد علی (۱۸۵۸ء تا ۱۸۲۶ء) اس [illegible] کے دوران اودھ کے عظیم مجاہد تھے۔ تحریک کے آخری دور میں تو وہ اس تحریک کے روح رواں بن گئے جس کا اعتراف انگریزوں کو بھی تھا۔ ان کا تعلق دکن کے قطب شاہی خاندان سے تھا اور میرٹھ کی بغاوت کے دوران وہ فیض آباد میں تھے اور اس تحریک سے وابستہ ہوئے ابتدائی تعلیم انہوں نے مدراس میں پائی سیاحت کے شوق میں وہ حیدرآباد گئے اور وہیں سے یورپ کے سفر پر نکل گئے لندن پہونچ کر ملکہ وکٹوریہ کے مہمان بنے واپسی میں عرب ممالک کے دورہ کے بعد حج بیت اللہ سے فراغت کے بعد ہندوستان واپس لوٹے اور جے پور کے حضرت قربان علی سے بیعت ہوئے وہاں سے ٹونک ہوتے ہوئے گوالیار پہونچے اور صوفی بزرگ محراب شاہ قلندر سے ملاقات ہوئی پہلی ہی ملاقات میں ان کے گرویدہ ہوگئے اور ان سے جہاد کا عہد لیا اور دہلی کے لئے روانہ ہوگئے وہاں سے لکھنؤ ہوتے ہوئے فیض آباد پہونچے جب ہنگامہ شروع ہوا تو حضرت محل کے ساتھ مزاحمتی تحریک میں شامل ہوگئے اور ان کے رفقائے خاص بن گئے۔ ممنون خاں سے اختلاف ہونے کے باعث شاہجہاں پور چلے گئے اور میدان کارزار میں نمایاں حصہ لیا لیکن ناکامی ہاتھ آئی وہاں راجہ پوائیں (بندیل کھنڈ اور اودھ کے سرحد پر واقع ایک چھوٹی سی ریاست) سے تعاون کے لئے ملنے پر آمادہ ہوئے۔ لیکن راجہ نے پچاس ہزار روپیہ نقد اور خلعت فاخرہ (جو ان کے سر کی قیمت سرکار برطانیہ کی جانب سے مقرر تھی) کے عوض غداری کی اور انہیں بلا کر شہید کردیا اور ان کے سر کو شاہجہانپور کے کلکٹر کے حوالہ کردیا۔ جو عرصہ تک کوتوالی پر لٹکا رہا۔ کرنل سر تھامس سٹین (Seaton) جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں نہ صرف بذات خود

شریک تھا بلکہ کئی بار اس کا مقابلہ بھی ان سے ہو چکا تھا۔ رقمطراز ہے کہ "مولوی احمد اللہ شاہ بڑے لیاقت اور غیر معمولی قابلیت کے انسان تھے ان کی ہمت اور جواں مردی اکثر ان کے مخالفین کے لئے سخت حوصلہ شکن ثابت ہوئی تھی۔ وہ ایسے شجاع تھے کہ خوف ان کے نزدیک نہیں پہونچتا وہ نہایت تجربہ کار اپنی دھن کے پکے اور عزم و ارادہ کے حامل تھے اور باغیوں میں ان سے بہتر کوئی سپاہی نہیں تھا ان کی سپاہیانہ شان ممتاز ترین خصوصیت کی حامل تھیں اور یہ فخر انہیں کو حاصل ہے کہ انہوں نے دو مرتبہ کا نن کیمبل (برطانوی افواج کے کمانڈر انچیف) کو میدان جنگ میں ناکام رکھا اور اس کے زبردست فوجی منصوبہ کو خاک میں ملادیا۔ (۱۵)

ایک دوسرے انگریز افسر کرنل میکس کا اعتراف ہے کہ اگر وطن پرستی یا محب وطن کی یہی تعریف ہے کہ وہ آزادیٔ وطن کے لئے جنگ لڑے اور اپنی کھوئی ہوئی نعمت کو اپنے ابنائے وطن کے لئے پھر سے حاصل کرے جو زبردستی، دھوکہ دہی یا فریب سے اس کے اہل وطن سے چھین لیا گیا ہے تو وہ ایک سچے وطن پرست تھے۔۔۔۔ ان کی سرفروشی، جہاد کوشی اور وطن پرستی کی یاد یقینی طور پر ہر ملک وملت کے بہادروں اور صداقت پرستوں کے دل میں جگہ پانے کی مستحق ہے۔

ایک دوسرے مورخ ماسٹر کا کہنا ہے کہ" وہ عالم باعمل ہونے کی وجہ سے مولوی تھے روحانی طاقت کی وجہ سے صوفی اور جنگی مہارت کی وجہ سے سپاہی اور سپہ سالار تھے ان کا مزاج ظلم سے پاک تھا او ہر انگریز انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔" (۱۷) بقول پنڈت سندر لال دنیا میں آزادی کے شہیدوں میں احمد اللہ شاہ کا نام ہمیشہ کے لئے قابلِ احترام رہے گا۔ (۱۸)

آر۔سی۔مجمدار بھی اس کے معترف ہیں کہ احمد اللہ شاہ ان چند لوگوں میں تھے جو کہ انتہائی خلوص کے ساتھ مزاحمتی تحریک سے وابستہ رہے۔ ہامس کے لفظوں میں "مولوی گرچہ حیدر علی اور شیواجی کے مدمقابل تو نہ تھے لیکن ہمارے خلاف لڑنے والوں میں سب سے مستعد تھے۔ (۱۹)

برطانوی حکومت کے خلاف لڑنے والوں میں ایک نمایاں نام عظیم اللہ خاں کا بھی دکھائی دیتا ہے جو کہ مغربی تعلیم سے پوری طرح بہرہ مند تھے اور مراٹھا سردار نانا صاحب کے مشیر خاص کی حیثیت سے کانپور میں نمایاں کارنامہ انجام دیا۔ ابتداً وہ کانپور کے ایک اسکول میں بطور معلم بحال ہوئے اور سرکار برطانیہ کے تحت مختلف عہدوں پر بھی کام کیا انگریزی اور فرانسیسی زبان میں بھرپور لیاقت

حاصل کی۔ نانا صاحب عظیم اللہ خاں کی لیاقت سے بہت متأثر تھے لارڈ ہسٹنگز نے جب دیسی ریاستوں کو ضبط کرنا شروع کیا تو نانا راؤ شیوا کی پنشن بھی ضبط ہو گئی نانا راؤ نے اپنے بھائی کے ساتھ ۱۸۵۳ء میں عظیم اللہ کو وفد کا قائد بنا کر مرافعہ کے لئے برطانیہ بھیجا انہوں نے پوری ایمانداری خوش اسلوبی اور سلیقہ کے ساتھ اپنا کیس پیش کیا اپنی شخصیت اور صلاحیت سے انہوں نے تمام ذمہ داروں کو اپنا گرویدہ بھی بنایا اس کے باوجود کمپنی کے ڈائرکٹروں نے ان کی باتیں نہیں مانیں اس ناکامی نے ان پر بہت اثر ڈالا یورپ کے سفر کے دوران فرانس کے ایک ہوٹل میں روس کے انقلابیوں سے ان کی ملاقات ہوئی جس نے انہیں انگریز مخالفت میں مزید انقلابی بنا دیا قسطنطنیہ ہوتے ہوئے ۱۸۵۵ء میں ہندوستان ان کی واپسی ہوئی انہوں نے جنگ کریمیا کا بھی قریب سے مشاہدہ کیا اور ایک روسی افسر نے ہندوستان میں بدامنی کی صورت میں ہندوستانیوں کی مدد کا وعدہ کیا اس طرح انھوں نے بین الاقوامی طور سے انگریز مخالف قوتوں سے مدد اور حمایت کا وعدہ حاصل کرنے کے بعد ہندوستان سیاست میں دلچسپی لینی شروع کی ہندوستان کے مختلف علاقوں کا دورہ کر کے اندرون ملک بھی انگریز مخالف قوموں کو جمع کرنا شروع کیا تاکہ ان کے درمیان ایک ربط قائم کیا جا سکے بیرون ملک روس اور مصر جیسے دور دراز علاقوں سے بھی خط کے ذریعہ ان کا رابطہ تھا۔ بقول لارڈ رابرٹسن ان کے تعلقات قسطنطنیہ کے عمر پاشا اور فرانسیسی حکومت سے بھی تھے۔ عظیم اللہ خاں نے نانا صاحب کو اس انقلاب میں شرکت کے لئے آمادہ کیا ان دونوں نے مرہٹہ سردار تانیتا توپے کو بھی اس تحریک میں شامل کر لیا۔ جنہوں نے جوگیوں کا بھیس بدل کر ہندوستانی فوجیوں میں انگریز مخالف آگ بھڑکائی۔ شاہ فیض بھی فوجیوں میں گشت کرتے اور انگریزوں کی مخالفت کے لئے لوگوں میں روٹیاں اور نیلوفر تقسیم کرتے۔ (۲۰)

۴ رجون ۱۸۵۷ء کو کانپور میں مزاحمتی تحریک شروع ہوئی نانا صاحب کو اس دوران دہلی آنے کی دعوت دی گئی تو عظیم اللہ خاں نے اس کی مخالفت کی کہ کانپور میں پہلے اپنی گرفت مضبوط کر لی جائے ۲۱ رجون تک دونوں ہی انگریزوں کے خلاف لڑتے رہے لیکن کانپور کے کچھ یورپین کے قتل عام کی وجہ سے ان دونوں کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے۔ عظیم اللہ خاں کانپور چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے۔ اور وہاں احمد اللہ شاہ سے مل گئے۔ ۱۶ رجولائی کو جنرل ہیولاک نے نانا صاحب کو شکست دے کر کانپور پر قبضہ کر لیا اور وہاں کے شہریوں سے انتہائی بے رحمی اور سفاکی سے

انگریزوں کا انتقام لیا۔ نانا صاحب کانپور چھوڑ کر جب لکھنؤ پہونچے تو ان دونوں کے تعلقات ایک بار پھر معمول پر آگئے نانا صاحب کے ساتھ عظیم اللہ خاں کے تعلقات ہندو مسلم اتحاد کی ایک روشن مثال خیال کی جاتی ہے ساورکر ان کی صاف گوئی بے باکی اور مقصد کے لئے نیک نیتی سے بے انتہا متاثر ہے نانا صاحب کو اپنی اس جنگ میں کانپور کے تمام مسلمانوں کی حمایت بھی حاصل تھی شمس الدین کا گھر تمام خفیہ سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ جہاں تمام لوگ بیٹھ کر اہم فیصلہ کرتے وحیدالزماں ہمیر پور کے ڈپٹی کلکٹر تھے انگریزوں کی نوکری چھوڑ کر نانا صاحب سے مل گئے اور ان کے ناظم مقرر ہوئے۔

روہیلکھنڈ کے علاقہ میں حافظ رحمت اللہ خاں کے پوتے خان بہادر خان بہت ہردلعزیز تھے وہ ریٹائرڈ چیف جسٹس بھی تھے۔ حسب پروگرام ۳۱ رمئی کو جب مزاحمتی تحریک اس علاقہ میں شروع ہوئی تو چند گھنٹوں میں شاہجہانپور، بدایوں اور مرادآباد وغیرہ سے برطانوی تسلط بقول ساورکر "سودیشی خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر ختم ہوگیا" اس وقت جنرل بخت خاں بریلی میں تھے انہوں نے خان بہادر سے تحریک کی قیادت کی درخواست کی جسے انہوں نے قبول کرلیا اور روہیلکھنڈ کے نواب کا لقب اختیار کیا بہادر شاہ ظفر نے ۱۲ر جون کو انہیں اپنا نائب مقرر کیا اور خلعت سرفرازی و خطاب نواب انتظام الدولہ محافظ الملک خان بہادر خاں تنویر جنگ رئیس اعظم روہیلکھنڈ عطا کیا۔ مرادآباد، بدایوں، بجنور اور شاہجہانپور میں ان کی حکومت تسلیم کرلی گئی نواب مجو خاں مرادآباد میں نواب غلام قادر خاں شاہجہانپور میں نواب محمود علی خاں بجنور میں اور عبدالرحمن خاں بدایوں میں نائب کے فرائض انجام دینے لگے شوبھا رام کو جنگی کاونسل کا دیوان مقرر کیا گیا رگھوناتھ سنگھ کو راجہ کا خطاب دے کر پرگنہ فرید پور کا انچارج بنایا گیا۔ تقریباً ایک سال تک بلاشرکت غیر یہ لوگ اپنے اپنے علاقہ کے حکمراں رہے اور روہیلکھنڈ کا علاقہ دارالامن بنا رہا دہلی اور لکھنؤ میں انگریزی افواج کی فتح کے بعد یہ علاقہ بھی ان کے ہاتھ سے نکلنے لگا تو گوریلا جنگ جاری رکھتے ہوئے وہ لوگ نیپال کی ترائی کی جانب

نکل گئے لیکن ایک معرکہ پر وہ گرفتار کر لئے گئے اور ۱۸۶۰ء میں انہیں پھانسی کی سزا سنائی گئی۔

الٰہ آباد میں بغاوت کی خبر ملتے ہی قلعہ میں مقیم ہندوستانی افواج نے برطانوی افسروں کو قتل کردیا اور گولہ بارود اور فوجی گدام پر قبضہ کر لیا انھوں نے خفیہ تنظیمیں قائم کرنے میں خاصی دلچسپی دکھائی مولوی لیاقت علی اور رام چندر مزاحمتی تحریک کے روح رواں تھے لیاقت علی وہاں کے وائسرائے مقرر ہوئے اور انھوں نے خسرو باغ کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنا کر مزاحمتی تحریک کی ابتدا کی۔ فتح گڑھ کے باغیوں نے نواب تفضل حسین خاں کو اپنا لیڈر مقرر کیا جو کہ محمد خاں بنگش بانی فرخ آباد کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

نواب علی بہادر نے باندہ کے باغی سپاہیوں سے یورپین عورتیں اور بچوں کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی رہے۔ لیکن جب مارچ ۱۸۵۸ء میں برطانوی افواج مزاحمتی تحریک کو کچلتے ہوئے باندہ پہونچیں تو نواب صاحب کالپی کی جانب جھانسی کی رانی اور تانتیا توپے وغیرہ کی مدد کے لئے نکل گئے اور وہاں سے گوالیار پہونچے سید گلزار علی نے امروہہ میں مزاحمتی تحریک کو جاری رکھا جبکہ نواب ولی داؤد خاں نے بلند شہر میں عنایت علی نے کاکوری میں لال بہادر خاں نے فتح پور میں اور دولہ شاہ میوات میں تحریک کی قیادت کر رہے تھے۔

جھانسی کی رانی کے ساتھ مسلم لیڈر اور عوام کا رشتہ کافی خوشگوار تھا ان لوگوں نے اپنے جان و مال کی قربانی سے ۷ رجون ۵۷ء کو رانی کا ساتھ دیا رسالدار کالے خاں اور تحصیلدار محمد حسین اس جنگ میں نمایاں رہے اور انہیں کی کوشش کے نتیجہ میں انگریز اپنا ہتھیار رکھنے پر آمادہ ہوئے تاکہ ان کے لئے قلعہ کا دروازہ کھولا جاسکے۔

وارث محمد خاں، عادل محمد خاں اور سرفراز خاں وغیرہ نے بھوپال میں انقلاب برپا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن ملکہ سکندر بیگم کی شخصیت کے سامنے ان لوگوں کی ایک نہ چلی اور اس طرح وہاں کوئی کھلی بغاوت کامیاب نہ ہوسکی۔

بہار میں اس تحریک کا رہنر سل کچھ پہلے ہی ہو گیا تھا۔ پٹنہ مجسٹریٹ کے ایک خط کے مطابق شاہ آباد کے بابو کنور سنگھ نے ۱۸۴۵ء میں پٹنہ کے منشی راحت علی سے ملاقات کی اور شیخ پیر بخش کے ذریعہ رجمینٹ اول میں بغاوت کی سازش رچی گئی لیکن قبل از وقت راز فاش ہو جانے کے باعث بڑے پیمانہ پر پٹنہ میں گرفتاری ہوئی مولوی نیاز علی (محکمہ قانون) برکت اللہ (سرکاری وکیل) اور داروغہ میر باقی کو نوکری سے نکال دیا گیا بقیہ لوگ کچھ سزا کے بعد رہا کر دیئے گئے انہیں لوگوں میں علی کریم اور حسن علی خاں وغیرہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں پیش پیش تھے پیر علی کا پیوری (کتب فروش) نے اس تحریک میں پٹنہ میں نمایاں حصہ لیا اور ۳ر جولائی ۱۸۵۷ء کو ذو سو رضا کاروں کے ساتھ جو سبز علم اٹھائے ہوئے تھے انگریزوں کے خلاف مورچہ لینے لگے ان کے مکان پر چھاپہ پڑا اور ان کے ۳۷ ساتھی گرفتار کر لئے گئے۔ ۱۶ مجاہدین کو تین گھنٹہ کے اندر پھانسی دے دی گئی (۲۱) باقی لوگوں کے لئے مختلف قسم کی سزائیں تجویز ہوئیں ۱۲ر جون ۱۸۵۷ء کو سنتھال پرگنہ کے روہنی گاؤں کے ۳۲ ویں رجمینٹ میں بغاوت کی آگ بھڑکی اور ان لوگوں نے دو انگریز کو قتل کر دیا لیکن اس بغاوت کو سختی سے دبا دیا گیا اور تین مسلم باغی امام علی امانت علی اور شیخو کو ۱۶ر جون کو پھانسی کی سزا دی گئی اور رجمینٹ کو بھاگلپور بھیج دیا گیا اگست میں اس رجمینٹ نے دوبارہ بغاوت کر دی اور گیا پہونچکر چار سو قیدیوں کو چھڑا لیا فرینڈس اوف انڈیا اور (Englishman) انگلش مین (کلکتہ) کی ۱۷ اور ۲۲ر جولائی ۱۸۵۷ء کی ایک رپورٹ کے مطابق بھاگلپور کے جگاؤں کے وکیل منشی ذکی الدین احمد نے علی حسین خاں ناظر فوجداری پٹنہ اور مونگیر کے تاجر حاجی احمد حسن کے ساتھ مل کر ایک سازش کی تھی منصوبہ کے تحت بھاگلپور اور مونگیر میں ۱۴۰۰ مسلح جوانوں کے ساتھ ۳ر اگست ۱۸۵۷ء کو بقر عید کی نماز کے بعد تمام یوروپین کو قتل کر دیا جائے یہ کام بیک وقت ریاست گیر پیمانہ پر اور پوری شدت کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ سازش مکمل تھی صرف مختلف جگہوں سے رابطہ قائم کئے جا رہے تھے کہ حکومت کو اس کی بھنک ۶ر جولائی کو مل گئی تمام لوگ گرفتار

کر لئے گئے لیکن یہ گرفتاریاں پرامن نہیں تھی ۲۴ راگست کو ایک برطانوی افسر سرجان نرتی کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ پانچویں ارر یگولر (Irregular) دستہ اور ۲۲ ویں دیسی پیدل دستہ نے بغاوت کر دی برطانوی سپاہیوں پر مشتمل پانچویں Fusilier نے بڑی مشکل سے اس پر کنٹرول پایا۔ پٹنہ کے کمشنر نے ایک مقامی پولس (Davison) فورس بنانے کا فیصلہ کیا جس میں کسی بھی اونچی ذات مثلاً برہمن، راجپوت اور مسلمانوں کی شرکت پر پابندی عائد تھی اور نچلی ذات کے لوگ اس میں شریک تھے وہابی تحریک سے وابستہ لوگوں پر کڑی نظر رکھی جانے لگی گرچہ علماء صادقپور اس تحریک کے مخالف تھے مولوی محمد حسین، احمداللہ اور وزیرالحق کو شہر کے دوسرے معززین کے ساتھ پٹنہ کے کمشنر ٹیلر (Tayler) نے کچھ مشورہ کے لئے بلایا اور انہیں وہیں گرفتار کر لیا گیا ۲۴ گھنٹہ کے اندر پٹنہ کے تمام شہریوں کے ہتھیار ضبط کر لئے گئے اور رات میں ان کے باہر نکلنے پر پابندی عائد کر دی گئی علی کریم کی گرفتاری کے لئے جگہ جگہ چھاپے پڑنے لگے انکی اور ان کے رشتہ داروں کی تمام دولتیں ضبط کر لی گئیں مکانات گرا دیئے گئے اور انکے سر کی قیمت پانچ ہزار مقرر کی گئی ۶ ر جولائی کو پولس جمعدار وارث علی ترہت میں گرفتار ہوئے اور ۲۳ ر جولائی کو انہیں پھانسی دے دی گئی بڑی تعداد میں مظفر پور وغیرہ میں بھی گرفتاریاں عمل میں آئی۔ بابو کنور سنگھ نے اپنی عمر کے ۷۵ ویں سال میں آزادی وطن کے لئے جو تحریک شروع کر رکھی تھی اس میں شیخ غلام یحییٰ، شیخ محمد عظیم الدین، تراب علی اور خادم علی وغیرہ کا نام بھی نمایاں طور پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ نوادہ جہاں آباد اور راجگیر وغیرہ میں تحریک کی قیادت حیدر علی، احمد علی، مہاری علی خاں، حسین بخشی اور غلام علی وغیرہ کر رہے تھے اور ان کے سروں کی قیمت انگریز حکومت کی جانب سے پانچ پانچ سو روپیہ مقرر تھی (۲۲) گیا میں اس بغاوت کی قیادت کی ذمہ داری علی خاں کے ذمہ تھی جبکہ چھپرہ میں اس مورچہ کو محمد حسین خاں سنبھالے ہوئے تھے۔ جنوبی بہار میں

ٹکلٹیت امراؤ سنگھ کے ساتھ ان کے دیوان شیخ بھکاری حکومت برطانیہ کی فوج سے لڑتے ہوئے ۶ جنوری ۱۸۵۸ء کو مقامی لوگوں کی غداری کے باعث گرفتار ہوئے اور انہیں تیسرے دن یعنی ۸ جنوری ۱۸۵۸ء کو چٹو پالو گھاٹی میں ایک بڑے درخت سے لٹکا کر بغیر کوئی مقدمہ چلائے پھانسی دے دی گئی۔ جنرل میکڈرائیلڈ نے پھانسی سے قبل کہا کہ شیخ بھکاری چھوٹا ناگپور کے باغیوں میں سب سے زیادہ خطرناک ہے اس کی زندگی انگریز حکمرانوں کے لئے موت کا باعث ہے اس وجہ سے آج ہی اسی جگہ اسے پھانسی دے دینی چاہیئے۔ (۲۳)

شاہزادہ فیروز شاہ کا نام خانوادہ بابر کے سیکڑوں نوجوانوں میں تن تنہا دکھائی دیتا ہے۔ جس نے اس جہاد حریت میں نمایاں حصہ لیا وہ صاحب عالم مرزا ناظم بخت خلف شاہ عالم ثانی کے صاحبزادے تھے اپنے والد کے زیر نگرانی علوم مروجہ اور فوجی تربیت مکمل کی مذہبی فطرت کے باعث حج کے لئے گئے جولائی ۱۸۵۷ء میں واپسی ہوئی اس دوران ہندوستان کروٹ بدل رہا تھا اور جنگ آزادی کے شعلے بھڑک رہے تھے وہ بے خوف و خطر اس شعلہ میں کود پڑے اور مالوہ کو اپنا میدان کارزار بنایا ہندو اور مسلمانوں کو متحد ہو کر انگریزوں کو باہر نکالنے کی اپیل کی۔ مندیشور کے فوجیوں نے عام لوگوں کے ساتھ مل کر گوالیار کی حکومت ختم کر دی اور شاہزادہ کی حکمرانی کا اعلان کر دیا وہاں کے میواتی، مکرانی اور افغانی شاہزادہ کے ساتھ مل گئے۔ دہلی چلو کے نعرہ کے ساتھ ہی شاہزادہ گوالیار سے دہلی کی جانب چلے راستہ میں سقوط دہلی کی خبر ملی اس وقت ان کے ساتھ ۱۵ ہزار افواج تھے وہاں سے آگرہ کا رخ کیا انگریز افواج سے کالی ندی پر مقابلہ ہوا اور انگریز افواج کی شکست ہوئی۔ شاہزادہ نے وہاں سے میوات کا رخ کیا۔ دہلی کے بقیۃ السیف مجاہدین شاہزادہ کی فوج میں شامل ہوتے گئے ۲۶ ستمبر کو یہ لوگ متھرا پہونچے وہاں ان کے ساتھ ۲۷ ویں دیسی پیادہ فوج کے بہت سے افراد شامل ہو گئے جن کا صوبیدار ہیرا سنگھ تھا اس طرح وسط ہند کے لوگ بھی ان کے ساتھ تھے اس جمعیت کے ساتھ فرخ آباد شاہجہانپور ہوتے ہوئے یہ لوگ لکھنؤ پہونچے اور لکھنؤ کی جنگ میں شامل ہو گئے اپریل ۱۸۵۸ء میں مولانا

احمد اللہ شاہ کے پاس شاہجہانپور پہونچے وہاں سے لڑتے بھڑتے ہوئے جنوری ۱۸۵۹ء میں اندر گڑھ میں تانتیا توپے سے ملے اپریل ۱۸۵۹ء میں وہ سروپنج کے جنگل میں تھے بعد ازاں یہ خبر آئی کہ ایران ہوتے ہوئے روس پہونچ گئے اور وہاں سے حجاز کے لئے روانہ ہو گئے اور مکہ معظمہ میں اقامت اختیار کرلی اور ۱۸۹۸ء میں وہیں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

حیدرآباد میں مولوی علاءالدین اور طرہ باز خاں نے میرٹھ کی بغاوت کے بعد انگریزوں کے خلاف مزاحمتی تحریک کی داغ بیل ڈالی گرچہ نظام حیدرآباد شدت سے اس تحریک کے مخالف تھے حیدرآباد کے مسلمان بڑی تعداد میں مکہ مسجد میں جمع ہوئے اور ۱۷ جولائی ۱۸۵۷ء کو باضابطہ تحریک کے آغاز کا پروگرام مرتب کیا۔ ریزیڈنسی پر حملہ کیا گیا لیکن اس میں کامیابی نہیں ملی اور تمام مجاہد شہید کر دیئے گئے۔ سکندر خاں اور نصیر الدولہ کی بے وقت موت نے اس تحریک کو اتنا نقصان پہونچایا کہ یہ پھر دوبارہ پنپ نہیں سکی مولوی علاءالدین کو جلاوطن کر کے انڈومان بھیج دیا گیا۔

گرچہ اس تحریک کی ابتدا بہرام پور اور بیرک پور کی فوجی چھاؤنی سے ہوئی تھی لیکن ابتدا ہی میں اسے سختی سے دبا دیا گیا مذہبی تحریک کی لو بھی ٹھنڈی پڑتی جا رہی تھی اس کے باوجود انگریزوں سے نفرت کی آگ لوگوں کے دلوں میں موجود تھی محرم کے موقعہ پر حکومت کی جانب سے خاص چوکسی برتی جانے لگی فرخ آباد میں یہ بے چینی کچھ زیادہ ہی تھی اور ان کے درمیان فرنگیوں سے جلدی نجات پانے کی پیشنگوئی عام اور خاص لوگوں کی زبان پر تھی۔

(باقی آئندہ)

حواشی

---

(۵) خواجہ حسن نظامی، بیگمات کے آنسو (دہلی ۱۸۹۶ء) ص ۱۲۶

(۶) خورشید مصطفیٰ رضوی، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ص ۱۲۴

(۷) ولیم ہنٹر، دی انڈین مسلمانس (دہلی ۱۹۶۹ء) ص۲۰۱

(۸) ولیم نورس۔

(۹) چارلس بانی۔ ہسٹری آف انڈین میوٹنس (دہلی ۱۹۰۱ء) ص۲۰۵

(۱۰) خواجہ حسن نظامی، غدر کی صبح وشام (دہلی ۱۹۲۶ء) ص۷

(۱۱) خلیق احمد نظامی۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ (دہلی ۱۹۷۰ء) ص۲۹

(۱۲) خورشید مصطفیٰ رضوی ایضاً ص۱۲۴

(۱۳) پرنس انجم قدر، بیگم حضرت محل پارک آزاد ہند کلکتہ ۱۵ اگست ۱۹۹۶ء ص۳

(۱۴) ہامس۔ ہسٹری آف انڈین میوٹنی (لندن ۱۸۸۸ء) ص۱۰۲

(۱۵) کرنل سر ٹامس سٹیپن۔ انڈین میوٹنی ۱۸۵۷ء (لندن ۱۸۹۰ء) ص۳۶

(۱۶) کرنل میلس ہسٹری آف انڈین میوٹنی اینڈ ایسٹ انڈیا کمپنی (دہلی ۱۸۸۰ء) ص۳۵

انتظام اللہ شہابی۔ باغی علماء (دہلی ۱۹۶۸ء) ص۴۹

(۱۷) ڈبلو فاسٹر، ہسٹری آف انڈین میوٹنی (لندن ۱۸۸۹ء) ص۱۴۶

(۱۸) غلام رسول مہر، ۱۸۵۷ء کے مجاہدین (لاہور ۱۹۶۰ء) ص۲۰۸

(۱۹) ہامس، ایضاً ص۱۴۰

(۲۰) انتظام اللہ شہابی، تاریخ ملت جلد یازدہم (دہلی ۱۹۷۱ء) ص۲۸۶

(۲۱) علی محمد شاد نقش پائیدار (پٹنہ ۱۸۹۶ء) ص۴۶

(۲۲) کے۔ کے۔ دت۔ ہسٹری آف فریڈم موومنٹ ان بہار (پٹنہ ۱۹۷۱ء) ص۱ تا ۸

(۲۳) احمد سجاد۔ شیخ بھکاری کے نام کا استحصال کب تک فاروقی تنظیم رانچی ۱۹ اگست ۹۵ء ص۳

میرزا فصیحی ھروی

ڈاکٹر۔ وجیہ الدین۔ مہاراجہ سایاجی راؤ یونیورسٹی۔ بڑودا۔ گجرات

صفوی عہد کے بہت سے نثر نگار شعراء اور ادبا ایسے ہیں جنہوں نے فارسی ادب کی نمایاں خدمات انجام دی ہیں اور فارسی ادب کو اپنی گوناگوں نگارشات، اپنے ادبی شاہ پاروں اور کارناموں سے مالا مال کیا ہے۔ ان کے ادبی کارنامے اگرچہ خاصی اہمیت کے حامل ہیں تاہم ان لوگوں کے حالاتِ زندگی اور کارناموں سے عام لوگ بڑی حد تک ناواقف ہیں۔ مورخین اور تذکرہ نگاروں نے بھی ان حضرات کے متعلق بہت کم معلومات فراہم کی ہیں۔ فصیحی ھروی کا بھی شمار ایسے مجہول الحال شعراء میں ہوتا ہے۔

میرزا فصیحی ھروی یا ھراتی جو فصیحی انصاری کے نام سے بھی جانے جاتے ہیں، ھرات کے رہنے والے تھے اور سادات خاندان سے تعلق رکھنے والے نامور صوفی خواجہ ابواسمٰعیل عبداللہ انصاری الھروی کی اولاد میں سے تھے (۱) اصفہان کے مشہور شاعر، حکیم شرف الدین حسن شفائی، کے معاصر تھے (۲) ملک مشرقی اور فصیحی ھروی میر حسن بیگ شاملو کے ندیم خاص تھے۔ حسن بیگ شاعری کا اچھا مذاق رکھتا تھا اور خود بھی شاعر تھا۔

"تذکرہ نگار طاہر نصر آبادی کے مطابق حسن بیگ کے دیوان میں تین ہزار اشعار ہیں (۳) حسن بیگ کی مجلس میں فصیحی ھروی اور حکیم شفائی کے درمیان اکثر شعری بحث و مباحثہ ہوتا تھا جو دونوں کے درمیان اکثر جھگڑے کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ (۴) فصیحی ھروی ہندوستان آنے کا خواہشمند تھا۔ بارہا اس نے ہندوستان آنے کی کوشش کی لیکن حسن بیگ شاملو جو فصیحی ھروی سے

بہت متاثر تھا اور اپنے ادبی ذوق کی تسکین کو پورا کرنے کی وجہ سے کبھی بھی اس نے فصیحی کو ہندوستان آنے کی اجازت نہیں دی۔ آخر فصیحی نے اپنے دیوان کا ایک خطی نسخہ آگرہ بھیجا (۵)

شاہ عباس اول ۱۰۳۱ھ میں جب ھرات آیا تو اس نے فصیحی ھروی کی شہرت سنی۔ اس نے فصیحی کو بلا کر اپنے درباری شعراء میں شامل کر لیا۔ شاہ عباس اول فصیحی ھروی کی بہت عزت کرتا تھا۔ اور اس کو مختلف انداز سے نوازتا بھی تھا۔ فصیحی ایک عمدہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اچھا خطاط بھی تھا۔ خاص طور سے شکستہ خط بہت عمدہ لکھتا تھا۔ (۶)

تذکرہ نتائج الافکار کا مصنف فصیحی کے متعلق رقم طراز ہے "مجمع محاسن ذاتی وصفاتی مولانا فصیحی ھراتی کہ از سادات عظام آن دیار و شعرای نامدار بود خط شکستہ درست می نوشت در بدایت حال بخدمت حسن خاں بن حسین خاں حاکم ہرات کمال تقرب و مصاحبت بہم رسانید و درگلشن سخن نغمہ سنج قصاید مدحیہ گردید در آن روزھا ورود حکیم شفائی بہرات صورت بست و در محفل حسن خاں با میرزا فصیحی اتفاق ملاقات افتاد و در مشاعرہ آخر مکابرہ رو داد شفائی از ھرات برآمدہ بہجو فصیحی پرداخت و وی بکمال بلند نظری بجوابش التفات نساخت و در ۱۰۳۱ احدی و ثلثین والف کہ رایت دولت شاہ عباس ماضی پرتو افگن سواد ہرات گشتہ میرزا فصیحی شرف باریابی دریافت و از صحبت رنگین منظور نظر شاہ گردید شاہ بمصاحبتش گرفتہ بمعیتہ خود بعراق عجم و مازندران برد و بتربیت و ترقی اومی پرداخت۔ صاحب دیوان است و شاعر خوش بیان در اوسط مائتہ حادی عشر بدار عقبی شتافت۔" (۷)

"مآثر الکرام" کے مصنف، میر غلام علی آزاد بلگرامی، فصیحی کے متعلق لکھتے ہیں "از اعیان سادات ھرات و آئینہ نقش پذیر حسن صفات بود ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابتداء حال در خدمت حسن خاں حسین خان حاکم ہرات عظیم تقرب داشت و تخم مدحت پدر و پسر فراوان در سرزمین سخن کاشت در آن ایام ورود حکیم شفائی بہ ہرات اتفاق افتاد، و در مجلس حسن خاں با میرزا فصیحی ملاقات دست داد و مشاعرہ ایشان بمنازعہ انجامید۔ خان طرف فصیحی گرفت۔ شفائی از ھرات برآمدہ

فیصی را ہجو کرد۔ فیصی در دیوان بلند حوصلگی را کار فرمود و اصلاً ملتفت جواب نشد۔ ہجو فیصی در دیوان شفائی بنظر در آمد دل نخواست کہ زبان قلم بکلمات رکیک آشنا شود میر تقی اوحدی صفاہانی گویا ہے:۔

" چند نوبت عزم ھند کرد۔ مانع اوشدند۔ چون ما ہچہ لوائی شاہ عباس ماضی در سنہ احدی و ثلثین والف (۱۰۳۱) سواد افروز ہرات گردید، میرزا فصیحی باریاب ملازمت گشت وصحبت او دلنشین شاہ افتاد و لعنایات فراوان مخصوص گردانید۔ وھمراہ خود بعراق عجم و مازندران برد۔ از فروغ تربیت گوھر او راجلای بخشید، مزید رقم طراز ہے کہ "دیوان فصیحی بنظر در آمد خوش محاورہ است اما مضمون تازہ بندرت دارد" (۸)

" تذکرہ نصرآبادی" میں فصیحی کے متعلق یوں مرقوم ہے:

میرزا فصیحی از ھراتست او ھم بطریق میرزا ملک سلوک مینمودہ اما در کمال ھمواری و ملایمت بود و نہایت خلق و پاک زبانی و مہربانی و خوش ذاتی داشت و بطریق میرزا ملک درخدمت حسن خاں کمال قرب داشت" (۹)

" کلمات الشعراء" کے مصنف ۔ محمد افضل سرخوش لکھتے ہیں کہ " از فصحای زمانہ بود۔ اشعار ریختہ دارد و استاد یگانہ است" مزید لکھتے ہیں کہ " کا مل العصر بود۔ طالب آملی وغیرہ فضلای زمان اورا بسیادت قبول داشتند" (۱۰)

فصیحی ھروی کے تین شاگرد تھے ۔ ناظم ھروی (وفات ۱۰۸۱ھ) درویش حسین والہ ھروی اور میرزا جلال اسیر اصفہانی ۔ والہ ھروی شاہجہاں کے زمانے میں ھندوستان آگیا تھا۔ جلال اسیر ایران میں رہا ھندوستان کبھی نہیں آیا۔ جلال اسیر نے فصیحی ھروی کا شاگرد ہونے کا اقرار مندرجہ ذیل اشعار میں کیا ہے۔

باجود آنکہ استادم فصیحی بود اسیر
مصرع صائب تواند یک کتاب من شود (۱۲)

نکہتی از چمن فیض فصیحیست اسیر
کہ زھر زمزمہ گلزار مقالی دارد (۱۳)

آنانکہ مست فیض بہار اند چون اسیر
تہ جرعۂ ز بزم فصیحی چشیدہ اند (۱۴)

جلال اسیر نے ایک قطعہ بھی اپنے استاد کی تعریف میں لکھا ہے، جو ذیل میں درج ہے۔ لیکن اس قطعہ میں اس نے اپنے استاد فصیحی هروی کا نام یا اپنے تخلص کا استعمال نہیں کیا ہے۔ یہ قطعہ نولکشور کے مطبوعہ دیوان کے علاوہ راقم کے پاس موجود کلیات جلال اسیر کے ایک خطی نسخہ میں بھی ہے اشعار کی تعداد دونوں نسخوں میں برابر ہے۔

ای سخن پرداز استادی کہ فیض طبع تست
ابر را باران و دریا را دُر و کان را گہر

بہر ترتیب دماغ نوعروسان سخن
چون غزالان نافۂ کلک تو ریزد مشک تر

شعلۂ مانند گل صد برگ بر شبنم شود
فیض طبعت گر کند در خاطر آتش گذر

در گلستان سخن سنجی نگاہ فکر نظم
شد نہال کلکت از گلہای مشکیں بار ور

سینۂ گرمت زبس چون صبح لبریز صفاست
تا دعا بر لب رسانی گرد او گردد اثر

تا شود شیرین ز لذت کام دانش طبع تو
لفظ و معنی را بہم آمیخت چون شیر و شکر

نسبتش با گوهر شاداب معنی های تست
می رسد گر ناز بر دریا کند آب گهر

اینکه خوانده روزگارت خسرو ملکِ سخن
کشته در معنی مرا مخدوم و استاد و پدر

هست در دل خار خار اینکه در گلهای فیض
از تخلص گل زند نظم پریشانم بسر

گرچه این گستاخیم شرمنده دارد تا ابد
با وجود این هوس دارم تمنای دگر

گر بر آرم جزوی از اشعار سحر آمیز خویش
نسخه فرمائی که باشد روشنی بخشِ نظر

سرمۂ کلکت دهد چشم بیاضم را سواد
نور یابد دیدۂ هر کس کہ آرد در بصر

مست فیض از بادۂ تحقیق ساغر زن کہ من
تا نباشد دردِ سر، کردم سخن را مختصر (۱۵)

بانکی پور کیٹلاگ کا مصنف لکھتا ہے کہ اودھ کیٹلاگ کے مطابق فصیحی هروی کا انتقال ۱۰۴۰ھجری مطابق ۱۶۳۶عیسوی میں ہوا۔ مزید لکھتا ہے کہ فصیحی هروی کے شاگرد والہ هروی کے دیوان میں ایک تاریخی قطعہ ہے جس سے فصیحی کا سال وفات ۱۰۴۹ھجری یعنی ۱۶۳۹ء نکلتا ہے جو زیادہ درست معلوم ہوتا ہے۔ مادہ تاریخ یہ ہے "بگو فصیحی آزاد سوی جنت شد"۔ (۱۶)

تذکرہ نصرآبادی کے مصنف کے بقول فصیحی هروی کے دیوان میں چھ ہزار اشعار ہیں۔ فصیحی کا دیوان بانکی پور کیٹلاگ کے مطابق مطبع چشمۂ نور مظفرپور سے چھپا

ہے (۱۷) جواب تقریباً ناپید ہے۔

فصیحی انصاری الہروی نے غزل کے روایتی خیالات میں یاس انگیزی وافسردگی کا عنصر شامل کیا اور صائب سے پہلے تمثیل و ایجاز کا اسلوب اپنایا۔ بعد کے شعراء مثلاً ناظم ہراتی (وفات ۱۰۸۰ ہجری) وغیرہ نے اس کا تتبع بھی کیا ہے۔ (۱۸)

فصیحی انصاری کے چند اشعار ذیل میں بطور نمونہ نقل کئے جاتے ہیں۔ جو تذکرہ نصرآبادی سے ماخوذ ہیں:-

خندہ می بینی ولی از گریۂ دل غافلی
خانۂ ما اندرون ابر است و بیرون آفتاب

رتبۂ حسن بلندست چہ حاجت بنقاب
بہر منع نگہی کز مژہ کوتاہ تراست

ہزار بار قسم خوردہ ام کہ نام ترا
بلب نیاورم اما قسم بنام تو بود

فرداست وعدہ جنت وامروز شد نصیب
آری خلاف وعدہ کریمان چنین کنند

من نہ شایستہ بسمل نہ سزاوار قفس
بچہ امید درین دام گرفتارم

رباعی

روشنگری آئینہ دل کردیم
وانگاہ بروی تو مقابل کردیم
عکس رخ تو جدا نگشت از رخ تو
ما بیہدہ سعیہای باطل کردیم

رباعی

ہرچند دلم ز درد خونریز تراست
برمن دل تیغ آسمان تیز تراست
در کین دلم دلبر باشید کہ زنگ
زائینہ ام از عکس سبک خیز تراست (۱۹)

حواشی و مآخذ

(۱) خواجہ عبداللہ انصاری الہروی ۳۹۶ ہجری مطابق ۱۰۰۵ عیسوی میں پیدا ہوئے اور ۴۸۱ ہجری مطابق ۱۰۸۸ عیسوی میں ان کا انتقال ہوا موصوف منازل السائرین، طبقات الصوفیہ، زاد العارفین جیسی بلند پایہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ (عربی فارسی مخطوطات کی فہرست۔ بانکی پور لائبریری، پٹنہ، جلد سوم، صفحہ ۷۰)

(۲) شرف الدین حسن شفائی، صفوی عہد کے بہترین شاعروں میں سے ایک ہے یہ شاہ عباس اول کا ملک الشعراء، طبیب اور ندیم خاص تھا۔ شفائی کی وفات ۱۰۳۷ ہجری مطابق ۱۶۲۸ء میں ہوئی۔ یہ خاقانی کی طرز پر قصائد کہتا تھا۔ جہاں تک غزل کا تعلق ہے اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے ایک نیا طرز اپنایا۔ لیکن حقیقت میں تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ وہ بابا فغانی کا طرز تھا۔ اس کی مشہور مثنوی "نمک دانِ حقیقت" ہے اس میں اس نے سنائی کی پیروی اس حد تک کی ہے کہ بہت سے لوگ اس کو آخر الذکر کے ہی قلم کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ شفائی نے اپنی مثنوی "مطلع الانوار" میں خاقانی کے منظوم سفرنامہ "تحفتہ العراقین" جو "مجمع البحرین" کے نام سے بھی مشہور ہے، کہ طرز کا بھی تتبع کیا ہے اس کی دیگر مثنویاں بھی دستیاب ہیں۔ شفائی نمایاں طور پر ایک ہجوگو اور تیز و تند لہجے کا شاعر تھا چونکہ وہ حساس زود رنج اور متشدد تھا اس لیے اس کے اندر دوسروں کے ناشائستہ برتاؤ اور

ناموں بابنوں کے تئیں فوری ردعمل پیدا ہو جاتا تھا۔ تاہم اس کو غیر ضروری چیزوں سے نفرت تھی وہ دوسروں کے سامنے جھکتا نہیں تھا۔ حتیٰ کے شاہ عباس اول کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ جوکہ اس کی نخوت کے باوجود اس کا بہت زیادہ احترام کرتا تھا (یان ریپکا، ہسٹری آف ایرانین لٹریچر، ہولینڈ، ۱۹۶۸، صفحہ ۳۰۰)

(۳) تذکرہ محمد طاہر نصرآبادی اصفہانی، بتصحیح وحید دست گردی، طہران، ۱۳۱۷، صنہ ۲

(۴) مولوی عبدالمقتدر خاں، اورینٹل پبلک لائبریری بانکی پور کے عربی و فارسی مخطوطات کی فہرست، جلد سوم، لندن، ۱۹۱۲، صفحہ ۷

(۵) ایضاً، صفحہ ۱۷

(۶) ایضاً

(۷) محمد قدرت اللہ گوپاموی، چاپخانہ سلطانی بمبئی، ۱۳۳۶، ص ۴۰-۵۳۹

(۸) بتصحیح عبداللہ خاں، لاہور، ۱۹۱۳، ص ۵۱-۵۰

(۹) محمد طاہر نصرآبادی، ایضاً، ص ۲۴۸-۲۴۷

(۱۰) بتصحیح صادق علی دلاوری، عالمگیر پریس، لاہور، ۱۹۳۴ ص ۸۶-۸۵

(۱۱) علی ابراہیم خاں خلیل، صحف ابراہیم، تصحیح و ترتیب عابد رضا بیدار، پٹنہ بہار ۱۹۷۸، ص ۱۳۶

(۱۲) کلیات میرزا جلال اسیر، منشی نولکشور پریس، لکھنؤ ۱۲۹۷ ہجری، ص ۲۸۸-۲۸۷

(۱۳) ایضاً ص ۲۸۱

(۱۴) کلیات میرزا جلال اسیر (نسخہ خطی ذاتی) ورق ۱۵۵ الف

(۱۵) کلیات میرزا جلال اسیر، مطبوعہ منشی نولکشور، ص ۱۰۲-۱۰۱

(۱۶) اورینٹل پبلک لائبریری بانکی پور کے عربی و فارسی مخطوطات کی فہرست، جلد سوم ص ۱۷

(۱۷) ایضاً۔ (۱۸) یان ریپکا، ہسٹری آف ایرانین لٹریچر، صنہ ۳۰۰

(۱۹) تذکرہ نصرآبادی۔ ایضاً، ص ۲۴۹-۲۴۸۔

سرپرست اعلیٰ ندوۃ المصنفین دھلی

عالیجناب حکیم عبدالحمید صاحب (چانسلر جامعہ ہمدرد نئی دہلی و علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

نگران اعلیٰ

حضرت مولانا

حکیم محمد زماں حسینی

جلد: ۱۲۴ | مارچ و اپریل ۱۹۹۹ء | شمارہ: ۳،۴

اس شمارے میں

زرِ تعاون

فی پرچہ: ۶ روپے

سالانہ: ۷۲ روپے

رحمن کمپیوٹرس دھلی

Ph.:6952082

جملہ خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ:

منیجر ماہنامہ برہان

4136-اردو بازار، جامع مسجد دہلی-110006 فون نمبر: 3262815

عمید الرحمٰن عثمانی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان، اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

اس خبر پر کس کو استعجاب نہ ہوگا کہ چار سال کے دو لڑکوں نے اپنے پڑوسی کی تین سالہ لڑکی کو اینٹوں، پتھروں سے کچل کر اور چاقوؤں سے گود کر اس کو ہلاک کر دیا۔ چار سال کے لڑکوں کی عمر ہی کیا ہوتی ہے اس عمر میں تو صحیح معنوں میں بچہ کو چلنا بولنا بھی ٹھیک طرح سے نہیں آتا ہے چہ جائیکہ اس عمر میں اپنے سے کم عمر کی لڑکی کو قتل کر دینا، یہ صرف حیرت و تعجب ہی کی بات نہیں ہے اس پر جس قدر بھی غم کیا جائے وہ کم ہی ہے، لیکن اس خبر میں اس سے بھی تشویشناک اور حیران کن یہ واقعہ بھی ہے کہ ان چار سال کے دونوں لڑکوں نے اپنے پڑوس کی اس تین سالہ لڑکی کو قتل کرنے کے بعد اس کی نعش کو گھسیٹ کر نالے میں پھینک دیا اس کے بعد یہ چار سال کے معصوم لڑکے گھر آئے اور اپنے خون آلودہ ہاتھ دھو کر ٹی وی دیکھنے لگ گئے اس خبر کو پڑھنے کے بعد کیا کہا جائے۔ چار سال کے ان دو بچوں کا اسے قصور کہیں یا اس مزاج و ماحول کو ہمیں قصوروار ٹھہرانا پڑیگا جس میں اس قسم کے تشدد کے واقعات کو مصنوعی طریقے سے لٹریچر، سنیما اور الیکٹرونک میڈیا کے ذریعہ عوام الناس کے ذہنوں میں منقش کیا جارہا ہے۔ اور جب عوام کو اس قسم کی تعلیمات سے روشناس کرایا جائے تو ایسی صورت حال میں جو بھی خطرناک واقعہ رونما ہو جائے اسے کم ہی کہا جائے گا۔ ان چار سال کے بچوں پر کوئی قانونی دفعہ بھی لاگو نہیں ہوتی ہے قانونی دفعات میں دفعہ ۸۲ کے تحت ۷ سال سے نیچے کے بچوں کو مجرم نہیں مانا جاسکتا ہے۔ ٹی وی ہمارے دل ودماغ پر اس قدر چھا گیا ہے کہ پیدائشی بچے جرم وسزا کے ماحول میں جب پرورش پائیں گے تو کیا حال ہوگا اس معاشرہ کا جس میں ہم لوگ جی رہے ہیں اسے سوچ سمجھ کر ہی ہمارے رونگٹے کھڑے ہو رہے ہیں۔

ماڈرن انسان نے اپنے عیش و آرام اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے ایسی ایسی ایجادات کر ڈالی ہیں کہ جس سے وہ ایسے جال میں جا پھنسا جو اس کی ہلاکت ہی کا باعث بن گئیں۔ کہاں چین وسکون کی تلاش میں اس نے اپنی چھلانگ چاند تک پر لگا ڈالی مگر جب اس نے اپنے گردوپیش میں جھانک کر دیکھا تو اسے سوائے نامرادی اور افسوس کے کچھ بھی نہیں ملا۔ ہم نے مانا کہ اس نے اپنی سائنسی ایجادات کے بل بوتے پوری دنیا کو ایک کوزہ میں لاکر بند کر دیا۔ ہوائی جہاز کی ایجاد نے دہلی اور امریکہ، لندن اور نیویارک، کراچی اور بمبئی، چین اور عرب وحجاز کو چند گھنٹوں

میں ایک دوسرے میں ملا دیا، ریل گاڑی جب ایجاد ہوئی تھی تو اسے دیکھ کر ہی یہ کہا گیا تھا کہ اب ہر جگہ کا سفر آسان ہو گیا، بیل گاڑی، یکہ، رکشا وغیرہ ریل گاڑی کے آگے بونے ہو کر رہ گئے اور جب ہوائی جہاز آیا تو بحری جہاز اس کے آگے کمتر و ہیچ نظر آنے لگے۔ اسی طرح بجلی جب بنی تو ماڈرن انسان اپنے کو مفخر سمجھنے لگا اور اس نے دعویٰ کیا کہ اب انسان نے رات کو دن بنانے کا ہنر سیکھ لیا۔ روشنی آگئی ہے اندھیرے کا زمانہ ختم ہو گیا ہے۔ مگر دراصل یہ انسان کا اپنا خیال تھا جس کی وقعت صرف اور صرف انسان کے لئے وہم سے زیادہ کچھ بھی نہ معلوم ہوئی۔

ماڈرن انسان کی ایجادات نے اپنے ابتدائی دور میں جو خوشی اور بظاہر سکون و آرام انسان کو دیا تھا کچھ ہی عرصہ بعد اس کا کھوکھلا پن انسان کے سامنے اجاگر ہو گیا۔ اور جو چیز انسان اپنے لئے سکون و راحت، آرام و آسائش کی سمجھنے لگا تھا اس پر بہت ہی جلد یہ بات منکشف ہو کر رہی کہ یہ نئی ایجادات جہاں افادیت کے پہلو رکھتی ہیں وہیں اس میں انسانیت کی ہلاکت کا سامان اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ایک معمولی پرندہ کے ٹکرا جانے سے ہوائی جہاز حادثہ کا شکار ہو جاتا ہے اور اس میں سوار سینکڑوں ہزاروں افراد آن کی آن لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔ ان کے جسم کا ہر حصہ کرچ کرچ ہو جاتا ہے اور بعض مرتبہ تو یہ پہچاننا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ انسانی جسم کے یہ ٹکڑے کس کس انسان کے ہیں۔ اسی طرح سائنس کی دوسری ایجادات کے نقصانات سامنے آتے رہتے ہیں۔ بجلی کی ایجاد نے دوسری کئی ایسی چیزوں کو بھی پیدا کیا جس نے انسانی معاشرہ میں وہ زہر گھول کر رکھ دیا کہ اب اگر انسان اس سے بچنا بھی چاہے تو وہ اس کے لئے نا ممکن ہے۔

یہ تو ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ سائنسی ایجادات نے دور دراز میں پھیلی دنیا کو ایسا مختصر کر دیا کہ اگر امریکہ میں کوئی واردات ہوتی ہے تو اسے دہلی، لکھنؤ، بمبئی، کراچی یا دنیا کے کسی بھی کونے میں بیٹھا انسان اسی وقت دیکھ سکتا ہے، گھنٹوں منٹوں و سکنڈوں کا فاصلہ ہی ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ لیکن اس سے جو بنی نوع انسانی کے مزاج میں فرق پڑا ہے وہ زہر ہلاہل سے کم نہیں ہے۔ آج دہلی میں رہنے والے بچے کا جو دماغ جس چیز کی خواہش رکھتا ہے وہی خواہش لندن، پیرس یا نیویارک، کراچی کے بچہ میں بھی بالکل اسی طرح پیدا ہوئی رکھی ہے۔ ان سائنسی ایجادات سے پہلے اگر دہلی، لکھنؤ یا بمبئی کے بچے کی کوئی عادت تھی تو اس کا بالکل بھی اثر نیویارک یا لندن کے بچے پر نہیں ہوتا تھا، اس کی وجہ ہے اخبارات سے بھی بڑھ کر ٹیلی ویژن نے اپنے جلوے دکھانے شروع کئے تو آج پوری انسانیت کے سامنے یہ مسئلہ دردِ سر بنا ہوا ہے کہ انسانیت کی ہلاکت کو کس

طرح روکا جائے۔ انسان کے چین و سکون کو کس طرح قائم رکھا جائے دنیا سے جرائم کو بڑھنے سے روکنے کے لئے کیا کارگر تدابیر اختیار کی جائیں۔

ویسے تو ایسی خبریں آئی روزانہ کا معمول بن گئی ہیں جن میں جرائم کے سلسلے میں حیرت انگیز واقعات کی روئیداد سامنے آتی ہیں۔ جس طرح سائنس کی ایجادات انسان کے لئے حیرت انگیز ہیں اسی طرح اس سے پیدا ہوئی حرکات و برائیاں بھی حیرت انگیز طریقے ہی سے سننے میں آتی ہیں۔ ابھی حال ہی میں امریکہ کے کولمبس ہائی اسکول میں دو کم عمر طلباء نے سال بھر سے تشکیل اپنی ایک اسکیم کے تحت اپنے ہی اسکول میں اپنے ہی ساتھی طلباء اور اپنے استاد کو پھرتی کے ساتھ ایکدم گولی کا نشانہ بنا کر موت کے گھاٹ اتار دیا اور جسے دیکھ کر نہ صرف امریکہ ہی بلکہ پوری یوروپی دنیا سکتے میں آکر رہ گئی۔ قتل وڈاکہ زنی کی واردات جب بھی ہوتی تھیں جب انسان نے ترقی کی دوڑ میں قدم نہیں رکھا تھا، مگر اس کی نوعیت وہیئت اس طرح کی نہ ہوتی تھی جس طرح اس ترقی یافتہ ماڈرن سائنسی ماحول میں دیکھنے میں آرہی ہے۔ پہلے کسی وجہ سے ایسی واردات سرزد ہو جایا کرتی تھیں لیکن آج تو کوئی وجہ نہیں بس بیٹھے بیٹھے کسی کے دماغ میں کچھ آیا اور اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً ہی اس پڑوس کے یا پھر کہیں دور دراز کے اپنے ہی جیسے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنا شروع کر دیا۔ ابھی ہمارے ملک کے صوبہ بہار میں رنبیر سینا نام کی کسی تنظیم نے بہار کے دیہاتوں میں انسانی جانوں کو بے دردی کے ساتھ بلا وجہ ہلاک کرنے کا سلسلہ وقفہ وقفہ سے شروع کر رکھا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے خبر آئی تھی کہ رنبیر سینا نے کسی دیہات میں گھس کر کئی انسانوں کو بے سان وگمان گولی چلا کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور اب پھر تازہ خبر آئی ہے کہ اسی رنبیر سینا نے بہار کے گاؤں میں ۱۲ افراد کو گولیوں سے بھون ڈالا، جس کے نتیجہ میں بے سان وگمان سہاگن عورتیں بیوہ ہو گئیں، معصوم بچے یتیم ہو گئے، کولمبس ہائی اسکول کے دو طلباء نے جس طرح وحشیانہ طریقہ سے اپنے بے قصور ساتھی طلباء وطالبات اور استاد کو گولیوں سے بھون کر موت کی آغوش میں پہنچایا ہے وہ ایک دردناک واقعہ ہے۔ بچوں کے ماں باپ اس انتظار میں تھے کہ اب بچے اسکول سے گھر آئیں گے، کپڑے اتاریں گے، بستے رکھیں گے، ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھائیں گے اور پھر ہم ان کے ساتھ باتیں کر کے مسرت وخوشی حاصل کریں گے لیکن اسکول سے ان کے مرنے کی خبر آئی تو وہ بیچارے اپنا سر ہی پیٹ کر رہ گئے۔ بلا کسی وجہ جب دل میں آیا اور کسی بھی انسان کو گولی مار کر ہلاک کر دیا جائے یہی بات سائنسی ایجادات سے انسانوں تک پہنچائی گئی ہے۔ امریکن کولمبس ہائی اسکول کے ان دو طلباء نے اپنے ۱۲ ساتھی [illegible]

ایک استاد کو ہلاک کرنے کے بعد خود بھی اپنے کو گولی مار کر ہلاک کر لیا۔ ماڈرن انسان کو سائنسی ایجادات نے سوائے دکھ، غم، پریشانیوں کے کچھ نہیں دیا، مذہب سے بیگانگی سائنس کا پہلا سبق ہے اور جب آدمی مذہب سے بیگانہ ہو جائے گا تو پھر انسان کی دنیا میں نہ تہذیب ہوگی نہ شرافت وانسانیت، نہ بھلائی کرنے کا جذبہ ہوگا اور نہ ہی نیکی کرنے کی خواہش واحتیاج، صرف نفسا نفسی ہوگی، خود غرضی ہوگی، مذہب کے پاس انسان کی زندگی کو سنوارنے، بنانے، نکھارنے کے لئے مفید وکارگر تدابیر ہیں کیونکہ مذہب انسان کی جبلت وفطرت (نیچر) کو سمجھتا ہے۔ مذہب کی تعلیمات کی بنیاد صحیح معنوں میں انسان کو انسانیت کے جامہ رکھنے کے لئے ہی ہیں، لیکن سائنس اپنی ایجادات کی اکڑ میں انسانیت کے فلسفہ حیات ہی کو فراموش کر بیٹھا۔ جس کی وجہ سے انسانی معاشرہ میں بے شمار اور قسم قسم کی برائیوں نے گھر کر لیا ہے اور جس نے انسانی تہذیب وشرافت اور تمدن وحضارت کو فنا ہی کر ڈالا ہے۔ یہ ماڈرن سائنس کی بیچارگی اور ناکامی کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ چار سالہ لڑکوں کے سنگین جرم کو صرف دیکھا جا سکتا ہے مگر اس کو روکا نہیں جا سکتا ہے۔ امریکہ کے ایک ہائی اسکول میں دو طلباء کے ذریعہ اپنے ہی ساتھی اسکولی طلباء اور ٹیچر کو جان سے مار کر ختم کر دینا اور بھارت کے ایک شہر میں ۴سال کے دو لڑکوں کا اپنے پڑوس کی تین سالہ لڑکی کو پتھروں سے کچل کر جان سے مار دینا جیسا شرمناک وسنگین واقعہ کا مرتکب سائنس کی جدید ایجادات کو ہی ٹھہرایا جائے گا اور اس پر تمام ہتھیاروں اور ساز وسامان سے لیس ماڈرن انسان کی بے بسی وبے کسی مذہبیت سے خالی سائنس کی ناکامی ہی عکاسی کرتی ہے!

بیان ملکیت و تفصیلات متعلقہ برہان دہلی

فارم چہارم قاعدہ نمبر ۸

مقام اشاعت :	۴۱۳۶، اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶	وقفہ اشاعت :	ماہانہ
طابع کا نام :	عمید الرحمٰن عثمانی	قومیت :	ہندوستانی
ناشر کا نام :	عمید الرحمٰن عثمانی	سکونت :	۴۱۳۶ اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶
ایڈیٹر کا نام :	عمید الرحمٰن عثمانی	قومیت :	ہندوستانی
سکونت :	۴۱۱۵، اردو بازار دہلی-۶	ملکیت :	ندوۃ المصنفین، جامع مسجد دہلی ۶

میں عمید الرحمٰن عثمانی ذریعہ ہذا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم اور یقین کے مطابق درست ہیں۔

(دستخط) طابع وناشر

عمید الرحمٰن

عمید الرحمن عثمانی

عبدالرؤف خاں اودوئی کلاں (راج) ۳۲۲۲۰۰   (قسط نمبر ۵)

قطعاتِ تاریخِ وفاتِ شعراء

شادؔ: سید محمد علی نام اور شادؔ تخلص تھا اور خان بہادر خطاب۔ محرم ۱۲۶۲ھ مطابق جنوری ۱۸۴۶ء میں عظیم آباد یعنی پٹنہ میں اپنے ناںھسال میں پیدا ہوئے۔ یہ آفتابِ سخن مشرق ہی میں طلوع ہوا اور ساٹھ سال سے زیادہ دنیائے اردو پر ضوفشاں رہ کر ۸ر جنوری ۱۹۲۷ء۔ ۴ر رجب ۱۳۴۵ھ کو ۸۱ سال کی عمر میں مشرق ہی کے افق میں غروب ہو گیا۔ مرتے وقت اپنا یہ شعر زبان پر تھا ؎

آخر ہے عمر، ضیق میں ہے دم بھی جان بھی
مردانہ باش! ختم ہے یہ امتحان بھی

رحلت سے دو دن بیشتر اپنا قطعۂ تاریخ ابجدی حروف میں خود ہی تحریر کیا:

مُردا ئینک علی محمد شادؔ   بردل من نشست میل عظیم
سالِ فوتش بگو بحرفِ ہجا   غین با شین و حرف ہا با میم [1]
۱۳۴۵ھ

دیگر شعرا کے بھی بہت سے قطعاتِ وفات شائع ہوئے۔ مثلاً پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی کا قطعہ ملاحظہ ہو:

تھے حریف چشم و گوش، اک قلم رفیق تھا   یا دماغ تھا، اگر تھا کسی پہ اعتماد
پیر کس مپرس وزار، نور چشم ہیچ کار   رنج جور روزگار، پھر مرض کا اشتداد
دل نے دی تسلی یوں موت کا بتا کے سن
"چھوٹ قید عمر سے شادؔ جا بسا وطن" [2]

۱۳۴۵ھ

(۱ و ۲) شاد کی کہانی شاد کی زبانی، مرتبہ پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی ص ۲۷۵ و ۲۷۸۔۲۷۷، مطبوعہ ۱۹۶۱ء مطبع معارف اعظم گڈھ۔

شفق رضوی کے تین قطعات میں سے صرف یہاں ایک قطعہ پیش کیا جاتا ہے:

شاد کے اٹھ کے جانے سے افسوس ہے　　ہو گئی بزم غزلخوانی اداس
ہے کہاں ایسا کوئی شیوا بیاں　　جانشینی ان کی جس پر آئے راس
سال تاریخ ان کی رحلت کا شفق
میں نے لکھا "شاد تھے جوہر شناس"[1]

۱۳۴۵ھ

مائل دہلوی: مرزا محمد تقی بیگ مائل کی ولادت ۱۸۵۲ء میں بمقام دہلی ہوئی۔ ۱۸۷۹ء میں جے پور چلے آئے اور ۱۸۸۰ء میں ملازم ہو گئے۔ پنشن کے بعد سانبھر رہنے لگے تھے۔ ۱۹ جمادی الاول ۱۳۵۰ھ۔ ۲ اکتوبر ۱۹۳۱ء یوم جمعہ کو جے پور خزانہ میں پنشن لینے گئے واپس ہوئے تو راستہ میں طبیعت خراب ہو گئی اور جے پور گھر پہونچ کر طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ مرزا احمد شاہ بیگ جوہر مراد آبادی نے کئی قطعات وفات کہے دو قطعات پیش ہیں:

رفت مائل چو جے پور برائے پنشن　　کرد مسدود ہوا دار قضا حرکت دل
مرگ حق است مگر مرگ غریب الوطنی　　میکند فاتحہ خوانی بعزیزاں مشکل
از پئے مرگ مفاجات نوشتم جوہر
"مائل جام مئے کوثر دیں شد مائل"[2]

(۱۳۵۰ھ)

ایک قطعہ اردو زبان میں ملاحظہ ہو:-

سن کے ہو جاتے تھے سب مسحور مائل کا کلام　　شعر گوئی شعر خوانی تھی کہ سحر سامری
ساتھ ہی مغفور کے لطف زباں دانی گیا　　اٹھ گئی شیریں کلامی رنگین نوحہ گری
شہر دہلی رہ گیا جوہر تن بے جان و نور
"ہو گئی گل شمع روح بزم شعر و شاعری"[3]

(۱۹۳۱ء)

---

(۱) گنجینۂ تواریخ ص ۳۲ (۲ و ۳) پندرہ روزہ "شاعر" آگرہ، ۱۵ر جنوری ۱۹۳۲ء ص ۵

دلگیر: سید نظام الدین شاہ صاحب دلگیر اکبر آبادی کی وفات ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴ء میں ہوئی۔ قادری صاحب نے تیرہ قطعات کہے۔ ان میں سے دو یہاں لکھے جاتے ہیں جو دو صنائع پر مشتمل ہیں:

تاریک بے دلگیر ہے اب محفل مہر ووفا — خالی ہے اب دلگیر سے شعر و سخن کا میکدا
صحت میں عیش ایسے کئے دنیا بھی حیراں ہوگئی — پھر رنج بیماری سہا تقدیر میں جو تھا بدا
جز صبر کچھ چارہ نہیں حامدؔ غمِ دلگیر میں — ہونا ہے دنیا میں یہی انجام ہر شاہ و گدا
تھی آرزو تاریخ میں تقلید مومنؔ خاں کی ہو — جب دیر تک کی جستجو، ہاتف سے آئی یہ صدا

سب بے سر وپا ہو گئے دلگیر سے جانے کے بعد
"لطف وکرم، شعر و سخن، عشق ووفا، وصل وادا"
(۱۳۵۳ھ سیلیکشنز ..... قادری ص۷۹)

چوتھے شعر میں مومنؔ کی اس تاریخ کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؔ کی وفات پر کہی تھی، جس کا مادہ ہے:

دست بیداد اجل سے بے سر وپا ہو گئے — "فقر و دیں، فضل وہنر، لطف وکرم، علم وعمل"
(۱۲۳۹ھ)

قادری صاحب کی دوسری تاریخ کا صرف مادہ لکھا جاتا ہے جو فارسی میں ہے:۔

دلم بگفت کہ بیدل زمرگ او گشتند — "وفا وناز وکرم، ذوق وشوق وشعر و سخن"
۱۹۳۴ء

پہلا قطعہ صنعت بے سر وپا میں ہے جب کہ دوسرے قطعے میں درمیانی حروف ساقط کئے ہیں۔ علامہ راشد الخیری کی وفات کا تاریخی شعر ایک تیسری صفت میں ہے، جس میں تخرجہ کے لئے عدد کو برتا ہے:۔

اگر وہ اور بھی دو سال جی گئے ہوتے
تو ہوتی نام سے تاریخ "راشد الخیری"
(۱۳۵۴-۱۳۵۶ھ) (قادری انگریزی حصہ ص ۸۰)

علامہ سر محمد اقبال: علامہ اقبال ۱۳۵۷ھ مطابق ۱۹۳۸ء میں راہی فردوس بریں ہوئے۔ علامہ سیماب اکبر آبادی نے تاریخ کہی:

نوزدہ ماہ صفر وقت صباح　　روح اقبال از غم لاحق گزشت
عارف حق ، قائد ملت نماند　　مرد مومن بندۂ صادق گزشت
راز دار سوز وساز انجمن　　صورت پروانۂ ناطق گزشت

کرد چوں سیماب فکر سال مرگ
گفت ہافت "شاعرِ مشرق گزشت"[1]
(۱۹۳۸ء)

یہ تاریخ "شاعر" بمبئی ۱۹۷۸ء میں دوبارہ شائع ہوئی تھی، مگر ستم یہ کہ مادہ یوں چھپ گیا:۔

"شاعر مشرق گذشت"

مولانا پروفیسر ڈاکٹر حامد حسن قادری مرحوم نے وفات اقبال پر بہت سے قطعات لکھے جو طویل مبسوط بھی ہیں، ان میں سے صرف دو تین قطعات لکھے جاتے ہیں:

برفت اقبال ہندوشرق واسلام　　شکوہ رفتہ باز آید کہ ناید
زشعرش ساخت حامد سال رحلت　　بشان امتیاز آید کہ ناید

"برفت اقبال آں عرفاں نوائے"　　۱۳۳۵+
دگر دانائے راز آید کہ ناید[2]"　　۶۰۳=۱۹۳۸ء

اس "ترجمان حقیقت فیلسوفِ عصر" (۱۹۳۸ء) کے سانحہ ارتحال پر قادری صاحب نے دوسرا قطعہ صنعت ترصیع میں لکھا، جس میں کل آٹھ شعر ہیں۔ یہاں صرف دو شعر پیش ہیں پہلا اور آخری:

---

(۱) ماہنامہ شاعر بمبئی ۱۹۷۸ء جلد ۴۹ شمارہ ۱۲　(۲) سلیکشنز آف پروفیسر قادری ز۔ کرونوگرامز مرتبہ ڈاکٹر خالد حسن قادری (لندن) ص ۸۴۔۸۳ ناشر قادری اکادمی، گلشن اقبال، کراچی ۱۹۸۸ء

"رفت اقبال آفتاب جہاں" (۱۳۵۷ھ)

"رفت اقبال وثبت بدر آیات" (۱۹۳۸ء)

"تربت پاک محفل قدسی" (۱۳۵۷ھ)

"روح پر نور ومہبط برکات"[۱] (۱۳۵۷ھ)

علامہ اقبال نے وفات سے قبل یہ شعر پڑھا تھا:

نشان مرد مومن باتو گویم　　چو مرگ آید تبسم برلب اوست

قادری صاحب نے دوسرے مصرع میں معمولی ترمیم کرتے ہوئے تاریخ برآمد کی:

"برلبش آید بدم مرگ تبسم"[۲]

۱۳۵۷ھ

ڈاکٹر قادری مرحوم نے "بہ تقلید معانی اسرار خودی اقبال" (۱۹۳۸ء) ایک تاریخی "مثنوی صلائے خودی" (۱۳۵۷ھ) لکھی اس کے آخری تین شعر ملاحظہ ہوں جو دعائیہ ہیں:

بادِ رحمت ہائے حق برتربتش　　آمد "المغفور" سالِ رحلتش

(۱۳۵۷ھ)

ہم زروئے دادِ دروحی کریم　　گفت ہاتف "عندہ اجر عظیم" (۱۳۵۷ھ)

سال دیگر ہم زقرآن مبین

گفت حامدؔ لذۃ للشٰربین[۳]"

(۱۳۵۷ھ)

احسنؔ: مولانا الحاج سید علی احسن احسنؔ مارہروی کا شمار داغ کے چہیتے شاگردوں میں ہوتا ہے۔ ان کی وفات ۱۳۵۹ھ / ۱۹۴۰ء میں ہوئی۔ پروفیسر حامد حسن قادریؔ صاحب نے کئی تاریخیں کہیں، ان میں سے ایک یہاں پیش ہے، جس سے ان کی شخصیت کے گوشے بھی نمایاں ہوتے ہیں:

راہی جنت ہوئے احسن مارہروی　　ہوگئی رونق بڑی انجمن خلد میں

(۱، ۲و۳) ایضاً ص ۸۵، ۸۶ نیز ۹۳۔

حافظ و حاجی بھی تھے، عالم و صوفی بھی تھے　　　ہوتے نہ کیوں آپ بھی انجمن خلد میں
شاعر و نقاد تھے، فاضل و استاد تھے　　　اب نہ رہی کچھ کمی انجمن خلد میں

تعمیر سے بن گیا سال، جو شامل ہوئے
"احسن مارہروی انجمن خلد" میں(۱)

۱۳۵۹ھ

مادہ جمع کے طریقے سے حاصل کیا ہے یعنی "احسن مارہروی + انجمن خلد"۔

فانی: شوکت علی خان نام اور فانی تخلص تھا۔ پیدائش اسلام نگر ضلع بدایوں میں ہوئی۔ افغانی الاصل قبیلہ سے تھے۔ یوپی میں کئی مقامات پر وکالت کی اور آخر میں حیدر آباد فرخندہ بنیاد میں جا کر نواب کے یہاں ملازم ہو گئے۔ ۱۳۶۰ھ میں حیدر آباد میں انتقال ہوا۔ اردو شاعری کے ستون۔ شاعری میں امام یاسیات کہے جاتے ہیں۔ انتقال سے ایک سال پہلے اپنی تاریخ وفات خود کہی جو سچ نکلی:

اواز جہاں گشت گذشت آخر خدا نبود　　　اوایں چنیں بہ زیست کہ گویا خدا نداشت

طغیان نازبیں کہ بہ لوح مزار او
ثبت ست سال رحلت فانی "خدا نداشت"(۲)

۱۳۶۰ھ (۱۹۴۱ء)

قمر: جناب قمر الحسن صاحب قمر بدایونی ۱۸۷۵ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ فانی کے ہم عصر تھے۔ اتفاق سے رحلت بھی اسی سنہ میں ہوئی، جس سال فانی کا انتقال ہوا۔ یعنی ۱۳۶۰ھ ۱۹۴۱ء پروفیسر قادری صاحب نے قطعہ کہا:۔

کچھ مرگ قمر، مرگ قمر ہی نہیں تنہا　　　یہ موت کرم، فوت ادب، مرگ ہنر ہے
محبوب و عزیز اور بدایوں پہ نہیں حصر　　　خود شعر و سخن نوحہ گر و خاک بسر ہے
مٹنے کا نہیں داغ کبھی مرگ قمر کا　　　تاریخ بھی ہے واقعہ بھی، "داغ قمر"(۳) ہے

۱۳۶۰ھ

(۱) سلیکشنز آف پروفیسر قادری ز۔ کرونوگرامز ص ۱۱۴۔ (۲) تاریخ گویان بدایوں ص ۹۸۔ (۳) سلیکشنز آف پروفیسر قادری ز۔ کرونوگرامز (اردو حصہ) ص ۶۲

مرزا عظیم بیگ چغتائی:۔ بی اے۔ ایل ایل بی وکیل جودھپور و سابق جج جاورہ متوفی ۱۳۶۰ھ۔
قطعہ تاریخ از پروفیسر قادری:۔

کس دل سے میں کہوں کہ عظیم آہ کیا ہوئے شاگرد بھی رشید تھے وہ، دوست بھی عزیز
کیا کیا ذرا سی عمر میں نام خدا ہوئے ہر دل عزیز ادیب، مصنف، وکیل، جج
مرزا کی ذات پر جو ہوئے تو بجا ہوئے اردو کے ناز، ہند کے ناز، آگرے کے ناز
گو یہ بھی سچ ہے، موت کے حق سے ادا ہوئے سچ یہ ہے زندگی کا تو حق ان پہ رہ گیا
یعنی "عظیم" داخل "دارالبقا" ہوئے [1] تاریخ کا بھی حق ہو دل زار سے ادا

۱ ۱۰۲۰ ۳۳۹
=۱۳۶۰ھ

فوق: منشی محمد دین فوق۔ داغ کے تلامذہ میں سے تھے۔ فوق صاحب نے کشمیر کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے اس لئے انہیں مجدد کشامرہ کہتے ہیں۔ لاہور میں اس صدی کے اوائل میں مشاعروں کا بڑا رواج تھا۔ ایک دفعہ کسی نے مصرع طرح دیا:

فوق صاحب گلی میں رہتے ہیں

چنانچہ شعرا نے اس پر طبع آزمائی شروع کر دی اور گلی میں رہتے ہیں، تیری چمپا کلی میں رہتے ہیں، جیسے مصرعے ہوگئے، علامہ سیماب اکبر اللہ آبادی نے قطعہ وفات کہا:

بود شاگرد داغ پاک ضمیر کرد رحلت محمد دین فوق
خوش بیاں، خوش مزاج، خوش تحریر شاعر و نکتہ داں، مدیر و ادیب
روز جمعہ بسوئے ملک کبیر چاردہ از مہ ستمبر بود

(۱۴ر ستمبر روز جمعہ)

گفت تاریخ رحلتش سیماب
"انتزاع مورخ کشمیر" [2]

۱۹۴۵ء

یعنی سیماب نے اس کی رحلت کی یہ تاریخ کہی کہ (موت مورخ کو اکھاڑ لے گئی۔)

---

(۱) حوالہ سابق ص ۶۴ (۲) ماہنامہ معارف اعظم گڑھ اگست ۱۹۸۲ء ص ۲۶۔۱۲۵

فرحت اللہ بیگ:۔ فرحت اللہ بیگ صاحب ۱۳۶۶ھ مطابق ۱۹۴۷ء میں راہی آخرت ہوئے۔ مسعود علی صاحب محوی نے قطعہ تاریخ کہا:ء۔

تھے فرحت بڑے پہلوان سخن زبان معانی تھے جان سخن

جو اٹھ گئے اٹھ گئی ان کے ساتھ بہار زباں عز و شان سخن

"عنادل خزاں آگئی باغ میں"

۱۹۴۷ء

"گیا بلبل گلستان سخن"[۱]

۱۳۶۶ھ

ناطق لکھنوی:۔ حکیم سید ابو العلا سعید احمد ناطق لکھنوی ۹/ اکتوبر ۱۹۵۰ء/ ۱۳۶۹ھ کو چاٹگام میں راہی فردوس بریں ہوئے۔ مولانا وحشت کلکتوی نے قطعہ تاریخ کہا جو نہایت بر محل ہے:۔

ناطق لکھنوی ہوئے بزم جہاں سے منتقل شاعر نکتہ سنج کی آج ہوئی زباں خموش

سال وفات کی جو فکر وحشت خستہ دل نے کی ہاتف غیب سے سنا "ناطق رازداں خموش"[۲]

۱۳۶۹ھ

سائل دہلوی:۔ سائل کی رحلت کا قطعہ وفات (۱۳۶۴ھ) کا ترتیب سنین کے لحاظ سے ناطق و فرحت اللہ سے پہلے آنا چاہئے تھا۔ لیکن سہواً بعد میں درج کیا جارہا ہے۔ جے پور کی بزم احباب نے ۲۴/ فروری ۱۹۴۲ء کو یوم سائل منایا تھا۔ اس کے سکریٹری مصباح الدین عثمانی نے پروفیسر قادری کو بھی شرکت کی دعوت دی تھی۔ مشاعرہ کی طرح یہ رکھی گئی تھی: "جناب داغ کے داماد ہیں اور دلی والے ہیں" واضح ہو کہ سائل صاحب داغ کے بھتیجے اور داماد تھے۔ قادری صاحب جلسے میں تو شریک نہ ہو سکے مگر دعوت نامہ ملتے ہی اس کی پشت پر درج ذیل قطعہ تاریخ لکھ کر مصباح صاحب کو بذریعہ ڈاک بھیج دیا:۔

حضرت سائل کا ماتم ہورہا ہے بزم میں ہم یہاں غم گین ہیں، وہ خلد بریں میں شاد ہیں

دھوم تھی سائل کی اک دلی میں کیا کل ہند میں ان کا پڑھنا یاد ہے، پڑھنے کے تیور یاد ہیں

---

(۱) نقوش (لاہور) شخصیات نمبر ص ۱۶۷ (۲) قادری ص ۱۷۴۳۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی: ۔بی اے۔ ایل ایل بی وکیل جودھپور وسابق جج جاورہ متوفی ۱۳۶۰ھ۔

قطعہ تاریخ از پروفیسر قادری:۔

شاگرد بھی رشید تھے وہ، دوست بھی عزیز ۔۔۔ کس دل سے میں کہوں کہ عظیم آہ کیا ہوئے

ہر دل عزیز ادیب، مصنف، وکیل، جج ۔۔۔ کیا کیا ذرا سی عمر میں نام خدا ہوئے

اردو کے ناز، ہند کے ناز، آگرے کے ناز ۔۔۔ مرزا کی ذات پر جو ہوئے تو بجا ہوئے

سچ یہ ہے زندگی کا تو حق ان پہ رہ گیا ۔۔۔ گو یہ بھی سچ ہے، موت کے حق سے ادا ہوئے

تاریخ کا بھی حق ہو دل زار سے ادا ۔۔۔ یعنی "عظیم" داخل "دارالبقا" ہوئے (۱)

۳۳۹+۱۰۲۱ =۱۳۶۰ھ

فوق: منشی محمد دین فوق۔ داغ کے تلامذہ میں سے تھے۔ فوق صاحب نے کشمیر کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے اس لئے انہیں مجدد کشامرہ کہتے ہیں۔ لاہور میں اس صدی کے اوائل میں مشاعروں کا بڑا رواج تھا۔ ایک دفعہ کسی نے مصرع طرح دیا:

فوق صاحب گلی میں رہتے ہیں

چنانچہ شعرا نے اس پر طبع آزمائی شروع کردی اور گلی میں رہتے ہیں، تیری چمپا کلی میں رہتے ہیں، جیسے مصرعے ہوگئے، علامہ سیماب اکبر آبادی نے قطعہ وفات کہا:

کرد رحلت محمد دین فوق ۔۔۔ بود شاگرد داغ پاک ضمیر

شاعر ونکتہ داں، مدیر وادیب ۔۔۔ خوش بیاں، خوش مزاج، خوش تحریر

چاردہ از مہ ستمبر بود ۔۔۔ روز جمعہ بسوئے ملک کبیر

(۱۴ر ستمبر روز جمعہ)

گفت تاریخ رحلتش سیماب

"انتزاع مورخ کشمیر"(۲)

۱۹۴۵ء

یعنی سیماب نے اس کی رحلت کی یہ تاریخ کہی کہ (موت مورخ کو اکھاڑ لے گئی۔)

(۱) حوالہ سابق ص ۶۴ (۲) ماہنامہ معارف اعظم گڑھ اگست ۱۹۸۲ء ص ۲۶۔۱۲۵

فرحت اللہ بیگ: ۔ فرحت اللہ بیگ صاحب ۱۳۶۶ھ مطابق ۱۹۴۷ء میں راہی آخرت ہوئے۔ مسعود علی صاحب محوی نے قطعہ تاریخ کہا:ع۔

تھے فرحت بڑے پہلوان سخن　　زبان معانی تھے جان سخن
جو اٹھ گئے اٹھ گئی ان کے ساتھ　　بہار زباں عزّ وشان سخن

"عنادل خزاں آگئی باغ میں"

۱۹۴۷ء

"گیا بلبل گلستان سخن"(۱)

۱۳۶۶ھ

ناطق لکھنوی: ۔ حکیم سید ابو العلا سعید احمد ناطق لکھنوی ۹/اکتوبر ۱۹۵۰ء/۱۳۶۹ھ کو چاٹگام میں راہی فردوس بریں ہوئے۔ مولانا وحشت کلکتوی نے قطعہ تاریخ کہا جو نہایت برمحل ہے:۔

ناطق لکھنوی ہوئے بزم جہاں سے منتقل　　شاعر نکتہ سنج کی آج ہوئی زباں خموش
سال وفات کی جو فکر وحشت خستہ دل نے کی　　ہاتف غیب سے سنا "ناطق رازداں خموش"(۲)

۱۳۶۹ھ

سائل دہلوی: ۔ سائل کی رحلت کا قطعہ وفات (۱۳۶۴ھ) کا ترتیب سنین کے لحاظ سے ناطق و فرحت اللہ سے پہلے آنا چاہئے تھا۔ لیکن سہواً بعد میں درج کیا جارہا ہے۔ جے پور کی بزم احباب نے ۲۴/فروری ۱۹۴۲ء کو یوم سائل منایا تھا۔ اس کے سکریٹری مصباح الدین عثمانی نے پروفیسر قادری کو بھی شرکت کی دعوت دی تھی۔ مشاعرہ کی طرح یہ رکھی گئی تھی: "جناب داغ کے داماد ہیں اور دلّی والے ہیں" واضح ہو کہ سائل صاحب داغ کے بھتیجے اور داماد تھے۔ قادری صاحب جلسے میں تو شریک نہ ہو سکے مگر دعوت نامہ ملتے ہی اس کی پشت پر درج ذیل قطعہ تاریخ لکھ کر مصباح صاحب کو بذریعہ ڈاک بھیج دیا:۔

حضرت سائل کا ماتم ہو رہا ہے بزم میں　　ہم یہاں غم گین ہیں، وہ خلد بریں میں شاد ہیں
دھوم تھی سائل کی اک دلی میں کیا کل ہند میں　　ان کا پڑھنا یاد ہے، پڑھنے کے تیور یاد ہیں

(۱) نقوش (لاہور) شخصیات نمبر ص ۱۱۶۷ (۲) قادری ص ۱۴۳ء۔

قدر دانِ رنگ دہلی، سب ہیں ان کے قدر داں ان کے قائل ہیں جو طرزِ داغ کے نقاد ہیں
داغ کے ہمرنگ، ہمدم، ہمزباں، ہم خانداں ہیں جہاں استاد کے شاگرد، خود استاد ہیں

یہ نکلتا ہے دلِ مصباح سے سال وفات
"دلی والے ہیں جناب داغ کے داماد ہیں"(۲)
(۱۳۶۴ھ)

سیماب :۔ علامہ سیماب اکبر آبادی کی رحلت ۱۹۵۱ء پر قادری صاحب نے تین قطعات تاریخ کا نذرانہ پیش کیا ہے۔ ایک قطعہ یہ ہے:۔

دے گیا داغ جدائی آخر وہ معظم وہ مکرم سیماب
فخر علم وادب استاد زباں فن کے اسرار کا محرم سیماب
وہ مصنف وہ سخنور وہ مدیر بانی شاعر و پرچم سیماب
صاحب وحی کے اب قرب میں ہے چھوڑ کر وحی مترجم سیماب

قادری لکھ دو یہ تاریخ وفات
"نرہا شاعر اعظم سیماب(۳)" ۱۹۵۱ء

حسرت کاشمیری :۔ مولانا چراغ حسن حسرت کاشمیری مشہور ادیب و مزاح نگار اور شاعر تھے۔ ان کی وفات ۵ ذی قعدہ ۷۴ ۱۳ھ / ۲۶، جون ۱۹۵۵ء کو ہوئی۔ حفیظ ہوشیار پوری نے قطعہ تاریخ کہا:۔

آج حسرت داغ حسرت دے کے رخصت ہو گیا دل میں اب روشن رہے گا رخصت حسرت کا داغ

بجھ گئی بزم صحافت میں صف ماتم حفیظ
"گل ہوا ہے آج اک بزم صحافت کا چراغ"(۴)

۱۹۵۵ء

شاغل : دیوان سید شاہ محمد عطاء الحق شاغل فریدی ۲۸ / صفر ۷۵ ۱۳ھ ۱۶ / اکتوبر ۱۹۵۵ء بروز ہفتہ راہی ملک عدم ہوئے۔ انہوں نے اپنی وفات سے پانچ سال قبل ایک رباعی کہی تھی۔ اتفاق

(۳) قادری ص ۱۷۴۳۔ (۴) ماہنامہ معارف اعظم گڑھ اگست ۱۹۸۲ء ص ۱۲۲۔

دیکھئے کہ اسی رباعی کے آخری مصرعے کے تین الفاظ ان کی وفات کا مادہ ثابت ہوئے جو بالکل تاریخی رباعی کے اصول پر ہے۔ خدا معلوم یہ رباعی کس قبولیت کی ساعت میں لکھی گئی تھی:۔

لائی ہے نوید آج اے شاغل اب جامہ ہستی کو بدل اے شاغل
رضوان نے سلیقے سے سجایا ہے فردوس حوریں تری مشتاق ہیں "چل اے شاغل"[1]

۱۳۷۵ھ

جگر مراد آبادی:۔ علی سکندر جگر مراد آبادی ۱۳۸۰ھ۔ ۱۹۶۰ء میں اس عالم فانی سے رخصت ہوئے۔ پروفیسر سید حنیف نقوی صاحب نے ان کی رحلت پر اردو اور فارسی میں دو قطعات لکھے:

شاعر رنگیں بیان وخوش نوا یعنی جگر چل دیے بزم جہاں سے کرکے ترک بود وباش
ہوگیا افسوس صد افسوس رخصت دہر سے کارگاہ فکر وفن کا اک انوکھا بت تراش
چور ہے اس غم سے ہر دل، پارہ پارہ ہے جگر جیسے ضرب سنگ سے ہوں آبگینے پاش پاش
محفل شعر وادب جب بھی سجائی جائے گی ہوگی ہر پروانے کو اس شمع محفل کی تلاش
مظہر تاریخ رحلت ہے یہ مصرع اے حنیف
"واقعہ مرگ جگر کا سانحہ ہے دلخراش"[2]

۱۹۶۰ء

فارسی قطعہ کا صرف حامل تاریخ شعر درج کیا جاتا ہے:۔

گفت تاریخ وفاتش کسے از غیب بہ گوشم
"جگر از بندِ جہاں عازم فردوس بریں شد"[3]

۱۳۸۰ھ

نوح ناروی:۔ رحلت ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۲ء۔ قطعہ وفات از قمر سنبھلی صاحب:۔

نوح تھے کامیاب تغزل ڈھل گیا اُف شباب تغزل
ہے قمر بس یہ تاریخ رحلت

---

(۱) معاصر اردو ادب، نئی دہلی شمارہ ۲، ۱۹۸۰ ص ۴۹ (۲و۳) مکتوب ڈاکٹر حنیف نقوی بنام راقم مورخہ ۱۶/ستمبر ۱۹۹۲ء

"چھپ گیا آفتاب تغزل"(۱)

۱۹۶۲ء

شاد:۔ نریش کمار نام شاد تخلص شاگرد جوش ملسیانی (لبھو رام) ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ ۱۹۶۹ء میں عالم شباب میں انتقال ہوا۔ جناب کالیداس گپتا رضا محقق عظیم و ماہر غالبیات نے قطعہ کہا جو شاد کی شخصیت کا آئینہ دار ہے:۔

آج کیسا یہ سانحہ گزرا　　آج لوح و قلم ہوئے برباد
کس کو معلوم تھا نریش کی ہے　　کل بیالیس سال کی میعاد
اس کی محرومیوں نے کھینچ لیا　　اس کو آخر سوئے عدم آباد
لے ہی ڈوبی اسے بلا نوشی　　داد محفل کی بن گئی بیداد
شوخ طبعی نے پھیر لیں آنکھیں　　ہوگیا شعر مائل فریاد
اے رضا! دور بیٹھے کیا کیجئے　　سال رحلت ہی اس کی اب ہے یاد
"دل تیرہ" کے ساتھ کہہ دیجے　　"شاد آفاق سے اٹھا ناشاد(۲)"

۱۹۶۹ء

شکیل:۔ شکیل احمد شکیل بدایونی، وفات اپریل ۱۹۷۰ء / ۱۳۹۰ھ۔ قطعہ وفات محمد ابرار علی صدیقی بدایونی نے کہا:۔

بشر فسردہ طبیعت ز انتقال شکیل　　ملال خاطر ناشاد را بیاں چہ کنم
ز جستجوئے تشکر بگفت ہاتف غیب　　غم شکیل تاریخ گشت "شکل غم"(۳)

۱۳۹۰ھ

لالہ جگن ناتھ کمال کرتار پوری:۔ وفات ۱۹۷۲ء شاگرد ہیں جوش ملسیانی کے رضا صاحب نے تاریخ کہی:۔

کمال صاحب فن اٹھ گیا، کہو تاریخ　　رضا سے لوگ مسلسل سوال کرتے ہیں

---

(۱) مکتوب قمر سنبھلی صاحب بنام راقم مرقومہ ۱۹/ جنوری ۱۹۹۱ء۔ (۲) مکتوب کالیداس گپتا رضا بنام راقم موصولہ ۲۳/ جنوری ۱۹۹۷ء ص ۷ (۳) تاریخ گویان بدایوں ص ۳۰۔

"یہ سخت سانحہ ہے، پھر بھی دو دماغ پہ زور　　"کسی طرح سے سخنور خیال کرتے ہیں"
غزل نظر میں تھی میرسے، یہ جوش صاحب کی　　"خیال کرتے ہیں"۔ "اظہار حال کرتے ہیں"
سر "عروض" نے کٹ کر کہا، یہ لو مصرع
"یہ کشتگان محبت کمال کرتے ہیں"(۱)

۱۹۷۲ء

شمیم کرہانی:۔ وفات ۱۹۷۵ء۔ قطعہ وفات بزرگ محترم پروفیسر مغیث الدین فریدی صاحب نے کہا:۔

لٹ گئی ہے بساط بزم غزل　　نہ سخن ہے نہ اب سخن دانی
ہو گئی دفن ساتھ شاعر کے　　فکر و فن کی بہار سامانی
بن کے تاریخ دل میں ڈوب گیا
"غم و رنج شمیم کرہانی(۲)"

۱۹۷۵ء

جوش:۔ نام لبھورام، ولادت یکم فروری ۱۸۸۳ء، تلمیذ داغ، وفات ۲۷ر جنوری ۱۹۷۶ء۔ جوش کے شاگرد رشید جناب کالی داس گپتا رضا نے وفات جوش پر کئی قطعات لکھے۔ دو ایک قطعات درج ذیل سطروں میں پیش ہیں، ان میں ایک خالی ہے۔ جوش ملسیانی کی ایک غزل کا شعر ہے:۔

شوق کا معیار کس سے پوچھئے　　طور کا شعلہ بھی اب خاموش ہے

رضا صاحب نے مصرع ثانی کے عدد گنے تو ۱۶۲۳ ہوئے چنانچہ "سیل رنج" (۳۵۳) کے تعمیے کے ساتھ قطعہ تاریخ کہا:۔

دے گیا داغ آخری شاگرد داغ　　اب سخن دانی کفن بردوش ہے
بوئے گل بے پر ہے مرگ جوش پر　　زلف عنبر بار، بار دوش ہے

---

(۱) مکتوب رضا بنام راقم مورخہ ۱۶ر ستمبر ۱۹۹۲ء میں (۲) مکتوب گرامی محترم پروفیسر ڈاکٹر مغیث الدین فریدی صاحب بنام راقم مورخہ ۲۲ر ۱۲ر ۹۶ء

بے حواسی کے ہیں عالم میں ادیب　　ہوش میں اب کون اہل ہوش ہے
مصرع استاد ہو تاریخ غم　　تو بھی شاگرد جناب جوشؔ ہے

لکھ دے "سیل رنج" کے ساتھ اے رضاؔ
"طور کا شعلہ بھی اب خاموش ہے"(۱)

۱۹۷۶ء

دوسرا قطعہ داغؔ کے ایک شعر کے آخری دو الفاظ "تلاش مضمون" کی رعایت سے کہا ہے:۔

دے گئے داغِ الم داغؔ کے شاگرد رشید　　جوش کے بعد ہے اب جوش سخن محض جنوں

بسکہ رہتی تھی انہیں بت نئے مضموں کی تلاش
سال رحلت کا ہوا۔ "جوش تلاش مضموں"(۲)

۱۹۷۶ء

<u>پروفیسر رشید احمد صدیقی</u>:۔ وفات ۱۹۷۷ء۔ قطعہ تاریخ از ڈاکٹر مغیث الدین فریدی صاحب

دل ظرافت کا سوگوار ہے آج　　طنز کی آنکھ اشکبار ہے آج
اٹھ گیا ناقد حیات وادب　　قلب اردو کا داغدار ہے آج
گل فشاں تھے جہاں رشید احمد　　رخصت اس باغ سے بہار ہے آج
قدر تہذیب ان کے دم سے تھی　　روح تہذیب بے قرار ہے آج
جس زباں میں وہ بات کرتے تھے　　اس زباں کا جگر فگار ہے آج
دفن ہوتا ہے آج طنز ومزاح　　بذلہ سنجی تہہ مزار ہے آج
نکتہ دانی کا آج ماتم ہے　　ذوق تنقید اشک بار ہے آج
کان میں گونجتی ہے ان کی صدا　　دامن ہوش تارتار ہے آج
"آہ" کے ساتھ لب پہ ہے تاریخ　　"رحلت فخر روزگار ہے آج"(۳)

۱۹۷۱+۶=۱۹۷۷ء

یہ مرثیہ پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم کی شخصیت کی بھرپور عکاسی کرتا ہے اور رباعی

(۱) مکتوب رضا ص ۳ (۲) حوالہ سابق ص ۳ (۳) ماہنامہ آج کل نئی دہلی مارچ ۱۹۷۷ء ص ۲۰

ادب میں اس کا ایک امتیازی مقام ہے۔ اس مرثیہ کے دو عنوان ہیں۔ "تاریخ وفات درد ناک" (۱۹۷۷ء) اور "رحلت پروفیسر رشید احمد صدیقی" (۱۹۷۷ء)

شرقی:۔ امیر الاسلام شرقی نے ۵؍جون ۱۹۷۹ء کو انتقال کیا۔ سید محمد حسن رضا دائروی نے اس سانحہ پر بڑا اچھا قطعہ کہا:۔

ہے سانحہ یہ کیسا بتائیں اہل فن   سرگشتہ خمار مذاق کہن کی موت

دست دعا اٹھاتے ہی آئی ندائے غیب

"شرقی کی موت یہ نہیں ہے علم و فن کی موت[1]"

۱۹۷۹ء

حفیظ:۔ خان بہادر ابوالاثر حفیظ جالندھری کا ارتحال ۱۹۸۲ء میں ہوا۔ دیگر قطعات کے علاوہ صرف شمیم امروہوی کا قطعہ نذر قارئین ہے:۔

ہے آج شاہنامہ اسلام غمزدہ   تلقین صبر کیجئے، ڈھارس بندھائیے

مرگ ابوالاثر پہ یہ ہاتف نے دی صدا   "جادو بیاں حفیظ کی میت اٹھائیے"[2]

۱۹۸۲ء

احسان دانش:۔ شاعر مزدور احسان دانش کی وفات (۱۴۰۲ھ؍۱۹۸۲ء) پر شمیم امروہوی نے قطعہ وفات بنیادی طور پر صنعت توشیح میں قطعہ کہا، لیکن آخری بیت میں تدخلے کے ساتھ صنعت ضرب کا اضافہ بھی کردیا ہے، جو اس فن پر شمیم صاحب کی دسترس کی دلیل ہے:۔

(۳۰۰)   شاعر مزدور کا سال وفات   (۴۰۰)

(۵)   ہو بصد رنج و محن اب آشکار   (۲۰۰)

(۱۰۰۰)   غیب سے ہاتف پکارا خاص کر   (۲۰۰)

(۹۰)   صاف ہے تاریخ مرگ اے سوگوار   (۲۰۰)

(۱)   آئی پھر یہ کان میں اپنے صدا   (۱)

(۲)   بے سبب ہے مضطرب اور بے قرار   (۲۰۰)

---

(۱) سہ ماہی اردو ادب ترقی دہلی ۱۹۸۰ء شمارہ ۲ ص ۸۹ (۲) انیس سوبیاسی از شمیم امروہوی مطبوعہ ۱۹۸۳ء ص ۱۰۷۔

(۱)	"اف سر افسوس سے آکر ملا	(۱)
(۱۳)	جب کہا "احسان دانش" چار بار(۱)	(۲۰۰)
۱۴۰۲ھ	(۷۵×۴=۱۹۰۰=۸۲+۱۹۰۰=۱۹۸۲ء	۱۴۰۲ھ

خدیجہ مستور :- مشہور افسانہ نویس وناول نگار محترمہ خدیجہ مستور کی شخصیت اردو داں طبقے کے لئے کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کا انتقال ۲۶ جولائی ۱۹۸۲ء ۴ر شوال ۱۴۰۲ھ کو لندن میں ہوا۔ میت لاہور لاکر دفن کی گئی۔ مزار کے باہر کی جانب یہ قطعہ درج ہے (دوسری عبارت کے بعد)

قصر خلد آنکھوں میں، پھر بھی لب پہ قدر آفاق کی مرتے دم تک یہ بصیرت وجہ حیرت ہے بہت
بجھ رہی تھی شمع ہستی، تب خدیجہ نے کہا: "ماہ وانجم کی یہ دنیا خوبصورت ہے بہت"(۲)

۱۹۸۲ء

دوسرا قطعہ یہ ہے:

چمن عشق نبیؐ میں آقا اٹھیں نکہات خدیجہ مستور
اسی گلپوش لحد سے ابھرے "ماہ درجات خدیجہ مستور"(۳)

۱۹۸۲ء

شمیم امروہوی نے خدیجہ مستور کی رحلت پر درج ذیل خوبصورت قطعہ کہا:۔

افسوس کہ گھیرا ہے جسے آج قضا نے لاریب وہ اردو کی تھی سوغات خدیجہ
ہاتف نے صدا دی یہ لکھو موت پہ اس کی "مستور ہوئی آنکھوں سے ہیہات خدیجہ(۴)

۱۹۸۲

فراق :- رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری۔ انتقال ۱۹۸۲ء قطعہ تاریخ قمر سنبھلی:۔

جوش کا غم ہی کم نہ تھا آہ اٹھا فراق بھی اہل سخن تڑپ اٹھے، سوگ فضا پہ چھا گیا
سال وفات کے لئے فکر، قمر جو آج کی آئی صدا یہ دفعتاً: "فخر غزل چلا گیا(۵)

۱۹۸۲ء

جوش و فراق :- شاعر انقلاب شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی کی ولادت ۵ر دسمبر ۱۸۹۸ء

(۱) حوالہ محرر بور ص ۲۶ (۲ و ۳) ماہنامہ معارف اعظم گڑھ ماہ اکتوبر ۱۹۸۲ء ص ۳۰۳ (۴) سہ ماہی ص ۴۷ (۵) مکتوب قمر سنبھلی مورخہ ۱۹ر جنوری ۱۹۹۱ء

اور وفات ۲۲؍ فروری ۱۹۸۲ء کو ہوئی نیز شاعر جمال رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری ۲۸؍ اگست ۱۸۹۶ء کو پیدا ہوئے اور ۳؍ مارچ ۱۹۸۲ء کو انتقال کیا۔ گویا دونوں کا انتقال دس دن آگے پیچھے ہوا۔ ڈاکٹر طلحہ رضوی برق نے صنعت اتفاقی میں دونوں کا بہترین تاریخی مرثیہ کہا:۔

تاریک کیوں ہے محفل ارباب علم و فن — یہ کیا ہوا کہ اہل قلم چشم نم ہوئے
کیسی ہوا چلی کہ لگی بجھنے شمع دل — قلب و جگر سے پار کئی تیر غم ہوئے
اردو! ترا نصیب کہ بیٹوں کے سر ترے — تیغ اجل سے یونہی برابر قلم ہوئے
گردش ہے روز و شب کی مگر ضامن حیات — بے جان شام، صبح کو پھر تازہ دم ہوئے
آنے نہ دیں گے ہم تری مقبولیت میں فرق — اس راہ میں اگرچہ بہت پیچ و خم ہوئے
یہ شاعر و ادیب ترے جاں نثار ہیں — ان سے ہی تیری شان کے اونچے علم ہوئے
وہ جوشؔ، انقلاب کا شاعر وہ ذی وقار — انداز جس کے رشک شہان عجم ہوئے
رومان و کیف عشق میں ڈوبا ہوا فراقؔ — جس پر شباب و شوق کے صد ہا ستم ہوئے
آنچل میں تیرے ٹانک کے دُرہائے شاہوار — موج فنائے ہستی عالم میں ضم ہوئے
دس روز آگے پیچھے ہوا دونوں کا وصال — بچھڑے ہوئے تھے کب کے وہ آخر بہم ہوئے[1]

مصرع سے برقؔ مل گئی تاریخ کی "کلید"
"جوشؔ اور فراقؔ راہی ملک عدم ہوئے[2]"

۶۴+۱۳۳۸=۱۴۰۲ھ

شمیم امروہوی نے بھی دونوں شاعروں کا سال وفات ایک ہی قطعہ میں بر آمد کیا۔ جس کا پہلا اور آخری شعر درج ہے:۔

جلوۂ یک رنگ تھا چہرۂ جوشؔ و فراقؔ — اس کا ادھر بانکپن، اس کا ادھر طمطراق

مصرع تاریخ مرگ دونوں کا واحد ہوا
"جوشؔ کے دسویں کے دن یوم فراق الفراق[3]

۱۴۰۲ھ

(۱) اشارہ ہے جوشؔ کے پاکستان منتقل ہونے کی طرف۔ (۲) ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی اپریل ۱۹۸۲ء ص ۱۱ (۳) نفس سوہاسی ص ۹۱ و ۹۲

فیض:۔ فیض احمد فیض کا ارتحال ۱۹۸۴ء میں ہوا۔ محترم ڈاکٹر مغیث الدین فریدی صاحب نے، جن کو فن تاریخ گوئی پر درجۂ کمال حاصل ہے، اور اس فن پر شاید ہی کسی کے پاس اتنا لٹریچر موجود ہو جتنا فریدی صاحب کے پاس ہے، یہ قطعہ کہا جس کا عنوان بھی تاریخی ہے:۔ "سانحۂ طبع فیض احمد فیض" (۱۹۸۴ء)

دست اجل سے اور بھی کج ہو گئی تیری کلاہ　　　　تو نے غرور عشق کو بخشا کچھ ایسا بانکپن

خوشبو ترے اشعار کی "دستِ صبا[1]" میں بس گئی

تاریخ بن کر رہ گیا "لطفِ غزل حسن سخن[2]"

۱۹۸۴ء

ساغر نظامی: وفات ۱۹۸۴ء۔ قطعہ تاریخ از قمر سنبھلی، جو صنعت مرموز میں بہترین تاریخ ہے:۔

ہوا میخانۂ غزل سونا　　　　ایک رند سخن کے سونے سے

چھن گئی ہے "مئے ادب" افسوس

آج "ساغر شکست" ہونے سے[3]

۱۹۸۴ء

مالک رام اور ساحر ہوشیار پوری:۔ شہرۂ آفاق محقق جناب مالک رام صاحب کا انتقال ۱۹۹۳ء میں ہوا اور ساحر ہوشیار پوری ۱۹۹۴ء میں اس جہاں سے رخصت ہوئے۔ دونوں کی وفات کا قطعہ جناب کالیداس گپتا رضا نے لکھا اور بڑی خوبی سے دونوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ہنرمندی کے ساتھ سنین بر آمد کئے:۔

برس پہلے مالک ملے رام میں[4]　　　　اٹھے آج ساحر بھی اس شہر سے[5]

۱۹۹۳ء

بڑھا "صدمہ" اور یہ ہوا سال مرگ　　　　"فصاحت شعاری اٹھی دہر سے[6]"

۱۳۹　　　　۱۹۹۴ء (۲ر اگست)

(۱) مجموعہ کلام فیض کا نام (۲) گرامی نامہ بنام راقم مورخہ ۲۱ ستمبر ۱۹۹۶ء (۳) مکتوب قمر بنام راقم سطور مورخہ ۱۹ جنوری ۱۹۹۱ء (۴) برس پہلے یعنی (۱۹۹۴-۱ برس) = ۱۹۹۳ء (۱۶ر اپریل) (۵) دہلی (فرید آباد) (۶) الطاف نامہ بنام فرودایہ مورخہ ۲۴ر جنوری ۱۹۹۵ء

خواجہ احمد فاروقی:۔ خواجہ صاحب کے سانحہ ارتحال (۱۹۹۵ء) پر بزرگ محترم ڈاکٹر مغیث الدین فریدی صاحب نے اقبال کے ایک مصرعہ کو مادہ بناتے ہوئے درج ذیل تاریخی مرثیہ کہا جس کا عنوان ہے "رحلت عالی مقام خواجہ احمد فاروقی" (۱۹۹۵ء):۔

جو اردو کی ترقی کے لئے خود کو فنا کردے　کہاں ہوتا ہے اس انداز کا آشفتہ سر پیدا
بدل دی تیرے "ذوق و جستجو" نے قسمت اردو　اندھیرے میں کیا تونے چراغ رہ گزر پیدا
شجر اردو کا بے برگ و ثمر ہونے ہی والا تھا　تری محنت سے لیکن ہوگئے برگ و ثمر پیدا
تری ہمت پہ صادق آگیا اقبال کا مصرع　"صبا کرتی ہے بوئے گل سے اپنا ہمسفر پیدا[1]"
تری رحلت سے لوتھرا گئی ہے شمع اردو کی　یہ ممکن ہی نہیں تجھ سا ہو اب صاحب نظر پیدا

ملی ہے "ایزدی تائید سے" تاریخ رحلت کی
"بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا[2]"

۴۵۷+۱۵۳۸=۱۹۹۵ء

ڈاکٹر رخ زماں انصاری: انتقال ۵ مارچ (ہولی) ۱۹۹۶ء تاریخی قطعہ رضا صاحب نے کہا:۔

اٹھ گیا بولتا چہکتا ہوا　ڈاکٹر رخ زمان انصاری
چل دیا خود، اور اس کے گھر والے　رہ گئے وقف نالہ وزاری
آہ ناہید[3] کا حبیب لبیب　اب کرے کون اس کی دلداری
ڈوبتا جارہا ہے دل میرا　بچیوں[4] پر ہے رقت اب طاری
چاہتا تھا لکھوں میں سال وفات　کیسے لکھتا کہ اشک تھے جاری
اتنے میں غیب کے فرشتے نے　دے دیا جیسے حکم سرکاری

لکھ دے "اندوہ، دکھ، الم کے ساتھ
"فرقت رخ زمان انصاری[5]"

۱۶۶+۱۸۳۰=۱۹۹۶ء

خدا اردو زبان کے ان شیدائیوں پر رحمت فرمائے۔ (جاری)

---

(۱) پہلا مصرع ہے: ربود آں ترک شیرازی دل تبریز و کابل را (اقبال، بانگ درا، طلوع اسلام) (۲) ہفت روزہ "ہماری زبان" نئی دہلی، یکم تا ۷، ۸ نومبر ۱۹۹۶ء ص ۲، مصرع اولیٰ: ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے، اقبال بانگ درا، طلوع اسلام۔
(۳) بیگم انصاری (۴) دو بیٹیاں (۵) مکتوب گرامی مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۹۷ء۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور مسلم جانبازانِ حریت

قسط: ۳

ڈاکٹر مختار احمد مکی ریڈر و صدر شعبۂ سیاسیات کریم سٹی کالج جمشید پور، بہار

علی گڑھ کی فضا میں مکمل سکوت تھا۔ ۲۰/ مئی ۱۸۵۷ء کو بلند شہر سے ایک برہمن کو گرفتار کر کے دیسی سپاہیوں کے سامنے پھانسی دی گئی، الزام یہ تھا کہ اس نے سپاہیوں کو ورغلایا اور اکسایا ہے کہ باہر سے برات آئے گی، تمام لوگ شامل ہو کر انگریز افسران کو مار ڈالنا۔ انگریزوں کو علیگڑھ کی ۹ نمبر پیادہ رجمنٹ پر بہت بھروسہ تھا۔ لیکن اس برہمن کی موت کے ساتھ ہی ان فوجیوں میں اشتعال پیدا ہوا اور انگریز افسر علی گڑھ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ہندوستانی فوجیوں نے جیل خانہ توڑ کر قیدیوں کو چھڑا لیا اور دہلی کی جانب کوچ کر گئے، انگریزوں سے علی گڑھ خالی ہونے کے بعد زمام قیادت مولانا عبدالجلیل امام جامع مسجد علی گڑھ کے ہاتھ میں آئی۔ اگست ۱۸۵۷ء میں تازہ دم انگریز افواج آگرہ کی جانب سے علی گڑھ پر حملہ آور ہوئیں تو ۵ ہزار مجاہدین کے ساتھ مولانا عبدالجلیل مقابلہ پر ڈٹ گئے اس لڑائی میں مولانا سمیت ۲۷ مجاہدین شہید ہوئے، ان کو جامع مسجد علی گڑھ کے شمالی صحن گنج شہیدان میں دفن کیا گیا۔ موتی مسجد کے سامنے پھول چوراہہ اور عبدالکریم چوراہا پر پھانسی کا رسہ لٹکتا رہتا تھا اور جس پر بھی انگریز مخالف ہونے کا شبہ ہوتا اس کے خاندان کے تمام افراد کو پھانسی دے دی جاتی۔ تین سال تک برابر یہ سلسلہ جاری رہا۔

شاہجہاں پور میں میرٹھ کی بغاوت کی خبریں ۱۵/ مئی کو پہونچیں، ۲۸ ویں رجمنٹ کو شہر کے انتظام کی ذمہ داری سونپی گئی، ۲۵/ مئی کو عین عید کے دن اسپیشل گارڈ اور سنتری ڈبل کرنے کا حکم دیا گیا۔ سپاہیوں نے اسے بے اعتقادی اور بے عزتی پر محمول کیا اور بددل ہو گئے ۳۱ مئی کو جب کچھ انگریز ایک گھر میں جمع تھے تو انقلابیوں نے تلوار سے ان پر حملہ کر دیا چھاؤنی میں بھی بغاوت پھیل گئی، چند انگریزوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور [illegible] اپنی جان بچانے کے

لئے دوسری جانب نکل گئے۔ نواب غلام قادر خان ناظم مقرر ہوئے ایک سال تک بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ انہوں نے حکومت کا کام انجام دیا مورچہ کی کمان احمد اللہ شاہ کے تجربہ کار ہاتھوں میں تھی، انگریزی افواج کو بار بار ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور اکتوبر ۱۸۵۸ء کے بعد ہی وہاں پر انگریزوں کا قبضہ ہو سکا۔

۱۸۵۷ء کی تحریک جدوجہد آزادی خاصی بڑی تھی اور ہندوستانی عوام نے اس کے لئے جانی ومالی قربانیاں دی تھیں، اس کے باوجود یہ تحریک ناکام رہی اس ناکامی کی وجہ کمزور فوجی طاقت کا ہونا تھا۔ ان کے پاس جدید اسلحہ، سامان جنگ، اور تربیت کی کمی تھی، اور کچھ لوگ در پردہ انگریزوں سے ساز باز کر چکے تھے۔ مسلمانوں کا مذہبی طبقہ جو اس تحریک میں پیش پیش تھا ان کی تعداد ہندوستان کی کل آبادی کے تناسب میں کافی کم تھی۔ خاندان تیموریہ، لاپرواہ اکڑ مزاج ہو گیا تھا۔ بادشاہ مذہبی عقائد میں بہت ڈھیلا اوہام پرست، آرام طلب اور سادہ لوح تھا اور ایک وظیفہ خور رئیس کی صورت میں اپنی زندگی بسر کر رہا تھا، یہی وجہ ہے کہ اس کے دربار میں رجب علی، الٰہی بخش، اور حکیم احسان اللہ خاں جیسے غداران وطن پل رہے تھے، لیکن وہ کچھ کر پانے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ مغل شاہزادوں نے کبھی جنگ وجدل خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ مزید یہ کہ وہ آپسی رنجش اور محلاتی سازش کے شکار تھے، صاحب اقتدار نواب راجہ امراء و شرفاء اور مقامی زمینداروں کی ایک بڑی تعداد اس جدوجہد، آزادی کی حامی نہیں تھی اور اس تحریک کے دوران شرمناک کردار ادا کیا اور انگریزوں کی دولت، افواج اور جاسوسی سے مدد کی۔ ہندو گرچہ اس تحریک میں شامل تھے لیکن انہوں نے کافی دیر اور انتہائی بے دلی اور بے رغبتی کے ساتھ بہت کم تعداد میں شرکت کی۔ اور ان کی ایک بڑی تعداد غیر جانبدار رہی۔ سندھیہ، مرہٹہ، سکھ، اور گورکھے، انگریزوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ پنجاب کی سکھ ریاستیں پٹیالہ، نابھہ، راجپوتانہ، اور وسط ہند کی ریاستیں بیکانیر، جے پور، جودھ پور، اور بھوپال وغیرہ بھی تحریک کی مخالف تھیں اور نہ صرف انگریزوں کا ساتھ دے رہی تھیں بلکہ ان سے مل کر شرمناک سازشوں میں بھی مصروف تھیں اس طرح اکثر دیشی ریاستوں نے انقلابیوں کا ساتھ نہیں دیا، عام ۱۸۵۷ء کی اس تحریک سے الگ رہے کیونکہ ان کے درمیان انگریزوں کے خلاف [illegible] کر لی

پروپیگنڈہ نہیں ہوا تھا یہی وجہ ہے کہ پشاور میں تقریباً ۲۰۰ فوجیوں کو سخت ترین سزائیں دی گئیں لیکن عام عوام پر کوئی رد عمل نہیں ہوا۔ عوامی سطح پر یہ قومی تحریک بھی نہیں بن پائی کیونکہ واضح مقصد کا فقدان تھا۔ ذرائع نقل و حمل اور سلسلہ خبر رساں پر انگریزوں کا مکمل کنٹرول تھا۔ مزید یہ کہ اس تحریک سے تقریباً ۲۱ چھاؤنیاں متاثر تھیں اس کے باوجود یہ بکھری ہوئی تھیں۔ اور ان میں باہم شیرازہ بندی بھی نہیں تھی اور نہ ہی مرکز سے اتصال تھا۔ باغیوں کی رہنمائی کے لئے جو بھی مرکزی قیادت تھی وہ نظم وضبط اور تدبیر کی کمی کا شکار تھی، اس پوری جدوجہد میں ہوش کی بہ نسبت جوش کی کارفرمائی زیادہ تھی۔ انگریزوں کے خلاف متحدہ محاذ بھی کمزور پڑتا گیا۔ ہندوستانی افواج کے سربراہ اور محرک قائدین یکے بعد دیگرے جنگ میں کام آتے چلے گئے۔ جبکہ انگریزوں کی تازہ دم اور تربیت یافتہ فوجیں برابر پہونچ رہی تھیں، اس طرح جنگ آزادی کی تمام کوششیں تتر بتر اور غتر بود ہو کر رہ گئیں۔

مزاحمتی تحریک کے کمزور پڑنے پر انگریزوں نے ہندوستانیوں سے اس کا بھرپور انتقام لینا شروع کیا، حالانکہ مذہبی سیاسی اور اقتصادی استحصال کا ہی یہ نتیجہ تھا اور بقول لیکی اگر دنیا میں کوئی بغاوت حق بجانب کہی جاسکتی ہے تو وہ ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں کی یہ بغاوت تھی لیکن انگریز یہاں کے لوگوں کو بخوبی ذہن نشین کرادینا چاہتے تھے کہ اس نیم وحشی ملک میں وقار قائم رکھنے کا ایک ہی طریقہ غیر مشروط اور غیر مبہم وفاداری ہے تاکہ حاکم کا رعب ودبدبہ ہمیشہ باقی رہے اور انتقام کا تصور بھی فریق مخالف کو لرزہ براندام کردے۔ آکسفورڈ تاریخ ہند کے مطابق یہ بغاوت اپنے پیچھے بے شمار خوفناک حوادث، بے انتہا مصائب اور متعدد ایسے مکروہ اور رنجیدہ واقعات چھوڑ گئی ہے کہ ان کے ذکر سے بھی قلب کو صدمہ پہونچتا ہے۔[۲۴] بقول ایڈورڈ ٹامسن غدر سے متعلق تقریباً تمام دستاویزات زبان حال سے ہماری زیادتیوں کا اعلان کرتی ہیں۔ ارنسٹ جونسن کا خیال ہے کہ "برطانیہ نے ہندوستان میں موت کا اس قدر لرزہ خیز ڈھنگ ایجاد کیا جس کے تصور سے ہی انسانیت کانپ اٹھتی ہے" برطانوی پارلیامنٹ کے ایک ممبر لے بارڈ نے ہندوستانیوں کے ذریعہ انگریزوں کے اوپر جس ظلم وستم کی رنگ آمیزی کے ساتھ تشہیر کی گئی تھی اس کی تردید کرتے ہوئے بیان دیا کہ پورے غور و تحقیق اور [illegible]

فراہم کرنے کے بعد مجھے مکمل یقین ہے کہ دہلی، کانپور اور جھانسی وغیرہ میں انگریزوں پر مظالم کی تمام داستانیں فرضی ہیں۔ جن کے پڑھنے والوں کو شرم آنی چاہئے۔"[۲۵]

دہلی میں قائم فوج اپنے چار ہزار سپاہیوں کی قربانی کے بعد ہی ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو داخل ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ظلم وزیادتی کا دور دورہ شروع ہوا ایسے تمام لوگ جو چلتے پھرتے نظر آئے سنگینوں سے وہیں ختم کردئے گئے کابلی دروازہ سے قلعہ تک اور جامع مسجد سے دہلی دروازہ تک جو تقریبا چار پانچ مربعہ میل میں پھیلے ہوئے امراء وشرفاء کے ہزاروں مکانات اور خوبصورت مسجدیں تھیں انہیں منہدم اور مسمار کرکے چٹیل میدان بنادیا گیا۔ جامع مسجد کی زبردست بے حرمتی کی گئی اور اسے انگریز اور سکھ فوجوں کے لئے بیرک بنادیا گیا۔ مینار کے پاس سور ذبح کئے جاتے اور پکائے جاتے اسے ڈھانے اور گرجا بنانے کا پروگرام تھا۔ لیکن جان لارنس کی تنہا کوشش کے نتیجہ میں یہ ناپاک عزائم پورے نہیں ہوسکے۔ لندن ٹائمز کے رپورٹر کے مطابق دہلی کے مردوں نے اپنی عورتوں کی عزت وآبرو کے خاطر انہیں قتل کرکے خودکشی کرلی۔[۲۶] بقول باس باغیوں کے جرم کے مقابلہ میں ہزار ہا گنا زیادہ سنگین پاداش باشندگان دہلی کو برداشت کرنی پڑی۔ ہزارہا مردو عورتوں اور بچوں کو بے گناہ ٹھکانا و برباد جنگلوں اور ویرانوں کی خاک چھاننی پڑی۔ استروانی کے مطابق نادر شاہی لوٹ مار اور قتل عام کو بھی ان واقعات نے بھلادیا جب نو گھنٹہ کے بعد محمد شاہ کی درخواست پر نادر شاہ نے اسے رکوادیا تھا اور یہ اسی وقت بند بھی ہوگیا تھا جب کہ فتح دہلی کے بعد انگریزوں نے قتل عام کی منادی کرادی اور سات دنوں تک دلی جلتی اور لٹتی رہی۔ تین ہزار لوگوں کو نام نہاد عدالت کے ذریعہ پھانسی دے دی گئی اور تقریباً ۲۷ ہزار مسلمانوں کو دہلی میں قتل کیا گیا۔[۲۷] لارڈ النفسٹن نے اپنے ایک خط میں لارنس کو لکھا ہے کہ محاصرہ ختم ہونے کے بعد ہماری افواج نے جو ظلم کیے انہیں سن کر دل پھٹنے لگتا ہے۔ دوست دشمن کی تمیز کیے بغیر سب سے یکساں بدلہ لیا گیا۔[۲۸] برطانیہ کے ایک مشہور مقرر ایڈمنڈ برک نے ہیسٹنگز کے ظلم وستم کی سخت ترین مذمت کرتے ہوئے چار دن تک پارلیامنٹ میں تقریر کی اور اسے سارق، ظالم، غارت گر، فریبی، جعل ساز، ٹھگ، بے ایمانوں کا سردار، دوزخ کا مجسمہ جیسے القاب سے نوازا۔ اس کے باوجود اسے افسوس رہا کہ اس کے جرائم کی پوری

طرح تشریح کرنے والے اصطلاحات کی انگریزی زبان میں کی ہے۔(۲۹)

دہلی میں داخل ہونے والی انگریزوں کی فاتح افواج نے آس پاس کے دیہاتوں کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ مسلمانوں کی بڑی تعداد کو شہر سے نکال دیا گیا اور شہر میں داخلہ پر پابندی عائد کر دی گئی، شہر سے باہر جانے والوں کو گوجروں اور میواتیوں نے بری طرح لوٹا اور مارا، سینکڑوں بچے اور بوڑھے بھوک و پیاس سے مر گئے۔ ہزارہا عورتوں نے کنوؤں میں ڈوب کر اپنی عصمت کی حفاظت کی، بہادر شاہ کے نوجوان بیٹوں کو قتل کروا دیا گیا۔ خاندان مغلیہ کے تمام مرد مروا دیئے گئے تاکہ تخت کا کوئی دعویدار نہ ہو۔ بیٹے کا سر کاٹ کر بادشاہ کو پیش کیا گیا کہ یہ آپ کی نذر ہے جو بند ہو گئی تھی، اور جس کو جاری کرانے کی خاطر آپ بغاوت میں شریک ہوئے تھے۔(۳۰) بقول ہنری کوئن مسلم قیدیوں کی مشکیں باندھ کر برہنہ ان کو زمین پر لٹا دیا جاتا اور سر سے پاؤں تک تمام جسم کو گرم تانبے سے داغا جاتا۔ ان بد نصیب قیدیوں کے جلتے ہوئے گوشت کی مکروہ بدبو آس پاس کی فضا کو مسموم بناتی، سکھ اور یورپین نہایت وحشیانہ مسرت کے ساتھ اطمینان سے چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر اس تفریح سے لطف اندوز ہوتے، زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں سی کر یا پھانسی سے پہلے ان کے جسم پر سور کی چربی مل کر پھانسی دی جاتی تھی یا انہیں زندہ جلایا جاتا تھا۔ اور ان کی چیخ پکار سے سکھ اور انگریز لطف اندوز ہوتے، بعض قیدیوں کو مجبور کیا جاتا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بد فعلیاں کریں، یا قیدیوں کو دائمی نجات کے لئے فی الفور نکلسن کا نعرہ (A La Lantaineo) یعنی پھانسی پر لے چلو، بلند کیا جاتا ان کے سروں سے بالوں کے گچھے کے گچھے نوچے جاتے ان کے جسموں کو سنگینوں سے چھیدا جاتا، ٹائمس اوف انڈیا نے اسے جنگی یا وحشی انصاف کا نام دیا جبکہ اوٹرام (Outram) کے مطابق یہ معصوم انسانوں کا سنگدلانہ قتل عام تھا۔ اکثر فرنگی جوان محض تفریحاً اپنے ہی وفادار ملازموں اور وفادار ہندوستانی آدمیوں اور گھسیاروں کو گولی سے اڑا دیتے۔(۳۱) بقول سرسید کوئی آفت ایسی نہیں ہے جو اس زمانہ میں نہ ہوئی ہو اور یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے کی۔ گو وہ رام دین یا ماتا دین ہی نے کی ہو کوئی بلا آسمان پر سے نہیں چلی جس نے زمین پر پہونچنے سے پہلے مسلمانوں کا گھر نہ ڈھونڈا ہو۔(۳۲) ملکہ وکٹوریہ کی عام معافی یکم نومبر ۱۸۵۸ء یعنی ساڑھے تیرہ ماہ تک یہ صورت حال باقی رہی اور بقول بہادر شاہ ظفر۔

"جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابل دار ہے۔"

انگریزوں کے ذریعہ لکھنو پر قبضہ کرنے کے بعد قتل وغارت گری کا بازار گرم ہوا۔ چنانچہ ہر ہندوستانی خواہ وہ سپاہی ہو یا اودھ کا دیہاتی بیدریغ تہہ تیغ کیا جانے لگا۔ نہ تو ان سے کوئی سوال ہی کیا جاتا اور نہ ہی کوئی تکلف روا رکھا جاتا محض سیاہ رنگت ہی اس کے مجرم ہونے کی دلیل تھی، ہلاکت کے لئے ایک رسہ اور درخت کی شاخ ہی کافی تھی، کچھ لوگوں کو پھانسی دی جارہی ہوتی اور باقی قیدی وہیں کھڑے اپنی باری کے منتظر ہوتے۔ روڑکی سے متصل سنہرا گاؤں کے قریب برگد کا وہ درخت آج بھی موجود ہے جس کی شاخوں میں رسیوں کے پھندے ڈال کر ڈھائی سو باغیوں کو پھانسی دی گئی تھی۔ ۱۹۵۷ء میں جب بغاوت کی صد سالہ تقریبات منائی گئی تو شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے اسی برگد کے سایہ کو منتخب کیا گیا۔ میجر ریناڈ کو جنرل میل کی جانب سے یہ حکمنامہ موصول ہوا تھا کہ کانپور کے بعض دیہاتوں کو ان کی مجرمانہ حرکات کی بنیاد پر عام تباہی کے لئے منتخب کیا جائے اور وہاں کے تمام مردوں کو قتل کرنے کے بعد گھروں کو آگ لگادی جائے، باغی رجمنٹ کے تمام سپاہی فی الفور پھانسی پر لٹکادئے جائیں مراد آباد میں نواب محمد خان کو پہلے گولی کا نشانہ بنایا گیا اس کے بعد شہر میں ہاتھی کے پاؤں سے باندھ کر گھسیٹا گیا اور پکتے ہوئے چونے میں ان کی نعش ڈال دی گئی۔[۳۳] قصبہ فتح پور کی تمام آبادی کو محاصرہ میں لیکر تہہ تیغ کیا گیا۔ جہاں جہاں باغیوں نے پڑاؤ کیا تھا ان ضلعوں کو تاخت وتاراج کیا گیا سڑک کی دونوں جانب دیہاتوں کو لوٹا اور جلایا گیا اور لوگوں کو بیدریغ قتل وغارت کیا گیا۔ یہاں تک کہ کچھ انگریز افسروں نے احتجاج کیا کہ اگر یوں ہی دیہاتوں کو لوٹا اور جلایا جاتا رہا تو فوج کو راستہ میں رسد اور چارہ بالکل دستیاب نہیں ہوسکے گا اور یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے تھا کہ بقول لارڈ ابرٹسن "ان بدمعاش مسلمانوں کو بتادیا جائے کہ خدا کے حکم سے صرف انگریز ہی ہندوستان پر حکومت کرینگے"۔[۳۴]

امرتسر کے ڈپٹی کمشنر فریڈرک کوپر نے اپنی کتاب میں ایک دلخراش واقعہ کا تذکرہ کیا ہے جس کی بنیاد پر اسے پنجاب کے لفٹنٹ گورنر لارنس اور بعد میں منٹگو میری کی شاباشی حاصل ہوئی اور اسے ایک عمدہ کارنامہ قرار دیا گیا کوپر ہی کے لفظوں میں "حفاظتی تدابیر کے تحت

۱۳ رمئی کے دن تین ہزار آٹھ سو (۳۸۰۰) سپاہیوں سے لاہور میں ان کے ہتھیار لے لئے گئے اور تقریباً تین ماہ تک چار سو گورے اور سکھ سپاہی رات دن ان کی نقل و حرکت کی نگرانی کرتے رہے۔ ۳۰ رجولائی کو جب نہایت تیز آندھی چل رہی تھی اور وہ لوگ بھوکے پیاسے بھی تھے تو ان پر گھبراہٹ طاری ہوئی ایک مذہبی دیوانہ سپاہی پرکاش سنگھ نے ایک تلوار سے اپنے کمانڈر افسر میجر اسپنسر کو قتل کر دیا اور آندھی طوفان کے درمیان وہ لوگ وہاں سے بھاگ نکلے، جو لوگ باقی رہ گئے انہیں چھاؤنی کے اندر ہی سکھوں اور گوروں کی توپ نے خاموش کر دیا۔ پکڑے گئے لوگوں میں ۲۴ گھنٹہ کے اندر ہی ۵۰۰ فوجیوں کو پھانسی دے دی گئی مفرورین کے بقیہ لوگوں نے دوسرے دن دریائے راوی کو عبور کرنے کی کوشش کی لیکن دوسرے کنارے پولیس کی موجودگی کے باعث وہ ایسا نہیں کر سکے، ڈیڑھ سو لوگوں کو وہیں گولی سے بھون دیا گیا اور کثیر کو دوبارہ دریا عبور کرنے پر مجبور کیا گیا۔ بیشتر دریا میں ڈوب کر ہلاک ہوئے اور ان کا دریا کے اندر ہی شکار کیا گیا ایک بڑی تعداد دریا کے اوپر کی جانب بھاگ گئی اور وہاں سے ایک میل دور جا کر تیر کر ایک جزیرہ میں پہونچ گئی دور سے وہ لوگ جنگلی مرغیوں کی طرح سہمے سہمے نظر آرہے تھے۔ ان میں سے ۲۸۲ بھگورے فوجیوں نے بڑی آسانی سے گرفتاری دے دی، انہیں یقین دلایا گیا کہ ان کے خلاف مقدمہ چلایا جائے گا اور انہیں انصاف ملے گا ان لوگوں کو گرفتار کر کے کوتوالی لایا گیا اور ایک برج میں بند کر دیا گیا۔ ۳۰ راگست کو بقر عید کا تہوار تھا اس وجہ سے تمام مسلمان فوجیوں کو چھٹی دیکر امرتسر روانہ کر دیا گیا۔ ایک عیسائی افسر اور وفادار سکھوں کی امداد سے ایک مختلف قسم کی قربانی کے لئے یہ قیدی رہ گئے۔ درختوں کی کمی کی وجہ سے پھانسی کی سزا موقوف کر دی گئی اور قیدیوں کو دس دس ٹولیوں میں ان کے بازوؤں کو پیچھے کی جانب باندھ کر میدان میں لایا جاتا اور انہیں گولیوں سے اڑا دیا جاتا۔ جب ڈیڑھ سو باغی اسی طرح قتل کر دئے گئے تو ایک بوڑھا سکھ سپاہی تکان سے غش کھا کر گر پڑا اس لئے آرام کے لئے تھوڑا سا وقفہ دیا گیا اور قتل کی کاروائی دوبارہ شروع کی گئی۔ جب ان کی تعداد ۲۳۷ تک پہونچ گئی تو ایک افسر نے اطلاع دی کہ باقی باغی برج سے باہر نکل رہے ہیں۔ مین برج کے دروازے کھولے گئے تو ہول ویل (Hole Wells) کا بلیک ہول (Black Hole) کی تلخ یادیں دوبارہ تازہ ہو گئیں۔ [illegible] کی

لاش باہر نکلیں جو کہ خوف، بھوک و پیاس، گرمی، سفر کی صعوبتوں اور دم گھٹنے سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ہلاک ہو گئے تھے۔ ان تمام لاشوں کو ایک ویران کنواں میں پھنکوادیا گیا۔ ایک بیمار سپاہی کو جو میدان تک نہیں پہونچ سکتا تھا وعدہ معاف گواہ بنایا گیا اور اس کی نشاندہی پر ۴۱ باغیوں کو مزید دیہاتوں سے تلاش کروا کر لاہور بھیجا گیا تاکہ دوسرے فوجیوں کے سامنے اسے توپ سے باندھ کر اڑا دیا جاسکے۔ (۳۵) کوپر نے اپنی اس سنگدلی کو حق بجانب قرار دیتے ہوئے انگریزی حکومت کے قیام واستحکام کے لئے ضروری قرار دیا کہ اس طرح ۲۶ ویں رجمنٹ کو واقعی سزا دی گئی تاکہ دوسرے رجمنٹ کے فوجی عبرت حاصل کریں اور اجنالہ (امرتسر) کا کنواں بھی شہرت کا باعث ہے۔ (۳۶)

لفٹنٹ رابرٹس نے برطانیہ میں مقیم اپنی ماں کے نام ایک خط میں تحریر کیا ہے کہ "ہم لوگ پشاور سے جہلم پاپیادہ سفر کرتے ہوئے پہونچے اور راستہ میں کچھ کام بھی کرتے آئے یعنی باغیوں سے اسلحہ چھیننا اور انہیں پھانسیوں پر لٹکا دینا۔ توپ سے اڑا دینے کا جو طریقہ ہم نے ان پر استعمال کیا اس سے ہماری ہیبت لوگوں کے دلوں میں بیٹھ گئی۔ فوجی عدالت کے حکم سے فی الفور باغیوں کے سر قلم کردئے جاتے ہیں اور یہی پالیسی اس وقت تمام چھاؤنیوں میں عمل میں لائی جارہی ہے۔" (۳۷)

اس تحریک کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے ہندوستانیوں خاص طور پر مسلمانوں کو اس کے لئے سخت ترین سزائیں دیں کیونکہ وہی اپنی تعداد کے تناسب کے مقابلہ میں اس جنگ میں پیش پیش تھے۔ بقول منشی ذکاء اللہ، ایک انگریز افسر کا یہی دستور تھا کہ وہ ہر مسلمان کو باغی سمجھتا اور لوگوں سے پوچھتا کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان اور جواب میں مسلمان سنتے ہی گولی ماردیتا۔ (۳۸) ایک انگریز مصنف ہنری منڈ کے لفظوں میں گرچہ اس بغاوت کا آغاز سپاہیوں سے ہوا تھا لیکن در اصل اسلامی بغاوت تھی۔ (۳۹) اس طرح مسلمان باغی کے مترادف قرار دئے گئے خاندان کے خاندان قتل کروادئے گئے۔ محلّے کے محلّے ویران کرکے چٹیل میدان بنادئے گئے ان کی مسجدوں، مقبروں، اور مزاروں کو بھی نہیں بخشا گیا۔ تین ہزار سے زائد تعداد کو جلاوطن کرکے دریائے شور یعنی کالاپانی کی سزا سنائی گئی۔ لاکھوں لوگوں کو سرسری سماعت کے بعد پھانسی دے دی گئی۔

تقریباً ۵ لاکھ اس ہنگامہ کی نذر ہوئے۔ ہندوستان کی سرزمین پر مسلمانوں کا جینا محال کردیا گیا۔ ان کی جائیدادیں ضبط کرلی گئیں یا برباد کردی گئیں، ان کی غیر منقولہ جائداد کا ۳۵ فیصد بطور تعزیری جرمانہ وصول کیا گیا جبکہ ہندوؤں سے صرف دس فیصد لیا جاتا۔ ان سے چلتی جنگ تک کا بدلہ لیا گیا ان کے اوقاف ضبط کرلئے گئے اور عزت کے ساتھ زندگی گذارنے کے تمام وسیلے ان سے چھین لئے گئے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات کی خلیج کو مزید وسیع کرنے کے لئے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی اپنائی گئی جس کے اثرات آج بھی ہمارے سماج میں موجود ہیں۔

(حواشی)

۲۳۔ احمد سجاد۔ شیخ بھکاری کے نام کا استحصال کب تک روزنامہ فاروقی تنظیم ص ۳۔ رانچی ۱۹ راگست ۹۵ء

۲۴۔ آکسفورڈ تاریخ ہند۔ (دہلی، ۱۹۶۰ء) ص ۷۲۳

۲۵۔ انگلینڈ ٹائمس ۲۵ راگست ۱۸۵۸ء حوالہ اقبال حسن خان۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن۔ (علی گڑھ ۱۹۷۰ء) ص ۴۵

۲۶۔ ایڈورارڈ ٹامسن ایضاً ص ۴۵

۲۷۔ سید کمال الدین حیدر۔ قیصر التواریخ افسانہ غم (دہلی ۱۸۹۶ء) ص ۲۸۔۲۹

۲۸۔ منشی ذکاء اللہ دہلوی۔ تاریخ ہند (دہلی، ۱۹۰۳ء) ص ۶۳۶

۲۹۔ مارلیش مین۔ انڈین ہسٹری ص ۱۰۳

۳۰۔ خواجہ حسن نظامی۔ دہلی کی جان کنی۔ طبع چہارم (دہلی ۱۹۶۴ء) ص ۶۱

۳۱۔ چیلین۔ دی سیج آف دہلی ص ۱۰۳

۳۲۔ الطاف حسین حالی۔ حیات جاوید۔ (نئی دہلی ۱۹۷۹ء) ص ۸۴۵

۳۳۔ محمود عباسی۔ تاریخ امروہہ۔ جلد اول (مراد آباد ۱۹۶۱ء) ص ۷۸

۳۴۔ ایڈورارڈ ٹامسن ایضاً ص ۴۴

۳۵۔ ایضاً ص ۵۱ تا ۵۷

۳۶۔ ایضاً ص ۵۸

۳۷۔ ایضاً ص ۴۴

۳۸۔ ابوالحسن علی ندوی۔ ہندوستانی مسلمان (لکھنؤ ۱۹۷۵ء) ص ۱۴۵

۳۹۔ منشی ذکاء اللہ۔ عروج سلطنت انگلشیہ جلد دوم ص ۱۱۷

ضلع میرٹھ کی اجمالی تاریخ

قاری محمد احمد انصاری ایم اے (مدرس جامعہ نور الاسلام میرٹھ)

گنگا و جمنا کے پلیٹو پر مشہور تاریخی شہر میرٹھ، اپنی ادبی، سیاسی اور سماجی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ معروف شہر مرکز ہند دہلی سے لگ بھگ ۶۸ کلو میٹر شمال مشرق میں واقع ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ مائی دت کا کھیڑہ ہے۔ اس کی بیٹی مندودری راجہ راون سے بیاہی تھی۔ پہلے یہ قلعہ تھا اور شہر ڈیکی تھا جو میرٹھ سے لگ بھگ ۲½ کلو میٹر مشرق میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اب یہ گاؤں شہر کی آبادی میں ضم ہو چکا ہے۔

ہندوؤں کی تاریخی کتاب، مہابھارت سے یہ علم ہوتا ہے سوریہ ونشی و چندر ونشی خانوادوں میں چندر ونشی خاندان کی چھبیس ویں (۲۶) پشت کے راجہ ہستی نے دریائے گنگا کے کنارے ہستناپور نامی ایک بڑا شہر بسایا تھا۔ جو آجکل اپنی تاریخی حیثیت کے ثبوت کی شکل میں موجود ہے۔ اس عہد کا صرف ایک جین مندر اور ایک کنواں ہے۔ موجودہ مندر اور دھرم شالائیں بعد کی تعمیرات ہیں۔ ہستناپور میں بھیشم پتامہ کی زیر نگرانی پانچ پانڈوؤں اور سو کوروؤں نے ایک ساتھ پرورش پائی تھی۔ اس دوران ان میں باہم دشمنی ہو گئی۔ پانڈوؤں کو ہستناپور چھوڑ کر برونات جس کو آج کل برناوہ (ضلع میرٹھ) یا برن موجودہ بلند شہر یا لکشاگر (ضلع الٰہ آباد) ان میں سے چاہے جو بھی ہو، جانا پڑا۔ مگر وہاں بھی دریودھن کے اغوا سے ان کو جلا کر مار ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن وہ وہاں سے صحیح سلامت نکل کر جنگلوں میں کچھ دن پریشان پھرتے رہے۔ انہیں دنوں دروپدی کا سوئمبر ہوا۔ یہ پانچوں پانڈوؤں جو آپس میں بھائی تھے وہاں جا نکلے، اور ارجن سے دروپدی کی شادی ہو گئی۔ جب کوروؤں کو ان کا حال معلوم ہوا تو تب باہمی صلح نامہ اس طرح قرار پایا کہ جمنا کا مغربی کنارے والا حصہ پانڈوؤں کو دیا جائے یہی وہ زمانہ ہے جب مائی دت کی مدد سے پانڈوؤں نے اندر پرست[1] (پرانی دہلی) کو آباد کیا۔ اور راج سو یگیہ کیا۔ ان حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ

---

[1] کتاب الاسفار المعروف بہ سفر نامہ ابن بطوطہ فصل نمبر ۱ بعنوان شہر دہلی اور اس کی فصیل ص ۲۲، ۲۳ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

میرٹھ دہلی سے پہلے آباد ہوا۔

مائی دت کی اعانت سے پانڈوؤں کا اندرپرست پر راج سو یگیہ دیکھ کر دریودھن حسد سے اور بھی جل گیا اور پانڈوؤں کو جوا کھیلنے کے لئے ہستنہ پور بلایا۔ پانڈو جوا ہار کر بارہ ۱۲ سال کے لئے بن چلے گئے اور آخری سال پوشیدہ رہ رہ کر راجہ براٹ کے یہاں نام اور کام بدل کر گزارا۔ جب تیرہ سال مکمل ہوئے تو پانڈوؤں نے سری کرشن کی معرفت اپنا راج طلب کیا تو دریودھن نے صاف انکار کر دیا۔ جس کا نتیجہ مہابھارت کی جنگ کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس جنگ میں تمام کورو مارے گئے۔ اور یدھیشٹر ہستناپور کا راجہ ہوا۔ یہ جنگ اب سے تقریباً پانچ ہزار برس پہلے کروچھیتر کے میدان میں ہوئی تھی۔

اسی خاندان میں ایک راجہ پریکشت نامی ہوا۔ جس نے پریکشت گڑھ میں ایک قلعہ بنایا۔ اس راجہ کے بعد یہ سلطنت کمزور ہو گئی۔ اور ہستناپور گنگا میں باڑھ آنے کی وجہ سے نیست و نابود ہو گیا، لگ بھگ چار ہزار برس تک ضلع میرٹھ کا زرخیز علاقہ بودھ اور ہندو راجاؤں کے قبضہ میں رہا۔ اس زمانے کے باقیات میں اب کچھ بھی موجود نہیں۔ ہستناپور کے راجاؤں کے زمانے میں گنگا کے کنارے پشپاوتی میں ایک عمدہ خوبصورت باغ تھا جس کو آج کل پوٹھ یا پوٹھا کہتے ہیں۔

گیارہویں صدی عیسوی میں ضلع میرٹھ کا کچھ حصہ برن (بلند شہر) کے راجہ ہردت رائے کے قبضہ میں تھا۔ جس نے قصبہ ہاپوڑ آباد کیا اور ایک قلعہ ہاپوڑ میں بنایا، اس کے بعد اس نے

بقیہ: حاشیہ صفحہ گذشتہ

سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی مختلف آبادیوں کا مجموعہ ہے۔ ۱۔ پرانے ہندوؤں کا شہر جس کا نام اندرپرست تھا۔ ۲۔ شہر سیری جو کہ دار الخلافہ کے نام سے مشہور تھا۔ اس میں غیاث الدین خلیفہ مستنصر العباسی کے پوتے قیام پذیر تھے، اور سلطان علاء الدین اور قطب الدین نے بھی اس آبادی کو اپنا مستقر بنایا۔ ۳۔ تغلق آباد اس کو غیاث الدین تغلق نے آباد کیا تھا۔ ۴ شہر جہاں پناہ اس میں سلطان محمد شاہ تغلق بادشاہ رہتا تھا۔ اسی طرح دہلی کے باہر مسعود آباد، و پالم گاؤں آبادیوں کے نام ملتے ہیں، پالم گاؤں آج تک پالم ہوائی اڈے کے نام سے مشہور ہے۔ بعدہ شاہ جہاں آباد جس کو شاہ جہاں بادشاہ نے آباد کیا تھا، لال قلعہ دہلی و شاہی جامع مسجد اس بادشاہ کی یادگار ہیں ان تمام آبادیوں کے مجموعے کا نام دہلی پڑا، جو کہ سیکولر ہندوستان کی عظمت کا نشان ہیں۔ آزادی کے بعد دہلی کی بڑھتی آبادی کے پیش نظر نئی دہلی و پرانی دہلی، زبانی طور پر تقسیم ہو گئی۔ نوئیڈا، اوکھلا گاؤں راج پتھ، کناٹ پیلس، وغیرہ آبادیاں نئی دہلی کے نام سے پکاری جاتی ہیں، باعتبار حلقہ و آبادی دہلی ترقی کر کے ایک صوبے کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے شاید دہلی کا پرانا قلعہ انگ پال کا تھا۔

میرٹھ فتح کیااور یہاں پر ایک بڑا مضبوط قلعہ تعمیر کرلیا۔

تاریخ فرشتہ سے معلوم ہوتا ہے کہ محمود غزنوی نے اپنے نویں حملہ کے وقت میرٹھ پر ۱۰۱۷ء میں حملہ کرکے ہردت رائے سے بہت سارو پیہ وصول کیا تھا۔ مورخین کی اس ذیل میں مختلف آرا ہیں۔اگرچہ ۴۰۹ھ ۱۰۱۹ء میں سلطان محمود غزنوی کے وزیر احمد میمندی نے یہاں ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کرائی تھی۔

بے شک مسلمانوں کے حملے کا تعلق قطب الدین ایبک ۱۱۹۳ء کے بعد سے ہے جس نے ۵۹۴ھ میں حضرت سید سالار مسعود غازیؒ عرف بالے میاں کی یاد میں ایک خانقاہ بنوائی۔ جو ہاپوڑ روڈ اور گڑھ روڈ کے بیچ واقع ہے۔ یہ جگہ نوچندی گراونڈ کے نام سے مشہور ہے۔ قطب الدین ایبک کے حملے کا تعلق رائے پتھورا المعروف بہ پرتھوی راج چوہان کی شکست کے بعد ہوا تھا۔ یہ محمد بن اسلام (شہاب الدین محمد غوری) کا غلام اور جنرل تھا۔ اس نے میرٹھ کے قلعہ پر جو اس وقت اپنی ظاہری بناوٹ، پختہ بنیاد، اور گہری خندق کی وجہ سے ہندوستان بھر میں مشہور تھا قبضہ کرلیا۔ آج بھی اس قلعہ کے باقیات و آثار موجود ہیں۔ میرٹھ کے عوام اس کو "کوٹ" کے نام سے جانتے ہیں۔ گڑھ مکتیشر کی ایک تاریخی مسجد کے کتبہ پر لکھا ہے۔ کہ یہ عمارت غیاث الدین بلبن نے ۱۲۸۳ء میں بنوائی۔ ۱۳۸۹ء میں میرٹھ کے اسی قلعہ میں محمد شاہ نے اپنے دشمن ابو بکر کو قید کیا تھا جو اسی میں فوت ہوگیا۔

تیمور لنگ نے جب ۱۳۹۸ء میں ہندوستان پر حملہ کیا تو وہ اپنے پیش رو حملہ آوروں کی طرح کول نامی جگہ کو فتح کرتا ہوا میرٹھ آیا۔ ممالک متحدہ میں میرٹھ ہی وہ پہلی جگہ تھی جہاں اس نے بہت سے غلاموں کو قتل کیا۔ اور میرٹھ والوں کو بہت نقصان پہونچایا۔ اس کے بعد اس نے لونی کا قلعہ فتح کیا۔

پھر میرٹھ سلطان ناصر الدین نصرت شاہ التمش کا صدر مقام مارچ ۱۳۹۹ء میں قرار پایا۔ اس نے ۴۰۹ھ میں سلطان محمود غزنوی کے وزیر احمد میمندی کی تعمیر کردہ چھوٹی مسجد کو جامع مسجد میں بدل دیا جو آج بھی شاہی جامع مسجد کے نام سے پرانی تحصیل کے متصل اپنے بنانے والوں کے اخلاص وللہیت کا مظہر ہے، اس مسجد کی تعمیر ناصر الدین نصرت شاہ التمش نے ۷۶۴ھ میں

کرائی تھی اس کے بعد میرٹھ لودیوں کے قبضہ میں آگیا۔ بعد میں مغلوں کی حکومت کے وقت جب دہلی دارالسلطنت تھی تو ان بادشاہوں نے بے شار سیر و تفریح کے لئے باغات اور شکار گاہیں پرگنہ لونی میں قائم کیں۔ ۱۷۴۸ء کے بعد غازی الدین نے ایک خوبصورت باغ کی جگہ غازی آباد آباد کیا۔ پہلے یہ ضلع میرٹھ کا حصہ تھا۔ اب الگ ضلع بن گیا ہے۔ ۱۱۰۸ھ میں میرٹھ میں نواب خیر اندیش خاں نے ایک قلعہ مرکز انجینیر کے نام سے تعمیر کرایا۔ جس کے عالی شان دروازے میں آج بھی پٹیل نگر تھانہ موجود ہے۔ اس قلعہ میں شیش محل، پائیں باغ، فوارہ وغیرہ ۱۹۳۸ء تک موجود تھے۔ یہ عمارتی سلسلہ اپنے وقت میں کمبوہ گیٹ (موجودہ پرانا گھنٹہ گھر) تک تھا، شیش محل کے نام سے یہاں ایک آبادی موجود ہے، کہا جاتا ہے کہ اسی جگہ شیش محل تھا، خیر نگر بازار میں مسجد خیر المساجد والمعابد بڑی عالی شان مسجد ہے، جو ۱۱۰۳ھ میں نواب صاحب مذکور نے تعمیر کرائی تھی۔ جو اب تبلیغی مرکز کے نام سے جانی جاتی ہے۔

ایک فرانسیسی سپہ سالار جس کا نام رنارڈیار رینالڈ تھا۔ اپنے صدر مقام سردھنہ میں سمرو صاحب کے نام سے مشہور ہوا۔ ۱۷۸۶ء میں رینالڈ کی وفات کے بعد اس کے جائیداد اس کی بیوہ کے ہاتھ میں پہونچی، جو سمرو صاحب کی بیگم کے نام سے معروف ہوئی۔ بیگم مذکورہ نے ایک نہایت خوبصورت گرجا بنو لیا جس کو دیکھنے کے لئے ہند اور بیرون ہند سے لاتعداد لوگ آتے ہیں۔ یہ عورت اسد اللہ خاں کی بیٹی تھی جو عربی نسل سے تھا اور کوتانہ میں رہتا تھا۔

اس کے بعد ۱۷۹۵ء میں یہ ضلع مرہٹوں کے قبضہ میں آیا۔ مرہٹوں نے بھی اپنی خون آشام تلواروں سے سرزمین میرٹھ کو لالہ زار بنایا۔ مرہٹوں کے بعد یوں تو ہندوستان میں پرتگالی، و فرانسیسوں نے بھی قدم جمانے کی کوشش کی مگر ان قوموں میں سکت نہ تھی، انگریز بھی آریائی و پرتگالی اور فرانسیسیوں کی طرح ہندوستان آیا۔ سرزمین میرٹھ پر بھی انگریز کی نظر پڑی، رابرٹ کلایو، ڈاکٹر باوسٹن، سرٹامس رو کے جانشین یہاں ایسے آئے کہ بغیر نکالے نہ گئے، لارڈ ہسٹنگز، لارڈ ڈلہوزی، لارڈ آک لینڈ، لارڈ امہرسٹ، لارڈ ویلزلی، لارڈ ولیم بینٹنگ، جیسے لوگوں کے دور سے گزرتا ہوا یہ انگریز لارڈ ماونٹ بیٹن کے دور میں گیا۔

آریائی قوم کی طرح انگریز اپنے آپ کو ہندوستانی ماحول میں گھلا ملا کر نہ رہ سکا جیسا کہ

آریائی، مغل، ترک، یہاں کے ہو کر رہ گئے، اور ہندوستان کو اپنا وطن تسلیم کیا۔ بڑھ چڑھ کر وطن عزیز کی تعمیر و ترقی میں اپنی قوتیں صرف کرتے رہے اور اسی سرزمین میں پیوند خاک ہوئے۔ انگریزوں کو نکالنا ہندوستانیوں کی بڑی مجبوری تھی۔

پورے ہندوستان پر قابض ہونے کے بعد سے لے کر ۱۸۵۷ء تک پوری تاریخ شاہد ہے کہ انگریزوں نے ہندوستانی لوگوں سے زندگی کے ہر میدان میں امتیاز برتا۔ حتیٰ کہ ملٹری فورس جیسے اہم شعبہ میں گورہ پلٹن و کالی پلٹن جیسے الفاظ انگریزوں سے ہندوستانی لوگوں میں امتیاز پیدا کرتے تھے۔ انگریز ہندوستانیوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ جس نے ہندوستانی لوگوں کے اندر بغاوت کے جذبات پیدا کر دیے۔ منصوبہ بند طریقے سے چپاتیوں اور کنول کے پھولوں کی تقسیم، فوجی بھرتی میں سمندر پار جانے کی شرط، آٹے میں سور کی ہڈیوں کا برادہ یا راکھ ملانے کی افواہ، کارتوسوں میں چربی کا استعمال ان تمام باتوں نے مل کر جلتی پر تیل کا کام کیا۔

شمال ہندوستان کا تاریخی شہر میرٹھ اپنے جلو میں عظیم چھاونی رکھتا تھا، جس میں انگریزوں کا مضبوط توپ خانہ موجود تھا، ۳۱ر مئی بغاوت کے لئے طے پایا۔ مگر یہ لاوا ۱۰ر مئی بروز اتوار ۱۸۵۷ء کو ہی پھوٹ گیا، پھر کیا تھا، دہلی چلو، آخر کار ساری رات چلتے چلتے میرٹھ کی باغی فوج ۱۱ر مئی بروز پیر بوقت صبح دہلی پہونچ گئی، اور بہادر شاہ ظفر کو اپنا رہبر تسلیم کر لیا۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ انجام کار جنگ آزادی کی یہ پہلی منصوبہ بند جنگ اپنی ناکامی پر اختتام پذیر ہوئی۔ ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو گاندھی جی کی رہنمائی میں آخر انگریزوں کی غلامی سے ہندوستان آزاد ہو گیا۔

آزادی کے بعد میرٹھ پچاس سالہ جشن آزادی میں اس شان سے داخل ہوا کہ میرٹھ میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جنھوں نے جنگ آزادی صرف ملک و ایمان بچانے کے لئے لڑی تھی ان میں سر فہرست شیخ طریقت الحاج مولانا حکیم محمد اسلام صاحب انصاری بانی و مؤسس جامعہ عربیہ نور الاسلام شاہ پیر گیٹ شہر میرٹھ، موصوف نے آزادی کے طلائی جشن پر کہا تھا "میں نے وطن آزاد کرانے کے لئے قربانی دی تھی، چوٹ کھائی تھی، حکومت کے خزانے سے پنشن پانے کے لئے نہیں، اس لئے آپ نے مجاہدین آزادی کی حکومتی فہرست میں اندراج نہیں کرلیا

جب کہ اس ادارے میں ایسے مجاہدین کا اندراج موجود ہے جن کو آج جنگ آزادی کی کچھ بھی معلومات نہیں، اور وہ کوشا ادھیکاری ضلع میرٹھ سے پنشن پاتے ہیں۔

آج ضلع میرٹھ میں صنعت کے اعتبار سے کھادی کپڑا، قینچیاں، باجا، چینی، ناخن کٹر، کٹلری کا سامان، دیسی صابن، اسپورٹس، کھیل کا سامان، لوہے کے پرزے، گیس کی ٹنکیاں، پورے ہندوستان میں مشہور ہیں، اگرچہ اور بھی صنعت وحرفت کے کام ضلع میرٹھ میں ترقی پر ہیں مثلاً کاغذ کا کام، گھڑی کا کام، اسپرنگ بنانے کا کام، ڈائی بنانے کا کام، فرنیچر کا کام، گوشت اور چمڑے کا کام وغیرہ۔ ہر کام تنظیم کے تحت ہوتے ہیں۔ یہاں ویاپار سنگھ نامی تنظیم بڑی متحرک اور فعال ہے۔

میرٹھ زبان وادب میں بھی کسی سے کم نہیں، اردو زبان وادب کی اہم ترین شخصیات یہاں پیدا ہوئیں، اسماعیل میرٹھی، رنج میرٹھی، مضطر میرٹھی، قلق میرٹھی، عبدالحق میرٹھی، حامد اللہ افسر میرٹھی، غلام محی الدین عشق میرٹھی، میاں یزدانی، شوکت میرٹھی، ندرت میرٹھی، عبدالسمیع بیدل رامپوری، مولوی اختر شاہ امروہوی، ماہر عروض ثروت میرٹھی، ماہر لسانیات امیر اللہ خان شاہین، بوم میرٹھی، شارق میرٹھی، آج بھی عبدالحفیظ صاحب حفیظ میرٹھی وڈاکٹر خالد حسین صاحب صدر شعبہ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ زبان وادب اردو میں سرزمین میرٹھ کی نمائندگی کے لئے کافی ہیں۔

دینی تعلیم کے لئے یہاں اسلامی مدارس بھی موجود ہیں۔ جو اسلام کی ترویج واشاعت[۱] میں اہم ترین خدمات انجام دے رہے ہیں۔ یہاں پر لاتعداد اکیڈمیاں عصری علوم کے لئے موجود ہیں۔ ہائی اسکولس وانٹر کالج موجود ہیں، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ کے تحت ڈگری کالج معیاری تعلیم دے رہے ہیں۔ یہاں کا میڈیکل کالج ہندوستان کے بہترین میڈیکل کالجوں میں شمار ہوتا ہے۔ ہزارہا نرسنگ ہوم بیماروں کی صحت کے لئے جدوجہد میں مصروف عمل ہیں۔ لڑکیاں بھی تعلیم میں لڑکوں سے کم نہیں، لڑکیوں کے لئے الگ انٹر کالج وڈگری کالج موجود ہیں۔

---

[۱] ضلع میرٹھ میں دینی مکاتب ومدارس کی تاریخ بھی بڑی پرانی ہے۔ اسلامی مبلغین ۱۰۱۷ء سے ۱۰۲۰ء کے بیچ میرٹھ وارد ہوئے۔ ان مبلغین نے صرف نو مسلم حضرات کو بنیادی دینی معلومات بہم پہونچانے تک اسلامی تحریک کو محدود رکھا۔
(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

خاص میرٹھ کی بابت روایت ہے کہ یہاں میر لوگ رہا کرتے تھے۔ اور میر پاتی کی چھاؤنی کے نام سے آج بھی پرانی تحصیل کے متصل ایک محلہ آباد ہے۔ ان میروں نے ایک قلعہ بنایا، قلعہ کو

بقیہ : حاشیہ صفحہ گذشتہ

اگر چہ اس وقت انسانی حقوق کے مارے لوگ اسلام کی حقانیت میں گوشہ عافیت محسوس کر رہے تھے۔ اس وقت یہ کام صرف چوپالوں اور سراؤں میں ہوتا تھا۔

اس کے بعد ۵۸۳ھ میں خانقاہی نظام کے تحت وعظ وارشاد کا سلسلہ صاحب کشف وکرامت بزرگوں سے شروع ہوتا ہے، اس وقت میرٹھ ۵۹۴ھ میں حضرت سید سالار مسعود غازی کی پہلی خانقاہ سرزمین میرٹھ پر مرکز اسلامی قرار پاتی ہے۔ بعد میں یہ سلسلہ دراز ہوتا ہوا غیاث الدین بلبن کے دور میں داخل ہوتا ہے اس دور میں علماء اپنے گھروں میں اسلامی تعلیم دیتے تھے۔

سلطان ناصر الدین کے دور میں حالات کافی سازگار ہوگئے تھے اور مسلمانوں کی کثیر تعداد اسلامی اصولوں پر کافی حد تک زندگی گزارنے لگی تھی۔ لگ بھگ اسی دور میں اسلامی محکمہ قضات وجود میں آتا ہے۔ شاہی عیدگاہ شاہی جامع مسجد، شاہی اسلامی فرمان، خطبہ اور مساجد میں مکاتب اس دور میں پہلی بار سرزمین میرٹھ نے دیکھے۔ کسی نہ کسی شکل میں مغل دور حکومت میں بھی فرداً فرداً اسلامی تعلیمات کا سلسلہ جاری رہا۔ اگر چہ یہ دور الحاد اکبری کے بعد حضرت مجدد الف ثانی کی تحریک سے شروع ہوتا ہے خصوصاً جہانگیر، شاہ جہاں، اورنگ زیب کے دور میں بزرگان دین نے اپنا دینی کردار ادا کیا، اس دور کے بزرگوں میں حضرت شاہ پیر صاحب وحضرت شاہ نھمن صاحبؒ ہیں، حضرت مجدد الف ثانی نے جب الحاد اکبری کے خلاف علم جہاد بلند کیا تو اس وقت میرٹھ بھی کفر وشرک میں جکڑا ہوا تھا۔ حضرت مجددؒ کے دور سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تک پھر اس کے بعد حضرت سید احمد شہیدؒ کا میرٹھ تشریف لانا اور انکا شاندار استقبال سرزمین میرٹھ پر اسلامی تحریک کا اہم ترین باب ہے۔

موجودہ مدارس قیام دار العلوم کے بعد بانی دار العلوم قاسم العلوم والخیرات حضرت امام قاسمؒ نانوتوی کی تحریک پر قائم ہوئے۔ حضرت امام قاسمؒ کی تحریک نے میرٹھ میں کافی فروغ پایا۔ دار العلوم دیوبند کے صد سالہ جشن پر طلباء ضلع میرٹھ نے ایک کتابچہ میں ان مدارس میرٹھ کی مختصر تاریخ شائع کی تھی۔ اس تحریک نے میرٹھ میں صاحب تصنیف وتالیف اور درس وتدریس سے منسلک علماء پیدا کئے جن میں سرفہرست مولانا بدر عالم محدث میرٹھی، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی، قاری سعید احمد اجراڑوی، مولانا سید لائق علی محدث جامعہ نور الاسلام میرٹھ، مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، مجاہد آزادی مولانا بشیر بھٹہ، حکیم محمد اسحاق کٹھوروی، مولوی اختر شاہ صاحب امروہوی، مفتی مظفر حسین صاحب وحکیم محمد اسحاق صاحب انصاری مشہور ومعروف ہیں۔

اسلامی تعلیمات واشاعت کرنے والے اکابرین صوفیاء وعلماء کی کثیر تعداد یہاں آرام فرما ہیں مثلاً حضرت حاجی شہاب الدین گنج علمؒ خلیفہ بابا فرید گنج شکرؒ، حضرت زاہد شاہ ولایتؒ مع اپنے شیخ امام کعبہؒ حضرت شاہ پیر صاحب، شاہ شمس الدینؒ، حضرت شیخ لعلؒ، حضرت شاہ نھمنؒ، وغیرہ مشہور ہیں، اللہ ان کی قبروں کو منور فرمائے۔ آمین۔

ہندی میں رتھ کہتے ہیں۔ اس لئے میروں کے قلعہ کا نام میرٹھ پڑ گیا، بعدہ یہ نام اس شہر کا پڑا۔

یہاں کا میلہ نوچندی ہندو مسلم اتحاد کی عملی نشانی ہے، جو سیکولر ہندوستان کی عظمت کا نشان ہے۔ آزادی کے طلائی جشن سے مسلسل تین سال سے یہ میلہ نوچندی میرٹھ عالی جناب محمد ایوب صاحب میئر نگر نگم میرٹھ کی زیر نگرانی و سرپرستی میں کامیابی کے ساتھ بلا لحاظ مذہب و ملت اہل وطن کا استقبال کر رہا ہے۔

مآخذ و مراجع

نمبر شمار	نام کتاب	زبان	مصنف و مولف و پتہ
۱	مہابھارت کا پس منظر	اردو	لاہور (قبل آزادی، پرانی کتاب)
۲	عجائب الاسفار	اردو ترجمہ	ابن بطوطہ، لاہور پاکستان
۳	تاریخ ہند	اردو	پروفیسر عبدالرشید صاحب علیگڑھ
۴	بھارت ورش کا اتہاس	ہندی	پنڈت ایشوری پرساد ماہیش وری میرٹھ
۵	میرٹھ کے پانچ ہزار سال	ہندی	وگنیش کمار ہستناپور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ہستناپور
۶	سوتنترا سنگرام اور میرٹھ	ہندی	آچاریہ دیپنکر شاستری نگر میرٹھ
۷	میرٹھ اور اس کی اتہاسک جن پرمپرا	ہندی	کرشن دت تحقیقی مقالہ غیر مطبوعہ میرٹھ یونیورسٹی
۸	جغرافیہ میرٹھ	اردو	ورنا کیولر سسٹم اسکول کورس کی ایک کتاب پرانی تحصیل میرٹھ
۹	باغی میرٹھ	اردو	رحمت نجمی روحانی اتحاد کمیٹی میرٹھ
۱۰	آزادی کی کہانی		حکیم محمد اسلام صاحب کی زبانی (ملفوظات) غیر مطبوعہ
۱۱	آثار میرٹھ	اردو	محمد احمد انصاری زیر ترتیب و تحقیق غیر مطبوعہ
۱۲	تاریخ فرشتہ	اردو	محمد قاسم فرشتہ دیوبند ضلع سہارنپور
۱۳	مختلف ادبی کتابیں مقالے و رسائل		
۱۴	مختلف صنعتی رسائل اخباری	معلومات و	مشاہدات خود ساختہ محمد احمد انصاری
۱۵	میرٹھ گزیٹیر	اردو، ہندی، انگلش	
۱۶	مجاہد آزادی	اردو	مولانا بشیر بھٹہ، جمعیۃ العلماء دہلی

سرپرست اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی

عالیجناب حکیم عبدالحمید صاحب (چانسلر جامعہ ہمدرد دہلی و علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

مجلس ادارت اعزازی

☆ سید اقتدار حسین

☆ ڈاکٹر معین الدین بقائی

☆ محمود سعید بلالی

☆ ڈاکٹر جوہر قاضی

نگران اعلیٰ

حضرت مولانا

حکیم محمد زماں حسینی

برہان

جلد: ۱۲۴ | مئی، جون ۱۹۹۹ء | شمارہ: ۵، ۶

اس شمارے میں

زرِ تعاون

فی پرچہ: ۶ روپے

سالانہ: ۷۲ روپے

رحمٰن کمپیوٹرس دہلی

Ph.:6952082

جملہ خط وکتابت اور ترسیل زر کا پتہ:

منیجر ماہنامہ برہان

4136-اردو بازار، جامع مسجد دہلی-110006 فون نمبر: 3262815

عمید الرحمٰن عثمانی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان، اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

یہ افسوس کا بھی اور شرم کا بھی مقام ہے کہ کوئی امن کا راستہ چھوڑ کر جنگ وجدل کا راستہ اختیار کرے۔ پاکستان اس لحاظ سے بڑا ہی بدنصیب واقع ہوا ہے کہ وہ ہندوستان کے پیغام امن کے جواب میں تشدد اور جنگ کا ماحول تیار کرنے پر آمادہ ہے اس نے اپنے اقدامات سے امن وامان کے تمام راستوں میں روڑے بکھیر دیئے ہیں اور وہ ہندوستان کی امن پسندانہ پالیسی کو بہ نظر تحسین دیکھنے کے بجائے اس پر الٹا من گھڑت اور غلط الزامات لگا کر دنیائے انسانیت کو گمراہ کرنے کے درپہ ہے۔

کرگل میں تسلیم شدہ کنٹرول لائن کی خلاف ورزی کرتے ہوے پاکستان نے بڑی خاموشی، چالاکی، عیاری اور مکاری کے ساتھ دراندازوں کو گھسیڑ دیا ہے جس سے ہندوستان کی سرحدوں کی سخت خلاف ورزی ہوئی ہے۔ اور سننے میں آیا ہے کہ پاکستان نے یہ حرکت جنوری ۱۹۹۹ء سے شروع کی ہوئی ہے۔ ایک طرف تو اس نے ہندوستان کے ساتھ ہندوستان کی خواہش پر دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور دوسری طرف اس نے ہندوستان کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا۔ اس کی یہ حرکت کسی بھی معنی میں نہ تو ٹھیک کہی جاسکتی ہے اور نہ ہی کسی بھی طرح سے اس کی تائید ہی کی جاسکتی ہے۔ بلکہ ہر وہ الفاظ ڈھونڈ ڈھونڈ کر یہاں جمع کیا جائے جس سے پاکستان کی اس شرمناک اور افسوسناک حرکت کی مذمت ہوسکے یہ دوستی کی آڑ میں جنگ کا حربہ نہ صرف دکھ وافسوس کی بات ہے بلکہ انسانیت کے نام پر شرمناک کلنک ہے۔

ہمیں معاف کیا جائے اگر ہم یہ کہیں کہ پاکستان نے اپنی اس حرکت سے اسلام کی تعلیمات سے بھی انحراف کیا ہے کیونکہ اسلام کی تعلیمات کی رُو سے امن وامان کی راہ اپنانا ایک مستحسن اقدام ہے۔ انسانیت کے لیے تشدد کو کبھی بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا ہے ہمیشہ امن انسانیت کی فلاح بہتری کا باعث ہے ہم اس بات کو برملا کہیں گے کہ روز اول سے پاکستان کے

قیام سے اب تک وہاں اسلامی تعلیمات سے انحراف ہی کے راستے کو اپنایا گیا ہے پاکستان کے حکمراں انگریزی اثرات سے مغلوب و متاثر ہیں۔ اور وہ پاکستان معاشرے میں انگریزیت کو رائج کرنے کی ہر کوشش کو اپناتے ہیں۔ حالانکہ ہندوستان کی جنگ آزادی کے دوران جب یکایک ہندوستان کی آزادی کی تحریک کو کمزور کرنے کے ارادے سے کسی غیبی طاقت کے اشارے پر پاکستان کا مطالبہ رکھا گیا تو اس وقت بڑے زور و شور سے یہ کہا گیا تھا کہ پاکستان میں اسلامی اور قرآنی حکومت ہوگی اور وہاں عوام کو اسلامی تعلیمات سے مزین قانون سے واسطہ وسابقہ پڑے گا۔ بھولے بھالے اور سادہ لوح عوام ان کے اس جھانسے میں آگئے اور جب پاکستان معرض وجود میں آیا تو معلوم ہوا کہ یہ ملک تو ایک دم سے تعلیمات اسلامی سے انحراف ہی کے راستے پر گامزن ہے۔ اس کے حکمرانوں نے اسلام کی تعلیمات کو رائج کرنے کا صرف وعدہ کیا تھا عوام کو مسخر کرنے کے لیے نعرہ لگایا تھا، باقی انہیں اسلام کے قوانین کو پاکستان میں رائج کرنے کی بات تو الگ انہیں اسلامی قوانین سے واقفیت حاصل کرنے کی بھی فرصت نہیں ہے کیونکہ جب پاکستانی حکمرانوں کو اسلامی قانون کے طور وطریقوں پر چلنا ہی نہیں ہے تو پھر اس سے واقفیت کی ضرورت ہی کیا ہے، یہ ہے پاکستان کے حکمرانوں کی ذہنیت، دراصل پاکستان کا وجود ہمارے ناقص خیال میں اسلام دشمن طاقتوں کے مکارانہ ذہنیت کا ہی نتیجہ ہے۔ جب سے پاکستان کا وجود عمل مین آیا ہے اس وقت سے آج تک آپ دیکھ سکتے ہیں کہ مسلمانوں پر کس قدر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ رہا ہے۔ جس وقت پاکستان کا تصور پیش کیا گیا تھا اسی وقت عین قلب عرب میں یہودیوں کی اسرائیل نام کا ملک قائم کرنے کا بھی پلان تخلیق کیا گیا تھا۔ عالم اسلام کو ہر طرح گھیر کر اور اسے ضرب شدید پہونچانے کی ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت جو عمل ہو رہا ہے پاکستان کے حکمران اسی منہج پر چل رہے ہیں۔ یہاں ہم اس بات کی بھی وضاحت کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم پاکستان کے متعلق جو بھی کچھ خیالات کے اظہار کر رہے ہیں اس کی زد میں وہاں کے عوام نہیں آنے چاہئیں۔ عوام بھولے بھالے ہوتے ہیں ان کا کسی بھی سازش میں ملوث ہونے یا تخریب کاری کی حرکتوں سے قطعاً لینا دینا نہیں ہے ہمارا جو بھی خیال ہے وہ پاکستان کے حکمراں طبقہ کے بارے

میں ہے۔ پاکستانی فوج کی غلط حرکتوں کے بارے میں ہے۔ پاکستان کی عوام کو ہم بے قصور سمجھتے ہیں وہ امن پسندانہ پالیسی میں یقین رکھتی ہے اور اسے تشدد اور تخریب کاری کی حرکتوں سے نفرت ہے بلکہ تشدد اور تخریب کاری کی تو وہ خود شکار ہے جس سے وہ نکلنے کے لیے جی جان سے کوشاں ہے۔ لیکن پاکستان کے حکمرانوں نے ایسا چکر چلا رکھا ہے کہ وہ اس میں اپنا مفاد دیکھتے ہیں اور جب پاکستان کے حکمرانوں کے سامنے اپنا ذاتی مفاد ہوتا ہے تو پھر کسی کی بھی پرواہ نہیں کرتے ہیں ان کے لیے انسانیت کا پیغام لاحاصل ہے ان کے لئے عوام کی فلاح و بہبود کی باتیں بیکار کی چیز ہے۔ ان کے لیے امن عالم کے لیے دہائی کی بات کرنا ایک بے معنی بات ہے۔ کبھی افغانستان میں خرمن امن کو برباد کر کے وہاں کے عوام کی زندگی کو اجیرن بنا دینا پاکستانی حکمرانوں کا کھیل ہے۔ اور کبھی کشمیر میں گھس پیٹھیوں کو بھیج کر امن کو برباد کرنے کا سامان پیدا کر دیا جاتا ہے۔ بھارت کے دوسرے صوبوں میں امن و چین کو غارت کرنا پاکستانی حکمرانوں کا مشغلہ بن گیا ہے۔ پاکستان کی خفیہ ایجنسی نے جس طرح ہمارے امن پسند ملک میں اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ تخریب کاری کی وارداتیں کو جاری کر رکھا ہے اسے دیکھ کر انسانیت کا ہر بہی خواہ پاکستانی حکمرانوں پر لعنت وملامت بھیجے بغیر نہ رہ سکے گا۔ آج کرگل میں پاکستان نے جس طرح دراندازوں کو اور اپنے فوجی جوانوں کو دوسرے بھیس میں بھیج کر جس طرح وہ امن کا دشمن بنا ہوا ہے اس کا نتیجہ امن کی بربادی کی صورت میں تو نکلے گا ہی لیکن خود پاکستان کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ پاکستان تباہ و برباد ہو جائے گا۔ جنگ کی چاہت خود ایک ٹریجڈی ہے اور پاکستان کسی کی شہ پر جنگ چاہ رہا ہے تو پھر پاکستان اپنے کو تباہ و بربادی کے لیے تیار رکھے۔ بھارت ہمیشہ امن پسند ملک رہا ہے اس نے نہ کبھی کسی ملک پر حملہ کیا ہے اور نہ ہی انشاء اللہ وہ کبھی کسی پر حملہ کریگا لیکن اگر اس کی حدود میں کسی نے گھسنے کی کوشش کی اور اس پر جنگ تھوپی تو وہ اس کا ایسا ڈٹ کر مقابلہ کرے گا کہ اسے نانی دادی کا دودھ یاد آجائے گا۔ ہندوستان کی فوج جب دشمن پر ٹوٹے گی تو دشمن کا وجود ہی باقی نہیں رہے گا اس کا چھوٹا سا اندازہ اے۱۹ء کی جنگ میں شاید ہو ہی گیا ہوگا۔ پاکستان کے حکمرانوں کو جب کہ انہوں نے اپنی ۹۰ ہزار فوج کو ہتھیار ڈلوانے کی ذلت آمیز صورت سے گزر لیا تھا۔

اس لیے ہماری رائے میں پاکستانی حکمرانوں کو چاہئے کہ وہ بھارت کی سرزمین سے اپنے دراندازوں کو فوراواپس بلائیں۔ بھارت اپنی ایک ایک انچ زمین کی حفاظت کرنا خوب جانتا ہے اور جو اس کی سرزمین پر نگاہ غلط ڈالنے کی کوشش کرے گا وہ خود اپنے وجود ہی کو مٹا ڈالے گا۔ یہ بات پاکستان کے ناعاقبت اندیش حکمرانوں کو ذہن نشین کرہی لینی چاہئے۔

نامناسب نہ ہوگا اگر یہاں پاکستان سے متعلق علماء اسلام کے خیالات و نظریات ملاحظہ فرمالئے جائین۔ جس مملکت کا خواب مسلمانوں کو دکھایا جارہا ہے وہ ایک فریب سے زیادہ نہیں ہے۔ حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ مفسر قرآن نے آنے والے خدشات کو سامنے رکھتے ہوے کہا تھا کہ پاکستان ایسا ہی ہوگا وہاں مذاہب اور اہل مذاہب کے ساتھ اس قسم کا وحشیانہ سلوک کیا جائے گا۔ اس پاکستان کو علمائے حق کو رائے کی آزادی میسر نہ ہوگی۔ اس پاکستان میں کیا آپ نماز روزے اور شعائر اسلامیہ کی چہل پہل دیکھ سکیں گے بلکہ وہ پاکستان تو فسق وفجور کی منڈی ہوگی جہاں سب کچھ ہوگا اور نہیں ہوگا تو دین الٰہی کا تذکرہ نہیں ہوگا۔ مولانا مرحوم کے ان الفاظ میں سچائی، صداقت کا کس قدر صاف ستھرا آئینہ ہے۔ اور شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے فرمایا "یہ صحیح ہے کہ پاکستان اور اسلامی حکومت کے نعرے بڑے دلفریب معلوم ہوتے ہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ اسلامی حکومتوں کے قیام کا تخیل عام مسلمانوں میں ایک خاص قسم کا سرور جوش پیدا کرتا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان میں کافی اختلافات ہیں مگر اس کے باوجود ہرگز صحیح نہیں ہے کہ ہندوؤں کی تنگ دلی سے شاکی ہو کر ہم ایسی غلطی کر بیٹھیں جو مستقبل میں ہمارے لیے تباہ کن اور ملک کے لیے باعث بربادی ہو"

ان خیالات کے بعد کون ہوگا جو موجودہ پاکستان کے حکمرانوں کی روش اور طرز معاشرت کو دیکھ کر پاکستان کو ذرا بھی مسلمانوں کا ملک کہنا گوارہ کرے گا۔

☆☆☆

تحریر : نشیب نشاوی ترجمہ : ڈاکٹر غلام یحیٰ انجم
صدر شعبہ علوم اسلامیہ ہمدرد یونیورسٹی نئی دہلی

المجمع العلمی الهندی اور اس کا آرگن

پروفیسر مختار الدین احمد (سابق) ڈین فیکلٹی آف آرٹس و (سابق) صدر شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے "المجمع العلمی الهندی" کی بنیاد اپنی پیہم کوششوں اور مسلسل جدوجہد کے بعد ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء میں رکھی۔ ہندوستان میں اس اکیڈمی کی تاسیس کا مطمح نظر وہی ہے جو دمشق میں "مجمع اللغۃ العربیۃ" کا تھا اسی مناسبت سے اکیڈمی کے احوال و کوائف سے روشناس کرانے کے لئے پروفیسر موصوف نے "المجمع العلمی الهندی" کے نام سے ایک مجلہ جاری فرمایا، اس اکیڈمی کے حسب ذیل مقاصد کے پیش نظر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو چاہئے کہ اس کے ہر ممکن بار کو برداشت کرے تاکہ بہر صورت اس اکیڈمی کو مقاصد کی تکمیل میں سہولت ہو۔

اکیڈمی کے دو مقاصد خصوصیت سے قابل ذکر ہیں:

(۱) ہندوستان میں عربی زبان کی نشر و اشاعت (۲) اسلامی تہذیب کا عروج و ارتقاء

مولانا ابوالحسن ندوی اکیڈمی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں!

"من احق المراكز العلمية والثقافية واجدرها بانشاء المجمع لتوافر الوسائل عندها ولوجود مكتبة من أغنى مكتبات الهند، ولوجود قسم اللغة العربية وآدابها وقسم الدراسات الإسلامية وقسم ثقافية آسية الغربية ....ولان عددا من الاساتذة المحققين فى اللغة العربية وآدابها كانت لهم صلات وثيقة بهذه كا العلامة عبدالعزيز الميمنى الراجكونى والاستاذ بدرالدين العلوى والاستاذ الدكتور مختار الدين احمد...."

"علمی و ثقافتی مراکز میں "المجمع العلمی الهندی" اپنے وسائل کی فراوانی کی وجہ سے سب سے زیادہ اہم ہے کیونکہ اس کے یہاں ہندوستان کی عظیم ترین (مولانا آزاد) لائبریری ہے عربی اور اسلامی علوم کی نشر و اشاعت کا شعبہ ہے ایشیائے غربی کی تہذیب و تمدن اور تعلیم کا مکمل انتظام

ہے.... اور اسلئے بھی کہ عربی زبان کے ماہرین اساتذہ کا اس جامعہ سے گہرا تعلق ہے، علامہ عبد العزیز المیمنی راجکوٹی کے شاگرد رشید اور عربی مخطوطات کی شناخت میں ایشیاء کے عظیم ترین محقق ہیں، علمی اور تحقیقی دنیا میں پروفیسر مختار الدین کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ پروفیسر موصوف نے تالیف وترتیب اور اور تحقیق وتدوین میں اپنے مخلص استاذ ڈاکٹر عبد العزیز المیمنی کا طریقۂ کار اختیار کیا اور انہیں کے نقش قدم پر چل کر ہندوستان میں عربی زبان کی گرانقدر خدمات انجام دیں۔

اغراض ومقاصد

المجمع العلمی الهندی اپنے قیام کے وقت سے ہی عربی زبان اور اسلامیات کے قابل قدر ذخیروں کی نشر واشاعت میں مصروف ہے اور ہندوستان اور عالم اسلام کے مابین تعلقات کو مستحکم بنائے ہوئے ہے۔

اکیڈمی کے جنرل سکریٹری پروفیسر مختار الدین احمد اس کے قیام کے وقت اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے اکیڈمی کے مجلّہ "المجمع العلمی الهندی" حصہ اول میں فرماتے ہیں:

"المجمع العلمی الهندی" کے اغراض ومقاصد حسب ذیل ہیں"

(۱) ہندوستانیوں میں عربی زبان عام کرنا اور اس کی نشر واشاعت کی طرف دھیان رکھنا۔

(۲) عربی زبان، عربوں کی تاریخ اور ان کے علوم وفنون پر تالیف کا اہتمام کرنا۔

(۳) عربی تالیفات اور مخطوطات کا جدید ترین علمی شکل میں احیاء

(۴) علمائے ہند کے علمی کارناموں اور ان کی اہم تالیفات کے تراجم کی ہمت افزائی۔

(۵) عرب ممالک میں علمی روح پھونکنا اور انہیں فکر وعمل پر ابھارنا۔

ان علمی مقاصد کے حصول کے لئے "المجمع العلمی الهندی" نے ایک مجلّہ کے اجراء کا فیصلہ کیا جس میں وہ اپنے خیالات اور سرگرمیوں کی ایک جھلک پیش کرتا رہے۔ اور اس طرح کے دوسرے ادارے جو عالم اسلام میں موجود ہیں ان کے درمیان مستحکم رابطہ کا کام دے نیز اہل قلم اور ادباء کی صلاحیتوں کی جولانگاہ بھی بن سکے۔

اس بیان کے آخر میں پروفیسر موصوف نے مخلص علماء کو دعوت عام دی کہ وہ اس مجلّہ میں

اپنے رشحاتِ قلم ارسال کر کے ہماری ہمت افزائی کریں اپنی تجاویز اور مشوروں سے نوازیں اور اس اکیڈمی کے اغراض ومقاصد کے حصول میں جو کچھ مدد کر سکتے ہوں اس سے دریغ نہ کریں۔

اس اکیڈمی کے ممبران ہندوستان عالم عرب اور دوسرے ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں جو دو قسم کے ہیں ایک مجلس عاملہ دوسرے مجلس اعزازی ممبران۔ اعزازی ممبران کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

جمہوریہ شام

ڈاکٹر حسنی شیخ صدر مجمع اللغۃ العربیۃ (دمشق)

ڈاکٹر شاکر الفحام نائب صدر مجمع اللغۃ العربیۃ (دمشق)

ڈاکٹر عدنان الخطیب سکریٹری مجمع اللغۃ العربیۃ (دمشق)

ڈاکٹر شکری فیصل رکن مجمع اللغۃ العربیۃ (دمشق)

استاذ احمد راتب النفاخ رکن مجمع اللغۃ العربیۃ (دمشق)

ڈاکٹر احمد یوسف الحسن وائس چانسلر جامعہ حلب

ڈاکٹر خالد ماغوط مہتمم جامعہ حلب

ڈاکٹر خالد حوریہ مہتمم جامعہ حلب

سعودیہ عربیۃ

استاذ حمد الجاسر

جمہوریہ عراق

ڈاکٹر عبد الرزاق محی الدین، ڈاکٹر یوسف عز الدین ڈاکٹر علی جواد الطاہر، استاذ کورکیس عواد ڈاکٹر صالح احمد العلی ڈاکٹر حسن علی محفوظ

جمہوریہ اردن

ڈاکٹر ناصر الدین اسد

فلسطین

ڈاکٹر احسان عباس

لبنان

ڈاکٹر صلاح الدین المنجد، ڈاکٹر عمر فروخ

مراکش

استاذ عبدالعزیز بن عبداللہ استاذ عبداللہ کنون

کویت

استاذ عبدالستار فراج، محترمہ ڈاکٹر ودیعہ انصاری

اور ان کے علاوہ ایران، ترکی، پاکستان، سوویت روس، برطانیہ، فرانس، ہنگری، اٹلی، ہالینڈ اور جرمنی کے بڑے بڑے ماہرین علوم عربیہ اس اکیڈمی کے ممبر ہیں۔

یہ اکیڈمی مندرجہ ذیل اہم معاونین و اعزازی ممبران سے محروم ہو چکی ہے۔

(۱) ڈاکٹر عبدالعزیز المیمنی راجکوٹی متوفی ۱۹۷۸ء۔ (۲) استاذ محمد یوسف البنوری متوفی ۱۹۷۷ء (۳) ڈاکٹر سید محمد یوسف متوفی ۱۹۷۸ء (۴) ڈاکٹر آصف علی اصغر فیضی متوفی ۱۹۸۱ء۔ (۵) ڈاکٹر الحاج عبدالکریم جرمانوس متوفی ۱۹۷۹ء (ہنگری) (۶) استاذ خیر الدین الزرکلی متوفی ۱۹۷۶ء (۷) استاذ عبدالستار فراج متوفی ۱۹۸۰ء (۸) استاذ محمد المبارک ۱۹۸۱ء (۹) ڈاکٹر میشیل خوری متوفی ۱۹۸۰ء۔

"المجمع العلمی الهندی" کا مجلّہ

اس اکیڈمی نے اپنا ایک ششماہی مجلہ ۱۳۹۶ھ / ۱۹۷۶ء میں جاری کیا اور اپنا شعار (علم الانسان ما لم یعلم) بنایا، اس مجلہ کے مدیر اعلیٰ اکیڈمی کے جنرل سکریٹری پروفیسر مختار الدین احمد ہیں آپ نے اس مجلہ کے پہلے شمارہ جمادی الثانی ۱۳۹۶ھ / جون ۱۹۷۶ء کا افتتاحیہ لکھا اور اس کا آغاز ڈاکٹر عبدالعزیز المیمنی کے مضمون "ابو عمر الزاهد غلام ثعلب الحفظة اللغوی المحدث" سے کیا۔

مجلہ کا مقصد ہندوستان میں قدیم عربی ورثہ کا احیاء بر صغیر میں علمی خدمات انجام دینے والے علماء کا تعارف، عربی زبان میں تحقیق و تدقیق کرنے والوں کی اعانت اور ادبی اور اسلامی

علوم عربی زبان میں تعلیم دینے کی ہمت افزائی ہے۔ ہندوستان اور عرب ممالک میں تہذیبی روابط کو مستحکم بنانے میں مجلّہ کا اہم کردار رہا ہے اور ان ممالک میں اسلامی تہذیب اور عربی زبان وادب میں اس کی گرانقدر خدمات میں بہت سے عربی مخطوطات کا اس نے تعارف کرایا اور اہم تالیفات و تحقیقات کی نشر و اشاعت کی جس کی تشنگی مدت سے عرب ممالک میں محسوس کی جارہی تھی اور تحقیق و تدقیق اور گیرائی و گہرائی کو اس نے اپنا شعار بنایا چاہے ان کا تعلق تعلیم و تعلم سے ہو یا نقد و نظر سے آراء و افکار ہوں یا اشارات و حاشئے ہوں یا کتابوں کا تعارف و تبصرہ ہو۔

ہم یہاں اس آخری شمارہ کی ایک جھلک پیش کریں گے جو ہمیں دستیاب ہوا ہے یہ رجب ۱۳۹۹ھ / جون ۱۹۷۹ء کی چوتھی جلد کا پہلا اور دوسرا مشترکہ شمارہ ہے اور مندرجہ ذیل اقتباسات پر مشتمل ہے۔

(۱) تلخیص کتاب الحیوان لابن باجہ اندلسی　　از ڈاکٹر محمد صغیر حسن معصومی

ڈاکٹر معصومی نے اس کتاب میں ابو بکر محمد بن یحییٰ الصائغ کے ایک نادر رسالے کا تعارف کرایا ہے ابو بکر محمد بن یحیٰ الصائغ ابن باجہ اور ابن الصائغ فلسفی اندلس کے نام سے مشہور ہیں سرقسط میں آپ کی ولادت ہوئی اور وہیں ۵۲۲ھ / ۱۱۳۸ء میں وفات پائی اس رسالے کے مقدمے میں ڈاکٹر معصومی لکھتے ہیں:

> یہ رسالہ ارسطو کی کتاب "الحیوان" کے بعض ابواب پر مشتمل ہے اس رسالہ کا مخطوطہ نسخہ بوک ککلشن کے ۲۰۶ نمبر کے تحت ہے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کی بودلیانا لائبریری سے اس نادر مخطوطہ کا حصول ممکن ہو سکا (صفحہ ۸۹ سے رسالہ کی شروعات ہوتی ہے) یہ رسالہ ان تمام تحریروں پر مشتمل ہے جنہیں ابن باجہ نے تاریخ الحیوانات کے موضوع پر ارسطو کی کتاب کے بعض ابواب کی تشریح میں سپرد قلم کیا ہے ابن باجہ نے لکھا ہے کہ علم الحیوان علم الطبعیۃ کا ایک جزء ہے۔

نفس اس کے اجزاء اور اس کی صلاحیتوں پر گفتگو کو کتاب النفس میں شامل کیا ہے، نفس کے متعلقات اور اس کی طاقتوں جیسے قوت حافظہ، قوت انفعال اور قوت فیصلہ کی بحث اور نفس کی حیثیت سے جسم کے متعلقات نیند بیداری جوانی اور بڑھاپا کے مباحثہ کو کتاب الحس میں بیان کیا

ہے، بیماری و تندرستی اور جانوروں کی حرکات کے لئے دو الگ ابواب قائم کئے ہیں۔

مقدمہ کتاب کے صفحہ ۸۳ پر ایک عبارت ہے جس کی ابتداء "ولله العزة والقدرة" سے ہوتی ہے کتاب الحیوان کے بعض مقالات کے سلسلہ میں ابن باجہ کا یہ قول بھی ہے۔

"کل صناعة نظرية فهي مؤتلفة من مباد ومسائل"

ہر صنعت نظری ہے اور اسباب وسائل سے مشترک ہے۔

اور آخری عبارت یہ ہے:

"کل طائر له منقار فلاانسان له ولا شفة ولا منخر ولها اعين وهي تغمص دون شعر ما ثقل جسده من الطيور تغمض الشعر اسفل كالنعامة"

(۲) العربية تواجه العصر في الجاهلية		از: ابراہیم سامرائی

اس کتاب میں ڈاکٹر ابراہیم سامرائی نے دور جاہلیت کے تہذیبی گوشوں سے بحث کی ہے، اور ان گوشوں کی جاہلی اشعار میں جستجو کی ہے۔ فرماتے ہیں:

"فاستقراء ادب العرب في جاهليتهم يدلنا على ان القوم كانت لهم ذخيرة حضارية"

زمانہ جاہلیت میں عربی ادب کی تحقیق و جستجو سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے پاس تہذیب و تمدن کا وافر ذخیرہ تھا۔

اس کے بعد دور جاہلیت کی شاعری سے اس کے نمونے پیش کئے ہیں جو اس بات پر واضح دلیل ہیں کہ آسمانی مذاہب سے عرب بخوبی واقف تھے۔ اور ایک ہم ہیں کہ ہمیں اپنی کھیتوں اور باغات سے پوری طرح واقفیت نہیں چہ جائے کہ دوسری تہذیبوں کی طرف رہنمائی حاصل ہو پھر انہوں نے ان جاہلی اشعار میں تہذیب کے فنی مظاہر کا ذکر کیا ہے جس میں دھاری دار چادروں کی صنعت، عراقی منقش کپڑوں، دمشق کے ریشمی کپڑوں از خر چمڑے کی صنعت اور عطر وشراب کی بوتلوں کا ذکر ہے اسی طرح تہذیب کے تجارتی مظاہر کو بھی انہوں نے پیش کیا ہے اور کشتیوں کا ذکر کیا ہے جو ان کی تجارت کا پتہ دیتی ہیں اور عرب کے بازاروں کا بھی ذکر کیا ہے جو "ذی المجاز" وغیرہ کے ادبی مناظروں ہی تک محدود نہیں تھے۔ اس کے علاوہ اس میں سونے کے

زیورات بنانے میں ان کی مہارت کا بھی ذکر ہے۔

(۳) بین النویری والمیدانی　　　　از ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی

اس مقالہ میں ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی صاحب نے فرمایا ہے کہ نویری نے اپنی مشہور زمانہ تصنیف نھایۃ الادب کی ابتداء مروجہ امثال کے ذریعہ استدلال سے کی ہے اور اس کے تیسرے حصہ تک یہ بحث جاری ہے چنانچہ انہوں نے مشہور امثال پر ایک باب الگ سے قائم کیا ہے اور یہ ان کی اس جامع تصنیف کے فن ثانی کے دوسرے حصہ میں موجود ہے۔ چنانچہ آپ نے رسول اللہ ﷺ، خلفائے راشدین اور صحابہ سے مروی امثال کو نقل کیا ہے تاکہ اس کے بعد عام امثال کا ذکر بھی ہو سکے گرچہ انہوں نے دوسری کتابوں سے بھی بعض امثال نقل کئے ہیں لیکن مندرجہ بالا ابواب میں بطور خاص "العقد الفرید" اور عام طور سے دوسرے ابواب میں میدانی کے مجمع الامثال کا سہارا لیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ "ومن الامثال العرب ما نقلته من کتاب الامثال للمیدانی"

عربوں کے دوسرے امثال وہ ہیں جنہیں میں نے میدانی کی کتاب "الامثال" سے نقل کیا ہے جو تقریباً ۶ ہزار امثال پر مشتمل ہیں۔ مصنف نے دونوں کتابوں سے استشہاد کیا ہے اور آخر میں کہا ہے:

ان النویری عند نقل الامثال من المیدانی لا یتبعه کمقلد اعمیٰ او ناقل خاتل بل یعمد إلی الامثال والقصص والروایات المنسوخة حولها والاقوال المرویة عنها فیهذبها تارة وینقحها تارة اخری ویختصرها طورا ویوجز طوراً آخر آخذا منها ما طاب وصفا تارکاً منها ما کدرو کسد ، علی هذا المنوال انی علی جمیع حروف المعجم... وضمنها الجزء الثالث من کتابه النهایة ..... وکذا فان مجموع الأمثال التی اوردها النویری فی کتابه نقلاً من المیدانی یبلغ ۵۹۸ مثلاً.....

نویری نے میدانی سے امثال نقل کرتے وقت کسی اندھے مقلد یا فریبی ناقل کی طرح پیروی نہیں کی ہے بلکہ وہ امثال وواقعات اور ان کے مروی اقوال کو لیتے ہیں اور اسے کبھی

تہذیب کرتے ہیں کبھی تنقیح اور کبھی اختصار جو چیزیں اچھی ہوتی ہیں اسے اپنا لیتے ہیں اور جو چیزیں اچھی نہیں ہوتی ہیں اسے چھوڑ دیتے ہیں اس طرح انہوں نے تمام کو مثل حروف تہجی درج کیا ہے نھایۃ الادب کا تیسرا حصہ ان تمام پر حاوی ہے اس طرح سے وہ امثال جنہیں نویری نے میدانی سے نقل کرکے تحریر کیا ہے ان کی تعداد ۵۹۸ تک پہنچ جاتی ہے۔

(۴) نظرية اجمالية على مخطوطة نادرة "عصمة الأنبياء لملا مخدوم الملك"

از: ڈاکٹر عبدالباری

اس کتاب میں ڈاکٹر عبدالباری صاحب نے "عصمة الانبياء" نامی کتاب کے مخطوطہ سے بحث کی ہے یہ کتاب عبداللہ سلطان پوری کی تالیف ہے آپ ملا مخدوم الملک سے مشہور ہیں۔ شہر لاہور کے قریب پنجاب میں ولادت ہوئی، ڈاکٹر موصوف نے لکھا ہے کہ اس کتاب کی تالیف شہنشاہ ہمایوں ۹۳۱۔ ۹۶۳ کے دور میں ہوئی، ڈاکٹر موصوف نے مولف کی زندگی اور ان کے زمانہ کا جائزہ لیا ہے پھر اس کے بعد مخطوطہ سے بحث کی ہے جو پٹنہ شہر کی خدابخش لائبریری میں ۵۶۹ نمبر کے تحت محفوظ ہے اس میں ۱۴۹ اوراق ہیں۔

پھر انہوں نے لکھا ہے کہ "عصمة الأنبياء من الزلل" کے مصنف نے کتاب وسنت کی روشنی میں اپنے موضوع سے بحث کی ہے اور اپنے دور کی فلسفیانہ موشگافیوں سے پہلو تہی کرتے ہوئے اپنے عقائد وخیالات کو قرآن وسنت کے مضبوط دلائل سے ثابت کیا ہے اور یہ کہ مخدوم الملک نے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ اصل میں اس طریقۂ کار کی توسیع واشاعت ہے جس کی بنیاد علامہ توریشی شارحِ مصابیح السنۃ للبغوی نے ڈالی تھی اور یہ کہ آپ امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ کے نظریئے سے متاثر ہوئے جن کے بارے میں یہ بات اوپر گذر چکی ہے کہ انہوں نے "عصمة الانبياء" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی لیکن وہ طبع نہ ہو سکی اور اس کا مخطوطہ برلن لائبریری میں ۲۵۲۸ نمبر کے تحت محفوظ ہے۔

کتاب کے درمیانی ابواب میں ڈاکٹر موصوف نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ "مصنف نے قاضی عیاض اور امام قشیری وغیرہ جیسے محققین کی راہوں کو اپنے افکار کی تائید میں پیش کیا ہے پھر انہوں نے کتاب کی تاریخی اہمیت کو واضح کیا ہے اور اس کی طرف اشارہ بھی کیا

ہے کہ وہ اس کی تحقیق و ترتیب میں لگے ہوئے ہیں اور عنقریب اسے منظر عام پر لائیں گے۔

(۵) فهرسة المخطوطات العربية كمشكلة ادبية

از استاذ رودلف زلهائم انسٹرکٹر معهد الدراسات الشرقية جامعه فرانکفورٹ

یہ استاذ زلهائم کا ایک لکچر ہے جسے **المجمع العلمی الهندی** کے مجلہ نے شائع کیا ہے اس میں عربی مخطوطات کی فہرست بنانے میں جو مشکلات پیش آتی ہیں ان سے بحث کی ہے اور اس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے کہ بڑے بڑے قابل ذکر مخطوطات کی فہرستیں جو نویں صدی عیسوی میں شائع ہوئیں خاص طور سے برلن کی سرکاری لائبریری میں ولیم اہلوارڈ کی فہرس المخطوطات العربیۃ کی دس جلدوں نے بروکلمن کو ضروری تواریخ، حقائق، موضوعات اور اس کی نادر کتاب کے بڑے حصہ کی تلخیص سے روشناس کرایا اور اسے اپنی طول طویل اور اہم مباحث کے نظام شرح وسط سے تقویت پہنچائی ہے۔

اور برلن لائبریری کے دستاویزات کی طرف رجوع کرنے کی تلقین کی ہے جو بنفسہ خدمات انجام دے رہی ہے اور اسی سے بروکلمن نے اپنی وہ تلخیصات اخذ کئے ہیں جس کے بارے میں مضمون نگار کا کہنا ہے کہ ان میں بسا اوقات ناقص اور غلط معلومات بھی شامل ہو گئی ہیں پھر انہوں نے بعض ایسے نکات سے بحث کی ہے جن کے تحلیل و تجزیہ، ترتیب و تالیف اور حذف و اضافہ کی عربی مخطوطات کی فہرست بنانے میں ضرورت پڑتی ہے۔

آخر میں مجلہ کے ایڈیٹر رقمطراز ہیں:

> اس مضمون کے لکھنے والے استاذ رودلف زلهائم نے برنامج الفہرسۃ الکاملۃ کی پہلی جلد شائع کی ہے اور جرمنی میں موجود مخطوطات کا اسمیں ذکر کیا ہے اور اس بڑی جلد میں ان سے کافی بحث کی ہے۔

المجمع العلمی الهندی کے مجلہ کے موضوعات کی یہ چند جھلکیاں ہیں اس کے چند دیگر مقالات یہ ہیں:

الی الدراسة الاسلامية از استاذ امتیاز علی عرشی

قصة الارز فی الادب العربی. از استاذ ابو محفوظ کریم معصومی

⁂

"محبان وطن کا ایک بھولا بسرا مرکز ـــــــ قافلہ"

ڈاکٹر امتیاز احمد، پٹنہ

مترجم

عبدالروف خاں، اودئی کلاں (راج)

ماضی کے کتنے ہی نشانات وقت کی دبیز گرد کی تہہ میں دبے پڑے ہیں ایسے ہی کچھ جانے انجانے حقائق عظیم آباد (پٹنہ) شہر کے صادقپور محلہ کے اس مقام کے گرد وغبار تلے دبے ہوئے ہیں جہاں ابھی پٹنہ بلدیہ (میونسپل کارپوریشن) کے سٹی سرکل کا صدر دفتر اور مینا بازار واقع ہیں اور جو گذشتہ صدی میں صادق پور کے علمائے کرام کی رہائش گاہ اور ان کی سرگرمیوں کا مرکز رہا۔ ان کی یہ سرگرمیاں اس ہمہ گیر تحریک کا حصہ تھیں جس کی شروعات سید احمد شہیدؒ (۱۷۸۶ء۔۱۸۳۱ء) نے کی تھی۔ اس تحریک کے ذریعہ ایک طرف مسلم معاشرہ کی اصلاح اور دوسری طرف ہندوستان میں برطانوی حکومت کے خاتمہ کی کوششیں کی گئیں۔ ان مساعی میں صادق پوری علماء نے نہایت گرمجوشی اور سرگرمی سے حصہ لیا اس مضمون میں مذکورہ تحریک کا اجمالی تعارف اور صادقپور کے اس مرکز (قافلہ) کا تفصیلی ذکر پیش کیا جارہا ہے۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کی بنیادیں اٹھارویں صدی عیسوی کے مشہور عالم دین حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ / ۱۷۶۲ء) کے خیالات پر استوار تھیں۔ اس وقت ساری دنیا میں مسلمانوں کی حکمرانی انحطاط پذیر تھی۔ ہندوستان میں بھی اس وقت مغل سلطنت کا شیرازہ منتشر ہونے لگا تھا۔ مسلم معاشرہ میں ایسے خیالات ابھر رہے تھے کہ یہ زوال نتیجہ ہے ہماری دینی اور اخلاقی اقدار میں کوتاہی یعنی بے عملی کا۔ چنانچہ مسلم معاشرہ کی نشاۃ ثانیہ کے لئے پھر ایک بار اسلام کے بنیادی عقائد اور اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب دتشویق کی جارہی تھی۔ حضرت سید احمد شہیدؒ رائے بریلوی کی تحریک کے مقاصد بھی اس نوعیت ہی کے نہیں بلکہ یہی تھے۔ انہوں نے توحید پر خصوصی زور دیا، بدعات کو ختم کیا اور جہاد فی سبیل اللہ کی دعوت دی۔

ان کو اس بات کا اندازہ بھی تھا کہ غیر ملک سے آئے ہوئے تاجروں نے ملک پر اپنا تسلط

مضبوط کر لیا اس لئے ایسی غیر ملکی اور بے دینوں کی حکومت کی مخالفت ضروری ہے اپنے نظریات کی اشاعت و تبلیغ کے لئے سید احمد صاحبؒ نے مختلف مقامات کے سفر کئے۔ ۱۸۲۱ء میں وہ پٹنہ بھی آئے اور یہاں صادقپوری خاندان کے بہت سے افراد نے انہیں اپنا امیر تسلیم کیا اور ان سے بیعت کی۔ ۱۸۲۶ء میں سید صاحب شمال مغربی سرحد پر سفر جہاد کے لئے روانہ ہوئے یہاں انہوں نے سرحدی قبائلیوں کے تعاون سے سکھوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو روکنے کی کوشش کی تاکہ وہ اس علاقہ کو انگریزوں کے خلاف جہاد کا ایک مرکز بنا سکیں۔ ۱۸۳۱ء میں معرکہ بالا کوٹ میں سید احمد صاحبؒ نے جام شہادت نوش کیا۔ بعد ازاں ان کی تحریک اور جدوجہد کو صادق پور کے مولوی ولایت علیؒ (متوفی ۵/نومبر ۱۸۵۲ء)[1] اور ان کے بھائی مولوی غازی عنایت علیؒ (متوفی ۲۴ مارچ ۱۸۵۸ء) نیز مولوی یحیٰ علیؒ (متوفی ۱۸۶۸ء) نے جاری رکھا۔ لگ بھگ نصف صدی تک علمائے صادقپور نے اس تحریک میں بہت اہم قائدانہ رول ادا کیا اور اس کی امارت اور صدارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ پٹنہ سٹی میں واقع ان کی رہائش گاہ جو "قافلہ" کہلاتا تھا، اس دعوت و تحریک کا مرکز بنا رہا۔

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ جیسے جیسے انگریزی اقتدار ہندوستان میں وسیع ہوتا جارہا تھا ٹھیک اسی طرح ان کی مخالفت کرنے کے لئے ہندوستانی بھی جوق در جوق مستعد و تیار ہوتے جارہے تھے۔ سید احمد شہیدؒ اور علمائے صادقپور کی جدوجہد اسی طرز عمل کی ایک مثال ہے۔ لیکن اس کی اپنی کچھ خصوصیات تھیں جس کی بناء پر اس تحریک کو برٹش مخالف دیگر تحریکات پر فوقیت حاصل تھی۔ وہ خصوصیات درج ذیل ہیں:۔

پہلی بات یہ کہ انگریزوں کے خلاف اس وقت جو مخالفتیں جاری تھیں ان میں غم و غصہ کا موجب ذاتی مفادات تھے۔ ریاست یا زمینداری یا دیگر مراعات سلب ہو جانے یا انگریزوں کے جور و ظلم اور استحصال سے تنگ آکر "بجنگ آمد" کی پالیسی اختیار کی مگر علماء صادقپور کی لڑائی ان سے جلب منفعت یا کسی ذاتی غرض پر مبنی نہ تھی[2] بلکہ انہوں نے انگریز مخالف رویہ اس لئے اپنایا کہ

[1] قوسین میں سنین وفات راقم الحروف نے درج کئے ہیں۔ ع۔ ر۔ خ

[2] جیسا کہ ہندور لاء کے نام ایک اہم خط سے ثابت ہوتا ہے دیکھئے علماء ہند کا شاندار ماضی۔

برطانوی حکومت میں مسلمانوں کی دینی، معاشرتی اور اخلاقی اصلاح کر سکنا ممکن نہ تھا۔ وہ حکومت اور دولت حاصل کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ مسلم معاشرہ کی فلاح و بہبود کے خواہاں تھے صلہ وستائش کی تمنا سے وہ بالاتر تھے۔

یہ بے غرض جذبہ اور خدمت خلق کے تئیں خود سپردگی اس تحریک کی سب سے عظیم خصوصیت تھی اور اس جدوجہد آزادی میں صادق پور کے علماء نے بڑی سے بڑی قربانی دینے میں کوئی ہچکچاہٹ اور پس وپیش محسوس نہیں کیا۔

دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس تحریک کا ایک مخصوص نظریۂ حیات تھا۔ یہ لائحہ عمل شاہ ولی اللہ دہلویؒ (متوفی ۱۷۶۲ء) سے شروع ہو کر سید احمد تک نشوونما پاتا رہا جسے شاہ اسماعیل شہید (۱۸۳۱ء) اور مولانا عبدالحی (م ۱۸۲۸ء مطابق ۱۲۴۳ھ) نے اپنی تصنیف صراط مستقیم میں پیش کیا۔ اس زمانہ کی برٹش مخالف کسی دیگر تحریک میں ایسا طاقتور نظریۂ عمل (Ideology) کارفرما نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لڑائی کچھ آدرش اور اصولوں کے لئے لڑی گئی تھی نہ کہ ذاتی مفاد کی خاطر۔

تیسرا امر یہ کہ اس تحریک میں عوام الناس کی شرکت وحصہ داری نہایت فعال رہی۔ عوام میں بیداری (Mass Mobilisation) پیدا کرنے اور انہیں اس جدوجہد میں حصہ لینے کے لئے آمادہ کرنے کا کام جتنے بڑے پیمانے پر ہوا وہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ عوام میں حرکت وبیداری پیدا کرنے میں علمائے صادقپور کی کارکردگی نمایاں اور ممتاز تھی اپنے مواعظ اور خطبوں سے انہوں نے اپنے اعلیٰ مقاصد کی اشاعت کی، انگریزوں سے لڑائی لڑنے کے لئے ضروری ساز وسامان مہیا کیا اور اپنے معتقدین سے چندہ کی فراہمی کی جس کے لئے منظم طریق کار اپنایا گیا، ہر ایک خاندان کے افراد ہر ہفتہ اپنا تعاون جنس یا نقدی کی صورت میں پیش کرتا تھا۔ محصل اس نقدی یا جنس کو جمع کرتے تھے اور پھر اسے سرحدی مجاہدین کے پاس بھیجا جاتا تھا۔[1] اس لڑائی کے لئے رضاکار بھی بھرتی کئے جاتے تھے، جن کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تقسیم

---

[1] ہنٹر اپنی تصنیف ہمارے ہندوستانی مسلمان میں لکھتا ہے کہ "... انہوں نے ایک اور ٹیکس بھی مقرر کیا تھا جس سے غریب سے غریب آدمی بھی بچ نہ سکتا تھا۔ انہوں نے حکم دیا کہ ہر خاندان کا مالک کھانا کھاتے وقت اس کے خاندان میں جتنے فرد ہوں اتنے ہی مٹھی بھر چاول علیحدہ کرتا رہے اور ہر جمعہ کے روز گاؤں کے محصل ٹیکس کے حوالے کر دیے اس طرح غلہ کے انبار جمع کر لئے جاتے تھے اور ان کو اعلائے جہاد کے مصرف کے لئے بھیج دیا جاتا"

کر کے سرحدی علاقوں میں روانہ کر دیا جاتا تھا۔ ان تمام کارگذاریوں کا سب سے اہم مرکز علمائے صادقپور کی رہائش گاہ تھی، جسے قافلہ کہا جاتا تھا۔

چوتھی بات یہ کہ اس تحریک کے قائدین نے انگریزوں کی مخالفت کے لئے کچھ ایسے طریق کار استعمال کئے جن پر گاندھی جی نے بھی قومی "آندولن" میں عمل کیا۔ واضح ہو کہ اسی تحریک کے رہنماؤں نے سب سے پہلے انگریزی اسکولوں اور عدالتوں کا بائیکاٹ (Boycott) کیا تھا۔ جس کا استعمال گاندھی جی نے ۲۲۔۱۹۲۱ء کی عدم تعاون تحریک میں کیا۔ مشہور قومی لیڈر سریندر ناتھ بنرجی نے اپنی ایک تقریر میں اس تحریک کے چندہ جمع کرنے کے طریق کار کو (قومی مومنٹ کے زمانہ میں) اپنانے کا مشورہ دیا تھا[1]۔

پانچویں بات یہ کہ اس کے قائدین و خلفاء نے پہلی بار اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھا کہ ہندوستان میں انگریزوں کی قوت کا سب سے بڑا سہارا ہندوستانی فوج (Native Army) ہے یعنی وہ فوج جسے انگریزوں نے ہندوستانیوں کو بھرتی کر کے تیار کی تھی۔ اگر ان ہندوستانی فوجیوں کو انگریزوں کے خلاف ابھارا جاسکتا تو اس سے انگریزوں کے لئے کافی دقت کھڑی ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے راجگان کو بھی اگر برطانیہ مخالف کارروائیوں میں اپنا معاون کر لیا جاتا تو انگریزوں کی حالت بہت خراب ہو جاتی۔ اس لئے ان قائدین نے حیدر آباد، گوالیار اور ٹونک[2] جیسی ریاستوں کے حکمرانوں کو اپنے مشن میں شامل کرنے کی کوششیں کیں۔ صادق پور کے مولانا ولایت علیؒ نے آخری مغل تاجدار ہند بہادر شاہ ظفر سے بھی ملاقات کی تھی، کئی فوجی چھاؤنیوں میں اس تحریک کے مبلغ سرگرم کار تھے، جو ہندوستانی فوجیوں کو انگریزوں کے خلاف

---

[1] بقول شاعر: بلبل کو ہوش گل تھا، نہ قمری کو عشق سرد　　یہ سارے گل کھلائے ہوئے باغباں کے ہیں

[2] گوالیار کا راجہ دولت راؤ سندھیا حضرت سید صاحب کا ارادت مند تھا۔ سید صاحب جب گوالیار پہنچے تو بیوہ مہارانی کا بھائی راجہ ہندو راؤ زمام حکومت سنبھالے ہوئے تھا۔ یہ ایک مدت سے سید صاحب کا معتقد تھا۔ چنانچہ ہندو راؤ سندھیا نے حضرت سید احمد کا پرجوش و پر خلوص خیر مقدم کیا اور سید صاحب کو فتح علی خاں کے باغ میں ٹھہرایا۔ کئی روز پر تکلف ضیافتیں کیں۔ سید صاحب اور بعض بلند پایہ ساتھیوں کے ہاتھ راجہ ہندو راؤ خود دھلواتا تھا۔ یہاں سے سید صاحب نے قرولی (راجستھان) کے رئیس جلال الدین صاحب کے اصرار پر ایک رات قیام فرمایا اور پھر "خوشحال گڈھ" (موجودہ گنگاپور سٹی) ہوتے ہوئے ٹونک تشریف لے گئے۔ برائے تفصیلات ملاحظہ ہو: "علماء ہند کا شاندار ماضی، ج ۲ ص ۱۸۲ تا ۱۹۰" مصنفہ مولانا سید محمد میاں صاحبؒ۔

ابھارتے تھے۔ پنجاب کے بعض علاقوں میں ان مساعی کے واضح نتائج بھی برآمد ہوئے۔ (سبھاش چندر بوس نے آزاد ہند فوج بھی اس طرح بنائی تھی۔ رؤف) اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کارگذاریوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی راہ ہموار کرنے میں بڑی مدد پہنچائی تھی[1]۔ یہ امر بھی ناقابل فراموش ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں کئی مقامات پر اسی تحریک کے مجاہدین نے قیادت بھی کی تھی۔ دلی میں جنرل بخت خاں[2] کی قیادت اس کی شاندار مثال ہے۔

آخری بات یہ کہ یہ تحریک ہندوستان کے وسیع علاقے پر ایک طویل مدت تک محیط رہی اور تقریباً نصف صدی (۱۸۲۹ء سے ۱۸۸۰ء تک) ہندوستان گیر پیمانہ پر جاری رہی۔ اور سرحد سے بنگال تک نیز پنجاب سے مدراس تک اس کے اثرات مرتب رہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے قبل اتنے وسیع ترین علاقے میں پھیلی کسی اور تحریک آزادی کی مثال ہندوستان میں ہمیں نہیں ملتی۔ (لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ واقع ہوئی اور ختم بھی ہوگئی اور نہ یہ کوئی اثرات ہی چھوڑ سکی) یہ بھی واضح رہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی مدت بھی بہت قلیل تھی۔

وطن عزیز ہندوستان کو برطانوی قبضہ سے آزاد کرانے اور استخلاص کی اس عظیم اور بے مثال جدوجہد کا سب سے اہم مرکز پٹنہ کا "قافلہ یعنی علمائے صادقپور کی رہائش گاہ تھی۔ اس کے محل وقوع وغیرہ کے بارے میں انگریز مورخ اور انڈین سول سروس کا افسر سر ولیم ولسن ہنٹر اپنی تصنیف "The Indian Musalmans" (ہمارے ہندوستانی مسلمان) جو اس تحریک پر پہلی مستند تصنیف ہے میں لکھتا ہے:

"پٹنہ کے قدیم شہر کے مسلم محلہ میں ایک گلی ہے جسے صادق پور گلی کہتے ہیں، جہاں مسافروں کی کافی چہل پہل رہتی ہے۔ اس گلی کے بائیں جانب مسلم طرز تعمیر کی کئی عمارات ہیں جن کے سامنے وسیع برآمدے ہیں، ان کا سلسلہ گلی میں پیچھے کی جانب بھی کافی دور تک چلا گیا ہے۔ اپنی ظاہری صورت میں ان کا منظر ویسا ہی حسرت ناک اور ویرانی کا ہے جو ہندوستان کی ہر اینٹ چونے کی عمارت کا برسات کے مہینوں کے بعد ہو جاتا ہے۔ یہ مشرق کے متعلق ہمارے

---

[1] دعائیں دیں مرے بعد آنے والے میری وحشت کو بہت کانٹے نکل آئے مرے ہمراہ منزل سے

[2] جنرل بخت خاں کے تحقیقی حالات کے لئے دیکھئے علماء ہند کا شاندار ماضی جلد ۴ ص ۲۵۵ تا ۲۶۱۔

عظیم الشان تصور کا کیسا حقیر جواب ہے۔ اس تمام عمارت میں سب سے اہم ایک معمولی سی مسجد ہے جس کا اندرونی حصہ بہت سادہ ہے اس میں روزانہ (پانچ وقت) نماز باجماعت ادا کی جاتی ہے اور جمعہ کے دن خطبہ و تقریر بھی ہوتی ہے۔ صادق پور کی مسجد کے خطبے (شہر کی) دوسری مساجد کے خطبوں سے جداگانہ نوعیت کے ہوتے ہیں، صادق پور کی مسجد کے خطبے اور وعظ بڑے ولولہ انگیز ہوتے ہیں جن میں بتلایا جاتا ہے کہ ایمان و عقیدہ کے بغیر ہر فعل بے سود ہے۔ سامعین کو آگاہ کیا جاتا کہ اعمال صالحہ و ثابتہ کے بغیر کیا روحانی خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔ سامعین کو روحانی زندگی بسر کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ یہ حضرات ان لوگوں کی مخالفت کرتے ہیں جو پیغمبر اسلام ﷺ کے عہد کی سادہ عبادات کے مقابلے میں مختلف تکلیف دہ مراسم (بدعات) اور لا تعداد نقالیوں اور بہروپیے پن کے ساتھ مساجد میں رکوع و سجود کرتے نیز جو محض من گھڑت سنی سنائی باتوں پر عمل کرتے اور (قرآن و حدیث میں) منقولہ احکام کی خلاف ورزی۔ شہر کی دیگر مساجد کے مولوی محلہ صادق پور کے واعظین کے تبحر علم اور فصاحت و بلاغت کی تعریف کرنے پر تو مجبور تھے مگر اس بنا پر معترض تھے کہ وہ متبرک روایات کے منکر، سخت موحد اور تفرقہ انداز واقع ہوئے ہیں۔ اس اصلاحی فلسفہ کا مطالعہ کرنے والے طلبہ کا ایک مدرسہ ہے اور کئی مزار ہیں جن میں "وہابی" مصلحین کی ہڈیاں مدفون ہیں۔"

اس قافلہ میں انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی کرنے والے مجاہدین جمع ہوتے تھے۔ وہاں جو رضاکار آتے ان میں ہونہار نوجوانوں کو اسلامی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی تاکہ وہ دین کے داعی بن سکیں اور دیگر رضاکاروں کو دین کی ضروری اور بنیادی تعلیم دے کر سرحدی علاقے میں جہاد کے لئے بھیجدیا جاتا تھا۔ یہ سارا کام ایک رہنما کی نگرانی میں انجام پاتا تھا جسے "خلیفہ" کہتے تھے۔ اس کی مدد کے لئے ایک مشاورتی کمیٹی ہوتی تھی۔ ان خلفاء میں سید محمد حسین، ولایت علی (م ۱۸۵۲ء) فرحت حسین (م ۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۸ء) یحییٰ علی (م ۱۸۶۸ء) احمد اللہ (م ۱۸۸۱ء) مبارک علی، محمد حسن اور عبدالرحیم (م ۱۹۲۳ء) کے نام قابل ذکر ہیں۔

جب انگریز حکومت نے سرحدی علاقے میں حالات پر قابو پالیا تو اس تحریک کو کچل دینے کی کارروائی بڑے پیمانے پر شروع کر دی۔ ۱۸۶۵ء میں پٹنہ میں "وہابی" رہنماؤں پر مقدمہ چلایا

گیا۔ مولوی احمد اللہ کو عمر قید کی سزا دے کر کالا پانی (جزائر انڈمان) بھیج دیا گیا، جہاں وہ ۱۸۸۱ء میں وفات پاگئے اور "وائی پر" جزیرہ میں "ڈنڈاس" پوائنٹ (Dundas Piont on the Viper Island) میں دفن کردئے گئے۔ پٹنہ میں "وہابی[1]" قائدین کی ساری جائداد ضبط کرلی گئی۔ انگریز سرکار نے اسے فروخت کر کے ایک لاکھ اکیس ہزار نو سو چوراسی روپے چار آنے اور ایک پائی کی رقم حاصل کی۔ اور اس مقام پر جہاں علمائے صادق پور کے مکانات تھے ۱۸۶۹ء میں پٹنہ بلدیہ (میونسپل کارپوریشن) کی عمارت تعمیر کرادی گئی اور اس کے آس پاس ایک بازار بنادیا گیا جس کی دکانوں سے تیس ہزار روپے سالانہ کا اندازہ تھا۔ پٹنہ سٹی ریلوے اسٹیشن سے پٹنہ گھاٹ اسٹیشن تک ایک سڑک بنائی گئی جس کی تعمیر پر تیس ہزار روپیہ صرف ہوئے یہ تمام روپیہ علمائے صادق پور کی ضبط شدہ جائداد (کی قیمت) سے لیا گیا۔ اس کے علاوہ تیس ہزار روپے پٹنہ کالج کی عمارت کو وسیع کرنے اور مرمت کرانے پر صرف کئے گئے۔ پٹنہ کالج کی قدیم اور اصل عمارت کا لکڑی کا زینہ بھی بنوایا گیا۔

سرکاری مظالم کی حد یہ ہوئی کہ صادق پوری علما کے اسلاف کی قبروں کو بھی مسمار کردیا گیا۔ کئی سال بعد جب مولوی عبدالرحیم جزائر انڈمان سے رہا (۱۸۸۳ء میں) ہو کر واپس پٹنہ آئے اور اس جگہ کو دیکھا تو ان کے رنج والم کی کوئی انتہا نہ رہی۔ مولانا عبدالرحیم صاحب اپنی تصنیف "تذکرۂ صادقہ" میں لکھتے ہیں:

"اپنے مُردوں کے ساتھ یہ سلوک دیکھ کر صدمہ کے احساس کو الفاظ میں ظاہر کرنا دشوار

---

[1] اس مضمون میں دو تین جگہ لفظ "وہابی" کا استعمال ہوا ہے جو عرف عام میں، مگر غلط طور پر حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد پر منطبق کردیا جاتا ہے۔ اس لفظ کا بطور تضحیک پہلی مرتبہ استعمال فضل رسول بدایونی نے کیا تھا اور ولیم ولسن ہنٹر نے اپنی مشہور تصنیف "ہمارے ہندوستانی مسلمان" میں اس لفظ کا بار بار استعمال کیا جو محض سیاسی مصلحت کی بنا پر تھا۔ جبکہ محمد بن عبدالوہاب نجدی کا ۱۷۹۲ء میں انتقال ہو چکا تھا اور سید صاحب ادائگی حج کے بعد اکتوبر ۱۸۲۳ء کو واپس ہندوستان تشریف لائے اور جولائی ۱۸۲۲ء حج ادا کرنے گئے تھے۔ البتہ دونوں تحریکوں میں کچھ مماثلت پائی جاتی ہے۔ مگر آخر الذکر تحریک اول الذکر تحریک کے بعد [illegible] اس تضحیک آمیز [illegible] کے لئے ڈاکٹر قیام الدین احمد مرحوم کی [illegible] تصنیف The Wahabi Movement in India کا پیش لفظ، مولانا مسعود عالم ندوی کی کتاب "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" اور مولانا سید محمد میاں کی مشہور تصنیف علماء ہند کا شاندار ماضی جلد دوم ملاحظہ فرمائی جائیں۔

ہے۔ آج تک اسے یاد کر کے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ہمارے اسلاف کی قبریں کیوں کھود ڈالی گئیں اور ہماری "عادل" حکومت نے اس طرح کی حرکت کیوں کی؟

لیکن اس سے بھی زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ آج استخلاص وطن (آزادی ملک) کو پچاس سال گزر گئے لیکن اس جگہ پر جو کبھی انگریزوں کے خلاف آزادی کی لڑائی کا عظیم مرکز تھا، کوئی یادگار، کوئی نشان تک وطن پر مٹنے والی ان عظیم ہستیوں کی نہیں ہے۔ افسوس کہ ہم سب نے انہیں فراموش کر دیا۔

ڈاکٹر وجیہ الدین
شعبہ فارسی ایم ایس یونیورسٹی، بڑودا، گجرات

صفوی عہد سیاسی، تمدنی، اقتصادی اور فنی اعتبار سے ایران کی تاریخ کا ایک اہم دور ہے۔ لیکن علم وادب کی ترقی کے لحاظ سے بہت زیادہ اہم نہیں، خاص طور سے فارسی زبان وادب کے لئے۔ اس کی چند وجوہات ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ صفوی سلاطین نے فارسی کے بجائے ترکی زبان میں زیادہ دلچسپی لی اور اس پر خاص توجہ دی اس عہد میں دیوانی، درباری اور فوج کی اصطلاحیں عام طور پر ترکی تھیں اور سرکاری افسر ترکی زبان کو بول چال میں استعمال کرتے تھے۔ حتیٰ کہ صفوی خاندان کے بانی، شاہ اسماعیل صفوی متخلص بہ خطائی، نے ترکی زبان میں اپنا دیوان یادگار چھوڑا ہے۔[1]

صفوی دور سے پہلے تک ایران کی درباری اور سرکاری زبان فارسی تھی۔ حتیٰ کہ ترک سردار جنہوں نے وہاں حکومت کی اپنے دربار میں فارسی زبان میں گفتگو کرتے تھے، لیکن جب حکومت صفوی خاندان کے ہاتھوں میں آئی تو وہ ترکوں کی خوشنودی کے لئے ان کی زبان میں بات چیت کرنے لگے۔ صفویوں نے ترکی زبان کو درباری زبان بنایا حتیٰ کہ اپنے مذہب کی تبلیغ بھی ترکی زبان ہی میں کرنے لگے۔ ترکی زبان کے شعراء کی حوصلہ افزائی کی جاتی اور فارسی کے شعراء کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی۔[2] ائمہ اطہار کی شان میں کہے گئے قصائد اور مراثی کے علاوہ ان کے باقی ماندہ کلام کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا۔

فارسی ادب کی نشو ونما میں بادشاہوں اور امیروں کی سرپرستی کا ایک خاص رول رہا ہے

شعراء نئے نئے پیرایوں میں شاعری کرتے اور اور بادشاہوں سے داد و انعام حاصل کرتے۔ دربار اور شعراء کے درمیان یہ رشتہ فارسی ادب کی ترقی میں ایک اہم کردار ادا کرتا رہا ہے۔ لیکن اس کے برخلاف اس دور میں فارسی ادب کی دربار والوں کی سرپرستی سے محرومی کے نتیجے میں فارسی شاعری کا رابطہ دربار سے بالکل منقطع ہو گیا اور اس کا تمام تر تعلق صرف عوام سے رہ گیا۔(۳)

دوسرے یہ کہ اس عہد کی شاعری میں صنف مرثیہ اور مدح ائمہ کرام پر خاص توجہ دی گئی۔ یہ تحریک صفوی بادشاہوں کی مذہبی سیاست کا فطری اور لازمی نتیجہ تھی۔ اس خاندان کے حکمرانوں نے ملک پر اقتدار پاتے ہی ایران میں تشیع کی ترویج و ترقی کے لئے بہت زیادہ کوشش کیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں مذہبی علوم خاص طور سے شیعی فقہ و حدیث کو بہت ترقی ہوئی۔ ان علوم کے ماہر اور بڑے بڑے عالم و فاضل پیدا ہوئے۔ اس دور میں مرثیے اور ائمہ کرام کی مدح میں قصیدے کثرت سے لکھے گئے۔ یہ مذہبی سیاست بھی اس دور کے شاعروں کی فکر اور فارسی شاعری پر اثر انداز ہوئی۔(۴)

اس مذہبی سیاست اور طرز عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایران کے اچھے اچھے غزل گو شاعر مثنوی نگار اور داستان سرا شاعر یا تو دربار سے کنارہ کش ہو گئے یا پھر ہندوستان کے مغلیہ دربار میں چلے گئے۔ ہندوستان کا سیاسی و سماجی ماحول مذہبی تعصب سے عاری تھا اور یہاں کے مغل سلاطین و امراء نے ان کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا اور ان کی استعداد کے مطابق ان کو نوازا۔ ہندوستان میں مغل شہنشاہوں کی اس توجہ اور دلچسپی کی بنا پر فارسی زبان و ادب بالخصوص فارسی شاعری نے بہت ترقی کی۔ اس سلسلے میں ان امراء کی معاونت اور دلچسپی سے بہت اہمیت رکھتی ہے، جو یا تو ایرانی النسل تھے یا ہندوستانی ہونے کے باوجود ایرانی تہذیب و تمدن میں رچے بسے تھے اور فارسی شعر و شاعری کا عمدہ ذوق بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ ایران سے بہت بڑی تعداد میں شعراء نے ہندوستان کا رخ کیا ایران سے ہندوستان آنے والے اہم شعراء میں ایک نام والہ ہروی کا بھی ہے جو جہانگیر کے عہد میں ہندوستان آیا۔

والہ ہروی کا پورا نام درویش حسین والہ ہروی تھا، اس کے والد کا نام شیخ غلام علی تھا، جس کا ذکر اس نے اپنے ان اشعار میں کیا ہے ؎

امام صومعہ شیخ جہاں غلام علی
بفر فقر بری زاحتیاج امکانی
ستودہ والا وشایستہ مرشد والہ
وجود آگہی و معنی مسلمانی[۵]

والہ فصیحی ہروی انصاری کا شاگرد تھا[۶] اس نے اپنے استاد کی تعریف اپنے دیوان میں جا بجا کی ہے، والہ کے تین فرزند تھے ان تین فرزندوں میں سے پہلے کی پیدائش ۱۰۴۰ھ مطابق ۱۶۳۰ء میں ہوئی اس کا نام محی الدین تھا اور ایک فرزند ۱۰۴۲ھ مطابق ۱۶۳۲ء میں متولد ہوا اس کا نام والہ نے اپنے والد کے نام پر غلام علی رکھا تھا، ان تین فرزندوں میں سے منجھلے کا کردار قابل ستائش نہ تھا۔ اسی وجہ سے غالباً اس سے ناراض رہتا تھا[۷]۔

محی الدین کی پیدائش کے موقع پر جو ۱۰۴۰ھ میں ہوئی تھی والہ نے تاریخی قطعہ کہا تھا۔ بقول والہ اس وقت خود اس کی عمر پچاس سال تھی۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ والہ کی ولادت ۹۹۰ھ مطابق ۱۵۸۲ء کے آس پاس ہوئی ہو گی[۸]۔

"صحف ابراہیم" کے مصنف کے مطابق والہ شاہ جہاں کے عہد میں ہندوستان آیا[۹] مگر یہ درست نہیں معلوم ہوتا، بلکہ اس کے برعکس والہ کے دیوان میں موجود متعدد اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ جہانگیر کے دور حکومت ہی میں ہندوستان آگیا تھا۔ ان اشعار میں سے ایک شعر درج ذیل ہے۔

خسرو ملک خدا فرمانروای بحر و بر
شاہ نور الدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ[۱۰]

والہ کا قیام کچھ دنوں بنارس میں رہا۔ بعد ازاں وہ وہاں سے حاکم بنگال کی دعوت پر بنگال چلا گیا۔ جہاں اس کی ملاقات بیدل سے متعدد بار ہوئی اس کی تائید بیدل کے "چہار عنصر" نیز تذکرہ "کلمات الشعراء" اور "صحف ابراہیم" سے بھی ہوتی ہے[۱۱]۔

والہ نے جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد کے بہت سے واقعات کی جو ۱۰۲۴-۱۰۷۵ھ کے درمیان رونما ہوئے تاریخی بھی کہی ہے اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کم از کم والہ ۱۰۷۵ھ تک

حیات تھا[۱۲] یعنی اس نے ۸۵ سال سے زیادہ کی عمر پائی۔

واؔلہ نے جہانگیر اور شاہجہاں کی تعریف میں قصائد لکھنے کے علاوہ اپنے استاد فصیحی ہروی، والد شیخ غلام علی، باقر خاں[۱۳] اور اعتماد الدولہ[۱۴] کے ساتھ ساتھ جہانگیر اور شاہ جہاں کے دربار کے دوسرے متعدد امراء کی تعریف میں بھی قصائد لکھے ہیں۔ ترکیب بند عام طور سے مرزا جان[۱۵] بیگ کی تعریف میں ہیں۔ معتقد خاں کی تعریف میں بھی ترجیع بند لکھے ہیں اور چند ہجویہ قطعات بھی اس کے دیوان میں ملتے ہیں۔

بانکی پور کیٹلاگ کے ایک خطی نسخہ کے مطابق واؔلہ کے دیوان میں قصائد، ترجیع بند، ترکیب بند، قطعات اور غزلیات کے علاوہ ۱۱۲ رباعیات بھی شامل ہیں[۱۶]۔ واؔلہ نے ایک مثنوی بھی خاقانی کی مثنوی تحفۃ العراقین کے تتبع میں لکھی ہے[۱۷]۔

واؔلہ کے دیوان کے خطی نسخے مختلف لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری بانکی پور میں اس کے دیوان کا خطی نسخہ موجود ہے۔ راقم کی معلومات کی حد تک اس کا دیوان ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی تدوین و تصحیح کر کے اس کو شائع کیا جائے۔

واؔلہ کی دو رباعیات بطور نمونہ ذیل میں درج کی جاتی ہیں ۔

یا رب زکرم عنایت چشم تری
از خود سفری زغیر قطع نظری
بر غفلت ما زھوشیاری حشری
در بیخبری گمیم از ما خبری

در دیدہ حیائی نبود دنیارا
در وعدہ ادائی نبود فردا را
گوش شنوا نیست نگویم کہ کرند
گر کام وزبانی بدھم غوغا را[۱۸]

حواشی و مآخذ

(۱) ذبیح اللہ صفا، مختصری در تاریخ تحول نظم و نثر پارسی، چودھواں ایڈیشن، ۱۳۷۳ھ، ش، تہران، صفحہ ۷۶۔

(۲) اصغر حیدری، آذربائیجان کی سرزمین پر تاریخی نظر، مشمولہ، مجلہ ایران شناسی، شمارہ نمبر ۴/۲، ۱۹۹۶ء لاہور، صفحہ ۳۳۔

(۳) ذبیح اللہ صفا، ایضاً، ص ۷۷۔

(۴) ایضاً، ص ۷۸

(۵) مولوی عبدالمقتدر خان، عربی و فارسی مخطوطات کی فہرست، اورینٹل پبلک لائبریری، بانکی پور، جلد سوم، ۱۹۱۲ء لنڈن، ص ۱۲۲۔

(۶) فصیحی انصاری الہروی خراسان کا ملک الشعراء تھا اس کے تین شاگرد تھے والہ ہروی (جس کا ذکر اوپر آچکا ہے) ناظم ہروی (وفات ۱۰۸۱ھ) اور جلال اسیر اصفہانی (وفات ۱۰۴۹ھ) ناظم ہروی، عباس قلی خاں شاملو کے دربار کا شاعر تھا جو ہرات کا بیگلر بیگی تھا۔ جلال اسیر ایران میں رہا یہ شاہ عباس اوّل کا داماد تھا اور مشہد میں حضرت امام رضا کے روضہ کا متولی تھا، زلالی خوانساری جلال اسیر کا شاگرد تھا جسے شاہ عباس اوّل کے ملک الشعراء ہونے کا شرف حاصل تھا۔

(مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: (۱) نبی ہادی، ڈکشنری آف انڈو پرشن لٹریچر، ص ۱۵۔ ۶۱۴ (۲) عبدالمقتدر خاں، ایضاً، ص ۷۰، (۳) نصر اللہ فلسفی، زندگانی شاہ عباس اول، جلد دوم، تہران، ۱۳۴۷ھ ش، ص ۲۰۲ (۴) تذکرہ شعرائے خوانسار، یوسف بخشی، تہران، ۱۳۳۶ھ، ص ۶۶۔

(۷) مولوی عبدالمقتدر خاں، ایضاً، ص ۱۲۳۔

(۸) ایضاً، ص ۱۲۳

(۹) علی ابراہیم خاں خلیل، تذکرہ صحف ابراہیم، تصحیح و ترتیب عابد رضا بیدار، پٹنہ، ۱۹۷۸ء ص ۱۳۶۔

(۱۰) مولوی عبدالمقتدر خاں، ایضاً، ص ۱۲۳۔

(۱۱) نبی ھادی، ڈکشنری آف انڈو پرشن لٹریچر، دہلی، ۱۹۹۵ء۔ ص ۱۵۔ ۶۱۴، محمد افضل سرخوش، تذکرہ کلمات الشعراء، ص ۱۲۳۔ صحف ابراہیم، ص ۱۳۶۔

(۱۲) مولوی عبدالمقتدر خاں، ایضاً، ص ۱۲۳۔

(۱۳) باقر خاں نجم ثانی:۔ کا سلسلہ نسب مرزا یار احمد اصفہانی سے ملتا ہے باقر خاں، میر نجم گیلانی جو شاہ اسماعیل صفوی کے وکیل السلطنت تھے ان کی صحبت میں رہا، میر نجم گیلانی کی وفات کے بعد بادشاہ وقت نے اس کو عہدہ وکالت پر فائز کیا اور نجم ثانی کا خطاب عطا کیا جس کے باعث وہ دوسرے امرائے عظام سے بالاتر سمجھے گئے بعد میں وہ ہندوستان آیا اور اکبر بادشاہ کی ملازمت اختیار کی سہ صدی منصب پر فائز ہوا، جو بعد میں بڑھا کر اکبر نے نو سو کر دیا۔ اس کی شادی نور جہاں کی بہن خدیجہ بیگم کی لڑکی سے ہوئی۔ جس نے اس کی قسمت ہی بدل دی۔ دو ہزاری منصب پر حاکم ملتان مقرر ہوا اور اچھا حاکم ثابت ہوا۔ ملتان کو باقر آباد کے نام سے بھی جانا جانے لگا۔ جہانگیر نے اس کو فرزند کے خطاب سے نوازا اور شاہزادہ شاہ جہاں کے زمانے میں اودھ کا صوبہ دار مقرر ہوا۔ جہانگیر کے آخری دنوں میں اڑیسہ کا صوبہ دار بنا۔ مگر رعایا سے بد سلوکی کی وجہ سے اس کو وہاں سے بعد میں معزول کیا گیا۔ شاہ جہاں کے چھٹے سن جلوس میں گجرات کی صوبہ داری بخشی گئی اور اس کے بعد الٰہ آباد کا صوبہ دار ہوا۔ وہیں اس نے ۱۰۴۷ھ میں وفات پائی۔ (شاہ نواز خاں، مآثر الامراء، تصحیح مولوی عبدالرحیم جلد اول، ایشیاٹک سوسائٹی، بنگال، کلکتہ، ۱۸۸۸ء ص ۱۱۔۴۰۸)

(۱۴) مرزا غیاث بیگ طہرانی، جو ہندوستان میں اعتماد الدولہ کے خطاب سے نوازے گئے، خواجہ محمد شریف کے فرزند تھے۔ ان کے والد مختلف ایرانی سلاطین کی سرکاروں میں ممتاز عہدوں پر فائز رہے۔ شاہ طہماسپ نے بھی ان کو نوازا اور اصفہان کی وزارت تفویض کی۔ اکبر کے زمانے میں ہندوستان آئے۔ اکبر نے ان کو سہ صدی منصب دیا اور کابل کی دیوانی پر فائز کیا۔ ان کی لڑکی مہر النساء کی شادی بعد میں جہانگیر سے ہوئی۔ اس کے بعد وہ چھ ہزاری منصب پر فائز ہوئے اور علم و نقارہ عطا ہو۔ ۱۰۳۱ھ میں انہوں نے وفات پائی۔ جہاں گیر کے عہد میں وہ وکالت کل پر فائض تھے اور اس عہد کے ممتاز ترین امراء میں تھے۔ (مآثر الامراء۔ جلد اول، ص ۱۳۱۔۱۲۷)

(۱۵) مرزا جان بیگ۔ جہانگیر کے وزیر الملک تھے اور بعد میں اعتماد الدولہ کو بھی مرزا جان بیگ کے ساتھ عہدہ دیوانی پر ساتھ شریک کر دیا تھا۔ (مآثر الامراء، جلد اول، ص ۱۲۹)

(۱۶) عبدالمقتدر خاں، ایضاً، ص ۱۲۵۔۱۲۴)

(۱۷) علی ابراہیم خاں خلیل، صحف ابراہیم، ص ۱۳۶۔

(۱۸) عبدالمقتدر خاں، ایضاً، ص ۱۲۵۔

ماخوذ: الرائد الہند، ۲۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۹ھ قسط ۱

یوگینڈا میں اسلام اور مسلمان

اندرونی و بیرونی چیلنجوں کے آئینے میں

از ـــــ کلیم صفات اصلاحی

وجہ تسمیہ:

تاریخوں میں یوگینڈا کی وجہ تسمیہ کے باب میں مختلف (متعدد) بیانات مذکور ہیں۔ مملکت بوگنڈا سے یوگینڈا کے تعلق وانتساب کی بناء پر برطانیہ نے اس کا نام یوگینڈا رکھا۔ جو برطانوی اتحاد سے قبل بوگنڈا کا ایک جزء تھا۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ در حقیقت لفظ یوگینڈا البانتو زبان کے لفظ غاند سے مشتق ہے۔ جس کے معنی قبیلہ غاند کے ہیں۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ مشرقی افریقہ کے سواحل کے قدیم (ابتدائی) مفتشین نے دیکھا کہ سواحل کے باشندوں میں لفظ کے شروع میں "او" لگانے کا عام رواج ہے۔ اس لئے انہوں نے اس کو اوگنڈا کے نام سے موسوم کردیا۔

مذکورہ بالا دونوں بیانات سے ثابت ہو جاتا ہے کہ یوگینڈا اس ملک کا مقامی نام ہے۔ یورپ کا عطا کردہ نہیں ہے۔

جائے وقوع اور رقبہ

یوگینڈا براعظم افریقہ کے مشرق وسطی میں واقع ہے اس کے پڑوس میں پانچ ممالک ہیں۔ مغرب میں زائیریا، مشرق میں کینیا، شمال میں سوڈان، جنوب میں تنزانیا اور رانڈا ہیں۔ یوگینڈا کا کل رقبہ ۲۴۳۴۱۰ کیلو میٹر مربع میل ہے۔ جس کا ۵٪ حصہ پانی کے چشموں سے ڈھکا ہوا ہے۔

باشندے اور ان کی تعداد

یہاں کے باشندے افارقہ ہیں جو البانتو، نیلیین اور لودا کے قبائل سے منسوب ہیں۔ ان کی

کل تعداد ۱۷ر لاکھ ہے۔ جن میں ۳۵ سے ۴۵٪ مسلمانوں کی آبادی ہے۔

موسم (آب وہوا)

انتہائی بلندی پر واقع ہونے، سال بھر مسلسل بارش ہونے اور چشموں کی کثرت سے یوگینڈا کا درجہ حرارت ۲۷٪ سے زائد نہیں ہوپاتا۔ غالباً وہاں کے موسم کی خنکی اور خوشگواری کا راز یہی ہے۔

اہم شہر

یوگینڈا کے اہم شہروں میں راجدھانی کمپالا ہے جو تجارتی اعتبار سے کافی اہم ہے، عنتیبی کی جاذبیت بھی اہمیت کی حامل ہے۔ اور اسی شہر میں ملکی ہوائی اڈہ (ایرپورٹ) ہے۔ جنجا یوگینڈا کا صنعتی شہر ہونے کی وجہ سے قابل توجہ ہے۔ دریائے نیل یہیں سے نکل کر پورے عالم کے اطراف کو سیراب کئے ہوئے ہے۔ امپالا کی خوبصورتی بھی یوگینڈا کی دلکشی میں اضافہ کرتی ہے۔ اور اسی شہر میں ۱۹۸۸ء میں جامعہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا۔

خود مختاری

۱۸۹۰ء میں یوگینڈا برطانوی سامراج کے زیر نگیں آیا۔ اور ۷۲ر سال تک اس کے پنجہ استبداد میں جکڑا رہا۔ بالآخر ۱۹۶۲ء میں اس نے پروانۂ خود مختاری حاصل کرلی۔

یوگینڈا میں شمعِ اسلام[1] کی ضیاپاشی

یوں تو براعظم افریقہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ہی نور اسلام سے آشنا ہوچکا تھا۔ تاہم یوگینڈا میں اس کی کرنیں ۱۸۴۰ء میں داخل ہوئیں۔ اس وقت یوگینڈا کی سرزمین بت پرستی اور باطل عقائد کی آلائشوں کی آماجگاہ تھی۔ اور اب تک وہاں کوئی بھی آسمانی دین نہیں پہونچا تھا۔ صدیوں سے وہاں کے باشندوں میں رچی بسی بد عقیدگیوں کو نکال کر انہیں عقیدۂ توحید (یعنی خدا پرستی) کی طرف مائل کرنا چٹان سے جوئے شیر نکالنے کے مترادف تھا۔ تاہم مذہب اسلام کی

[1] شمع اسلام سے مراد مذہب اسلام ہے۔

طرح سچائی، خصوصیت اور جاذبیت نے وہاں کے باشندوں کو بھی اپنا گرویدہ بنالیا۔

براعظم افریقہ کے اکثر ممالک میں اشاعت اسلام کی برق رفتاری کی بناء پر وہاں کی اکثریت مسلمان ہو گئی۔ ان کی ۷۵٪ تعداد ہونے کی وجہ سے یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ براعظم افریقہ، اعداد وشمار کے لحاظ سے اسلامی براعظم ہے۔

افریقہ دنیا کے پانچ براعظموں میں درمیانی (وسطی) براعظم ہے۔ عین ممکن ہے کہ دنیا کے دوسرے براعظموں میں علم، معرفت، تہذیب وثقافت، حرفت وتجارت اور دوسری انسانی ضروریات کے منتقل ہونے کا یہی براعظم افریقہ نکتہ اتصال ہو۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہاں کی اکثر زمینیں سرسبز وشاداب ہیں۔ اگر وہاں کی پوری آراضی میں صحیح ڈھنگ سے کاشت کاری کی جائے تو دنیا بھر میں وہاں کی پیداوار سے غربت وافلاس کم ہو جائے۔

یوگینڈا میں اسلام پہونچنے کے دو بنیادی ذرائع ہیں۔ ایک عرب تاجر اور وہ مسلمان ہیں جو مشرقی افریقہ سے نہبانیوں اور حبشہ میں اسلامی حکومت کے زمانہ میں یہاں آئے۔ زنجبار میں بنی سعد کی حکومت کے قیام کے بعد یہ لوگ ۱۸۴۴ء میں یوگینڈا میں داخل ہوئے۔ ان میں سب سے پہلے پہونچنے والے بزرگ احمد بن ابراہیم عمر نامی تھے۔ اس وقت یہاں شاہ سونا ثانی کی حکومت تھی۔ یہ شیخ بادشاہ کے دربار میں باریاب ہوئے اور انہوں نے مذہب اسلام کے محاسن و آداب اس کے سامنے بیان کیا۔ یہاں تک کہ بادشاہ انکا گرویدہ ہو گیا اور اسلام قبول کر لیا۔ اس کی اطاعت اسلام کے بعد اس کے ساتھیوں نے بھی مذہب اسلام کو اپنا لیا۔ بادشاہ نے قرآن مجید کی تعلیم حاصل کی اور چار پارہ کا حفظ بھی کیا۔ البتہ یہ نہیں معلوم کہ اس نے اشاعت اسلام میں کوئی اہم کارنامہ انجام دیا ہو۔

دوسرا ذریعہ دریائے نیل کے منابع کا پتہ لگانے والے وہ مسلم وفود ہیں جن کو شاہ موتیسا اول سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا جو اپنے باپ شاہ سونا ثانی کی وفات کے بعد تخت حکومت پر متمکن ہوا تھا۔ وہ بھی مسلمان ہوا اور حاکم مصر خدیو اسماعیل سے اپنے قبائل میں اسلام کی تعلیم و تبلیغ کے لئے علماء طلب کئے۔ اسلام کی نشر واشاعت میں اس نے وہ کارنامے انجام دئے جس کی

نظیر اسلامی تاریخ میں بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ اس نے یوگینڈا کے علاوہ اس کے پڑوسی ممالک میں بھی اسلام کے دائرہ کو وسیع کیا۔ چنانچہ اس نے مملکت بونی ورو کے بادشاہ کا باریغا کو اسلام کا پیغام پیش کیا۔ نیز اس نے اپنی پوری قوم اور امراء کو شعائر اسلام کی پابندی، مسجدوں کی تعمیر، دینی مصلحتوں کے پیش نظر ساحلی مسلمانوں کو عہدوں اور ولایتوں کی تفویض پر ابھارا اپنی حکومت کے اطراف میں ہجری تقویم رائج کیا اور رعایا کو عام حکم دیا کہ روز مرہ کی زندگی اور اجتماعی معاملات میں اسلامی آئین و قوانین کی پابندی کریں۔ اس طرح یوگینڈا کے اطراف (مرلیع) میں اس کی بے لاگ کوششوں سے اسلام کی خوب نشر و اشاعت ہوئی اور اگر اسلامی توسیعات کی راہ میں دوسری غیر اسلامی سرگرمیاں حائل نہ ہوئی ہوتیں تو ریاست یوگینڈا دوسرے ممالک سے زیادہ طاقتور اور اس کے سارے اطراف نور اسلام سے منور ہوتے۔ اور مشرقی افریقہ میں ریاست یوگینڈا ایک اہم حیثیت اور اسلام کی سچی نمائندگی کی حامل حکومت ہوتی۔ موتیسا اول کی حکومت ۲۸ر سال تک رہی۔

یوگینڈا میں اسلامی کلچر کی اشاعت کے ادوار

دراصل یوگینڈا میں اسلامی تہذیب و ثقافت کی اشاعت کے تین ادوار ہیں۔ اور ہر دور میں اسے سخت چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ذیل میں اس کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔

پہلا دور: یوگینڈا میں ۱۸۴۴ء میں دخول اسلام سے لیکر ۱۹۷۱ء تک

دوسرا دور: ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۹ء تک

تیسرا دور: ۱۹۷۹ء سے ۱۹۹۶ء تک

موجودہ صدی میں اسلامی تہذیب و ثقافت کی نشر اشاعت کے جائزہ سے قبل اس وقت کے رہنماؤں اور بادشاہوں کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ ایک ہلکی سی تاریخی صورت آنکھوں میں پھر جائے۔

(جاری)

اردو اکیڈمیوں کو تمام اردو اخباروں اور رسالوں کو باقاعدہ اشتہار دینے چاہئیں اور ہر اکیڈمی میں صحافیوں کی ایک کمیٹی تشکیل دی جانی چاہئے

ڈاکٹر خلیق انجم

تمام اہل اردو اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ اردو اخباروں اور رسالوں کی مالی حالت خاصی تشویش ناک ہے۔ اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارے اخبار اور رسالے ہندوستان کے اردو سماج کی بہت اہم خدمت کر رہے ہیں۔ لیکن مرکزی حکومت ہو یا صوبائی حکومتیں یا ہماری بارہ تیرہ اکیڈمیاں، کوئی بھی اردو صحافت کی مالی حالت کو بہتر بنانے کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ اس وقت ہندوستان سے شائع ہونے والے تمام زبانوں کے اخبارات میں اردو اخبارات و رسائل کا تیسرا نمبر ہے۔ اردو اخباروں کے مالک کیسی کیسی پریشانیوں اور مصیبتوں کے ساتھ اردو صحافت کی ترقی اور بقا کے لیے کام کر رہے ہیں اس کا اندازہ آسانی سے نہیں کیا جا سکتا۔ اردو کے ایسے اخبارات کی تعداد خاصی ہے جن کے اسٹاف میں ایک دو سے زیادہ کام کرنے والے نہیں ہوتے۔ اردو اخبار کا مالک دنیا بھر کی مصیبتیں برداشت کر کے اپنے اخبار کو جاری رکھتا ہے۔ اس بات کو بھی اردو اخبارات کی کوتاہی پر محمول کیا جاتا ہے کہ اس کے پڑھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ جب کہ یہ بات کچھ ہی اخباروں پر صادق آتی ہے لیکن بیشتر اردو اخباروں کے بارے میں درست نہیں ہے۔ لوگ قومی پریس کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ اس پریس کے اخبارات انگریزی اور کچھ ہندی میں ہیں۔ یہ بات ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ عوام پر چھوٹے اخبارات شائع ہونے والی خبروں کا زیادہ اثر ہوتا ہے کیوں کہ قومی پریس کے اخبارات صرف شہروں کے [illegible] تک محدود ہیں۔ عام آدمی اردو یا مقامی زبان کے اخبارات پڑھتا ہے۔ بعض چھوٹے

علاقوں میں آج بھی ایک روایت یہ ہے کہ داستان امیر حمزہ کی طرح ایک آدمی اردو کا اخبار بہ آواز بلند پڑھتا ہے تو اس کے ارد گرد بیٹھے دس لوگ اور سنتے ہیں۔ اردو اخبارات و رسائل کو مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتوں سے بہت کم اشتہارات ملتے ہیں۔ اور پبلک و پرائیویٹ سیکٹر سے تو بالکل ہی نہیں ملتے۔

انگریزی ہو یا ہندی یا کوئی بھی بڑی علاقائی زبان، اخبارات صرف اور صرف اشتہارات کے بل پر چلتے ہیں۔ ہر صوبے میں دو چار اخبارات کو چھوڑ کر باقی تمام اخباروں کی حالت لگ بھگ وہی ہے جو اردو اخباروں کی ہے۔ یہ پوری بحث ہم نے صرف اس لیے کی ہے کہ اگر اردو اخبارات کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور اس کے پڑھنے والوں کی تعداد بقول بعض اردو دشمنوں کے، غیر معمولی حد تک کم ہے تو پھر اردو اکیڈمیاں اپنی سرگرمیوں کی خبریں اردو اخبارات کو کیوں بھیجتی ہیں اور اپنی اہم ترین اطلاعات کو اردو اخبارات کو بھیج کر اپنے مقاصد میں کامیابی کیسے حاصل کر لیتی ہیں؟ اگر واقعی قومی پریس اہم ہیں اور اردو پریس کی کوئی اہمیت نہیں ہے تو اکیڈمیاں اور بعض یونیورسٹیاں اپنی سرگرمیوں کی رپورٹیں اور اطلاعات قومی پریس کو کیوں نہیں بھیجتیں۔ اور صرف اردو پریس ہی پر کیوں کرم فرماتی ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ قومی پریس کسی بھی قیمت پر اکیڈمیوں کی سرگرمیاں شائع نہیں کرتا اس لیے مجبور ہو کر اردو اخبارات کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔ شاید ہی کوئی اکیڈمی ایسی ہو جس کی سرگرمیاں اردو اخبارات میں نمایاں کر کے نہ چھاپی جاتی ہوں۔ یہ اخبارات اردو اکیڈمیوں اور اردو کی خدمت کرتے ہیں لیکن جواباً اردو اکیڈمیاں ان اخباروں کے لیے کیا کام کرتی ہیں؟ ہندوستان میں اس وقت تیرہ چودہ اکیڈمیاں اور تین چار ایسی یونیورسٹیاں ہیں جو اپنی سرگرمیوں کی رپورٹیں اور اطلاعات اردو اخبارات کو لازمی طور پر بھیجتی ہیں۔ ان میں سے ہر اکیڈمی کا بجٹ بیس لاکھ سے لے کر ڈیڑھ دو کروڑ تک ہے۔ یہ اکیڈمیاں سیمنار کرتی ہیں، ادبی جلسے منعقد کرتی ہیں اور مارچ کے مہینے تک سارا روپیہ خرچ کر کے ہاتھ جھاڑ کر بیٹھ جاتی ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں کہ کیا ان سیمناروں، ادبی تقریبوں، شعری نشستوں اور کتابوں کی طباعت سے اردو کی اتنی ہی خدمت ہوتی ہے جتنی اردو اخبارات کر رہے ہیں، یقیناً نہیں۔ کیوں کہ اکیڈمیوں اور حکومت کے دوسرے اردو اداروں کی سرگرمیاں ایک مخصوص

بنے تک محدود رہتی ہیں جب کہ اخبارات ایک بڑے وسیع حلقے کی خدمت کرتے ہیں۔ اردو اخبارات زندگی اور موت کی کشمکش میں رہتے ہیں۔ آپ کسی بھی اکیڈمی کے حالات آمد و خرچ کو دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ان اکیڈمیوں کے بجٹ میں سے پورے سال میں اردو اخبارات پر چار پانچ ہزار سے زیادہ خرچ نہیں ہوتے۔ کیا اردو اخبارات ان اکیڈمیوں سے زیادہ اردو کی خدمت نہیں کر رہے تو پھر انھیں ان کا حق کیوں نہیں ملتا۔ ہم اخبارات کے لیے اکیڈمیوں سے بھیک نہیں مانگتے اپنا حق مانگتے ہیں اور ہمارا حق یہ ہے کہ اگر کوئی اکیڈمی دس رپورٹیں یا اطلاعات کسی اخبار کو بھیجے تو کم سے کم چار پانچ اطلاعات اشتہارات کے طور پر بھیجی جائیں تاکہ اخبارات کی مالی حالت بہتر ہو سکے۔ اس سلسلے میں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ اردو اکیڈمیوں کے اراکین میں صحافیوں کا بالکل نمائندگی نہیں دی جاتی۔ ہر اکیڈمی میں کم سے کم بیس پچیس اراکین ہوتے ہیں۔ اگر ان میں کبھی کبھار کوئی جرنلسٹ شامل ہو تو یہ محض ایک اتفاق ہے۔ اس لیے ہمارا مطالبہ ہے کہ ہر اکیڈمی میں کم سے کم دو نمائندے اخباروں کے اور دو رسالوں کے ضرور لیے جائیں۔ تقریباً ہر اکیڈمی میں مختلف کاموں کے لیے کمیٹیاں بنی ہوئی ہیں۔ ہماری معلومات کے مطابق کسی بھی اکیڈمی میں صحافت سے متعلق کوئی کمیٹی نہیں ہے اس لیے ہر اکیڈمی میں اردو صحافت کی ترقی اور فروغ کے مفاد کا خیال رکھنے کے لیے صحافتی کمیٹی تشکیل دی جانی چاہیے۔

تقریباً تین چار سال سے دفتر "برہان" میں اسٹاف کی کمی اور کام کی زبردست بہتات اور حالات کا ناسازگار ہونا رسالہ "برہان" کی وقت پر اشاعت نہ ہونے کا باعث ہے۔ رفتہ رفتہ حالات معمول پر آنے لگے ہیں۔ اکھاڑ پچھاڑ سے دفتر کا چھٹکارا پاتے ہی انشاء اللہ تعالیٰ ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ رسالہ برہان دہلی شائع ہوتا رہے گا۔ زیر نظر شمارہ "برہان" کو مئی، جون ۱۹۹۹ء سمجھا جائے۔

ہم اس تعویق کے لئے اپنے قارئین کرام سے انتہا درجہ شرمسار اور معذرت خواہ ہیں۔ امید ہے کہ قارئین کرام ہماری مجبوری اور پریشانیوں کو سمجھتے ہوئے اس سے درگزر کریں گے۔ (ادارہ)

واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا

وحدت اسلامی

امام خمینیؒ کے افکار و عقائد کی روشنی میں

عید میلاد النبی ﷺ اور ہفتہ وحدت دنیا کے تمام مسلمانوں کو مبارک ہو

جاہلیت کی سیاہ و تاریک سرزمین پر اسلام کے روشن و تابناک آفتاب کی کرنوں کے چمکتے ہی جاہلیت آمیز زندگی کے افق پر امید کی صبح کی سفیدی نمودار ہونے لگی اور لوگوں کو اپنی تاریک زندگی میں روشنی اور گرمی محسوس ہونے لگی۔ غلاموں کے دل میں نجات و آزادی کی امید جاگ اٹھی اور ان کی آنکھوں میں ہمیشہ باقی رہنے والی چمک پیدا ہو گئی۔

دنیا کے ہر گوشے میں نغمہ توحید کی آواز گونج اٹھی اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہنے کی دعوت نے قوموں، قبیلوں اور جماعتوں و گروہوں میں متفرق و پراگندہ اور منتشر و منقسم لوگوں کو متحد و منسجم بنا دیا۔

یہ سب کچھ پیام آور توحید و رسول وحدت حضرت ختمی مرتبت محمد مصطفیٰ ﷺ کے میلاد مسعود و پر نور کی برکتوں کا کرشمہ تھا جس نے اپنی بعثت کے ساتھ انسانی برادری کو اخوت و بھائی چارہ کا پیغام سنایا۔

ان یادگار اور عظیم الشان ایام کو گزرے ہوئے تقریباً چودہ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ بیت چکا ہے، پھر بھی صاحبان ایمان کے قلوب اس توحیدی نغمے کی وجہ سے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور یہ توحیدی نغمہ آج بھی لوگوں کو پسندیدہ ترین راہ و روش کے توحید کلمہ اور کلمہ توحید کی طرف آنے کی دعوت دے رہا ہے۔

افسوس کی بات ہے کہ خواہ ناخواہ ماضی میں رونما ہونے والے بعض ناگوار حوادث کی وجہ سے ملت اسلامیہ میں تفرقہ و اختلاف پیدا ہو گیا۔ دنیا کی اسلام دشمن و اقتدار طلب طاقتوں نے

اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اپنی شرمناک سازشوں اور ناپاک منصوبوں کے ذریعہ اسلامی ممالک میں اختلافات اپنے زر خرید ملاؤں کی مدد سے ان ہی ہتھکنڈوں کا بھرپور استعمال کیا جس کی وجہ سے مسلمانوں کے درمیان سیاسی اتحاد قائم نہ ہونے پائے۔ واضح رہے کہ مسلمانوں کے درمیان مختلف النوع اور نت نئے فرقوں کی ایجاد انہیں اسلام دشمن سامراجی طاقتوں کی دین ہے تاکہ مسلمانوں کے درمیان وحدت و قربت کے نظریہ کو مقبولیت نہ حاصل ہونے پائے۔

لیکن یہ خداوند عالم کا خصوصی لطف و کرم ہے کہ سرزمین ایران میں امام خمینیؒ کی قیادت میں عظیم الشان اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد مسلمانوں کے درمیان وحدت و قربت اور اسلامی معاشروں اور ملکوں کے درمیان سیاسی وحدت و اتحاد کے نظریہ کو نئی زندگی مل گئی اور ملت اسلامیہ عالم اس حقیقت کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو گئی کہ اسلام اور مسلمانوں کی عظمت و سربلندی کا واحد راستہ اتحاد اور اسلامی اخوت ہے۔

امام خمینیؒ اس عظیم شخصیت کا نام ہے جس نے موجودہ صدی میں امت اسلامیہ عالم کے درمیان وحدت و اتحاد کی آواز بلند کی اور اسی اسلامی اتحاد کی بنیاد پر سرزمین ایران میں اسلامی جمہوری حکومت کی تشکیل کا کارنامہ انجام دیا، اسی وحدت و اتحاد کے سہارے اسلامی حکومت کو ثابت و استوار کیا اور اس کے ذریعہ تمام مسائل و مشکلات کا حل تلاش کیا اور اپنے ساتھیوں کو یہ باور کرا دیا کہ آنے والے وقت میں بھی یہ وحدت اسلامی اہم مسائل و مشکلات کا حل کرنے میں بہت مدد و معاون ثابت ہو گی۔

انسان کی الٰہی فطرت ہمیشہ توحید کی طرف مائل و متوجہ رہی ہے، اور آدمی کی عقل و خرد بھی انسانی زندگی کے ہر دور میں نفسانی اور شیطانی رجحانات و خواہشات سے آلودہ ہونے سے پہلے توحید کی طرف ہی مائل و متوجہ رہی ہے اور تفرقہ و اختلاف کو انسانی مفاد و مصالح کے خلاف سمجھتی رہی ہے اور تفرقہ و اختلاف کو انسانی سماج کے زوال کا باعث قرار دیتی رہی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت آدمؑ سے لے کر خاتمؐ تک تمام انبیاء علیہم الصلوات والسلام نے بھی توحید کو اپنی دعوت کی بنیاد قرار دیتے ہوئے شرک و دوگانگی و تثلیث اور نفاق کی اعلانیہ تردید فرمائی

ہے اور اگر گہرائی سے دیکھا جائے تو توحید پر اعتقاد و ایمان ہی اسلام و کفر کی آخری سرحد ہے۔

مذاہب اسلام کے جملہ عرفانی، فلسفی، اخلاقی، کلامی اور تربیتی مکاتب نے عالم وجود میں وحدت الٰہی اور اس کے اجزاء کو اپنے مرکزی عقیدہ کا جزو لاینفک قرار دیا ہے اور اہل تحقیق سے یہ بات ہرگز پوشیدہ نہیں ہے کہ انسانی معاشروں میں حقیقی وحدت کا رجحان توحید پر اعتقاد و ایمان کا جلوہ ہے اور اس کے برعکس کثرت پسندی کو شرک و مادہ پرستی کی اہم خصوصیات میں شمار کیا جاتا ہے۔

قرآن کریم میں امت واحدہ کی تشکیل کو "سیر الی اللہ" کا حقیقی وسیلہ قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہوتا ہے :ان هذه امتكم امة واحدةوانا ربكم فاعبدون۔ واضح رہے کہ تاریخ بشریت کے دوران حق و باطل کے درمیان جاری کشمکش اور اس کے مختلف رنگ و روپ کا توحید و شرک سے گہرا رابطہ رہا ہے۔ چنانچہ اسی حقیقت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے امام خمینیؒ اکثر فرمایا کرتے تھے:

"تفرقہ و اختلاف کا تعلق شیطان سے ہے اور وحدت کلمہ و اتحاد کا تعلق رحمٰن سے ہے۔"

تاریخ اس حقیقت کو فراموش نہیں کر سکتی ہے ایک خدا پسند شخص نے تمام مادی وسائل و امکانات اور ظاہری اسلحوں سے خالی ہاتھ ہوتے ہوئے بھی وحدت اتحاد کی آواز بلند کی اور مومن افراد نے اس آواز پر لبیک کہا۔ ترقی یافتہ دنیا نے اس آواز کی بھرپور مخالفت کی۔ دنیا کی بڑی اسلحہ ساز فیکٹریوں کے مالکان اس مرد مجاہد کے دشمن کی حمایت کے لئے عملاً باہم متحد ہو گئے لیکن بڑی اور اسلام دشمن طاقتوں کے گٹھ جوڑ کے مقابلے میں امت اسلامیہ کے وحدت کلمہ کو عظیم الشان کامیابی حاصل ہوئی۔ جب اسلامی انقلاب نے اپنے طاقتور دشمن پر غلبہ حاصل کر لیا اور شاہی نظام حکومت کا شیرازہ منتشر کر دیا تو بہت سے گروہ اس نو تشکیل شدہ اسلامی نظام حکومت کی عداوت پر کمر بستہ ہو گئے۔ انہیں دنیا بڑی طاقتوں کی بھرپور حمایت حاصل ہو گئی اور ان جماعتوں نے اسلامی جمہوریہ ایران کی تباہی و بربادی کے لئے جو شرمناک حرکتیں کیں ان کے اجمالی تذکرہ کے لئے ایک مستقل کتاب کی تدوین کی ضرورت ہوگی۔

اسلامی نظام حکومت کی مخالفت کے پرچم بلند ہو گئے۔ ویسے تو عالمی کیمونسٹی طاقت اور سرمایہ دار مغربی طاقت کے درمیان عداوت تھی لیکن اسلامی نظام حکومت کی نابودی کے لئے دنیا کی یہ بڑی طاقتیں باہم متحد ہو گئیں اور پوری دنیا میں اسلامی انقلاب اور اسلامی جمہوری نظام کے خلاف بے بنیاد پروپگنڈوں کا بازار گرم ہو گیا۔ ان طاقتوں نے منصوبہ بند طریقے سے ایران کے خلاف سیاسی تنہائی، اقتصادی ناکہ بندی اور خوفناک و تباہ کن جنگی کارروائی کا لامتناہی سلسلہ چھیڑ دیا۔ لیکن یہ تمام طاقتیں اس ملت کے اسلامی اتحاد کے سامنے ٹھہر نہ سکیں جس کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ امت اسلامیہ کے اتحاد کے لئے اسے بہر حال ان اسلام دشمن طاقتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہے۔ ملت ایران کے اس بھرپور اور کامیاب مقابلے کا راز رہبر انقلاب اسلامی امام خمینیؒ کے اس جملہ میں پوشیدہ ہے جس کی طرف انہوں نے اپنی تحریر و تقریر میں بار بار اشارہ کیا ہے یعنی تفرقہ و اختلاف سے پرہیز اور وحدت کلمہ و اسلامی اتحاد کا تحفظ۔ ان کی یہ سفارش اس وجہ سے زیادہ موثر اور کارگر ثابت ہوئی کہ دوسروں سے پہلے وہ بذات خود اس بات پر مکمل اعتماد و اعتقاد و ایمان رکھتے تھے اور ساری زندگی وہ اس کی تعمیل میں سرگرم عمل رہے۔

قرآن کریم کی تعلیمات عالیہ اور عارف اکمل حضرت ختمی مرتبت محمد بن عبد اللہؐ اور ائمہ اطہار علیہم السلام کے ارشادات پر مشتمل اپنے عرفانی مکتب میں امام خمینیؒ عالم تخلیق میں حقیقی وحدت کے مسئلہ کو حل کر چکے تھے اور اپنے فلسفیانہ مشرب میں نہ صرف وحدت الوجود بلکہ خصوصی محفلوں میں مخلوقات خداوندی کے درمیان موجود حقیقی وحدت کا تذکرہ بھی کیا کرتے تھے وہ اپنے عرفانی اشعار میں بھی مجموعی اعتبار سے نظام کائنات میں موجود وحدت کا تذکرہ بار بار کیا کرتے تھے اور اس سلسلے میں وہ منصور کی صدائے انا الحق کو بھی انیت و ثنویت کی علامت قرار دیتے تھے۔ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے:

فریاد انا الحق رہ منصور بود
یارب مددی کہ فکر راہی بکلیم

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

بر فراز دار فریاد انا الحق می زنی

مدعی حق طلب امنیت دانا چہ شد

امام خمینیؒ باطل طاقتوں کے خلاف کی جانے والی اپنی جدوجہد میں بھی لوگوں کو وحدت و اتحاد کی دعوت دیا کرتے تھے اور پچاس سال قبل انہوں نے اپنے تاریخی اور سب سے پہلے اہم بیان کی ابتداء قرآن مجید کی اس آیت کریمہ سے کی تھی:

"قل انما اعظکم بواحدة ان تقوموا لله مثنیٰ و فرادیٰ"

اپنے اس اہم اور تاریخی بیان میں انہوں نے امت اسلامیہ کی وحدت کا تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہوئے یہ بتلایا تھا کہ الٰہی انقلاب کی کامیابی کے لئے امت اسلامیہ کے درمیان وحدت واتحاد کا عملی وجود لازمی ہے۔

پیغمبر اکرمؐ کی ولادت باسعادت کے موقع پر ہفتۂ وحدت اور اسلامی اتحاد کے موضوع پر قومی و عالمی سطح پر مذاکروں اور سیمناروں و کانفرنسوں کی تشکیل اور رہبر معظم انقلاب اسلامی آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای کے حکم سے "تقریب مذاہب اسلامی" نامی عالمی ادارہ کی تاسیس اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اسلامی جمہوریہ ایران اس زمانے میں مسلمانوں کے درمیان حقیقی وحدت واتحاد کا علمبردار ہے۔

امید ہے کہ اسلام دشمن طاقتوں کی عداوت ان کی غلاموں کی تفرقہ اندازی اور سامراجی فرقوں کی شیطانی سازشوں کے باوجود عنقریب ہی دنیا میں مسلمانوں کی کامیابی کی صبح نمودار ہونے والی ہے اور ان شاء اللہ وہ دن دور نہیں جبکہ اسلامی اخوت وبرادری کا پیغام ساری دنیا میں پھیل جائے گا اور امت محمدیؐ کے درمیان مستحکم سیاسی اتحاد بھی قائم ہو جائے گا۔

☆☆☆

مجلسِ ادارت اعزازی

☆سید اقتدار حسین

☆ڈاکٹر معین الدین بقائی

☆محمود سعید بلالی

☆ڈاکٹر جوہر قاضی

نگرانِ اعلیٰ

حضرت مولانا

حکیم محمد زماں حسینی

جلد: ۱۲۵ | جولائی و اگست ۱۹۹۹ء | شمارہ: ۱،۲

زرِ تعاون

فی پرچہ: ۶/روپے

سالانہ: ۷۲/روپے

رحمن کمپیوٹرس دہلی

Ph.:6952082

جملہ خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ:

منیجر ماہنامہ برہان

4136-اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔110006 فون نمبر:3262815

عمید الرحمن عثمانی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان، اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

ہم اپنے ملک کی ۵۳ویں یوم آزادی کا جشن منا رہے ہیں۔ ہر ہندوستانی کا سر فخر و مسرت سے اونچا ہے کہ ہم نے اپنی آزادی کی ہر طرح حفاظت کی ہے اور اس میں ہم کامیاب ہیں آزادی چیز ہی ایسی ہے کہ یہ ہر جاندار کے لئے بہت ہی ضروری ہے۔ ہم تو انسان ہیں جو ہر قیمت پر اپنی آزادی کو بنائے رکھنا پسند کرتے ہیں۔ جانور تک بھی آزادی کی قدر و قیمت جانتے ہیں۔ ایک پرندہ کو آپ پنجرہ میں بند کردیجیے اور اس کو پنجرے میں اس کی پسند کی ہر چیز مہیا کر دیجئے وہ بھی جو وہ آزاد رہ کر ہر جگہ اڑاڑ کر بھی نہ حاصل کر سکتا ہے اسے مہیا کر دیجئے اس کے باوجود بھی وہ پنجرے میں رہنا پسند نہیں کرے گا۔ جہاں آپ نے پنجرے کا دروازہ کھولا اور وہ پھر سے اڑا یہ جاوہ جا اپنی آزادی کی مستی میں جھوم جھوم خوشیاں مناتا ہوا آزادی کا گیت گنگناتا آپ کو منہ چڑاتا ہوا کسی پیڑ کی ڈالی پر بیٹھ کر اپنے دل کی یہ بات نہ چھپا سکے گا کہ پیارے انسان! جب آزادی تم کو اچھی لگتی ہے پیاری لگتی ہے تو پھر مجھے کیوں نہیں۔ میں آزاد رہ کر خوش ہوں تمہاری چکنی چپڑی روٹی اور تمہارے دیئے ہوئے عیش و آرام کے سامان بھلا میری آزادی کی قیمت کیسے چکا سکتے ہیں۔

جب انسان پرندہ کے دل کی ان گہرائیوں سے واقف ہے تو پھر انسان خود اپنی آزادی کی اہمیت سے بھلا کیوں واقف نہیں ہے۔ انسان پیدائشی آزادی کا خوگر ہے۔ جب انگریزی سامراج نے اپنی عیاری و مکاری سے ۱۸۵۷ء میں ہندوستانیوں کو غلام بنا کر ان کی آزادی سلب کیا تو ہر طرف اس کے خلاف بڑا واویلا مچا ہر ہندوستانی اپنی آزادی کے لئے تڑپ اٹھا رہ گیا۔ غلامی کی زنجیروں کو اتار پھینکنے کے لئے اس نے انگریزی سامراج کی ہر طاقت کا منہ توڑ جواب دیا۔ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ ہنستے کھیلتے پھانسی کے پھندوں کو گلے میں لگایا۔ اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ موہن چند کرم چند گاندھی نام کا رہنما اٹھا اور اس نے تمام

ہندوستانیوں کو ایک لڑی میں پرو کر مکمل آزادی کے لئے بگل ہی بجادیا آن کی آن میں ہندستانیوں کا جمگھٹا اکٹھا ہو گیا۔ ایک قطار رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی مفتی اعظم، مفتی کفایت اللہ، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبید اللہ سندھیؒ مولانا حسرت موہانیؒ، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ وغیرہ عظیم علماء کرام چٹان کی طرح انگریز سامراج کے خلاف ہندوستان کی آزادی کے لئے سینہ سپر ہوگئے اور انگریز سامراج کا ہر ظلم ہر ستم انہوں نے برداشت کیا مگر آزادی ہند کی تحریک کو کمزور نہ ہونے دیا اپنے خون سے اور اپنی اپنی قربانیوں سے آزادی کی مشعل کو روشن کئے رکھا برادران وطن میں سے بھی کئی ایسے سر فروش میدان عمل میں اُترے کہ انہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو جاری رکھنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ ملک آزاد ہوا مگر افسوسناک طریقے سے انگریز اپنی عیارانہ ومکارانہ فطرت سے باز نہ آیا۔ وہ ہندوستانیوں کے عزم وحوصلہ کے آگے ہار گیا لیکن اس نے اپنی ہار کا بدلہ اس طرح لیا کہ ملک کو تقسیم کر دیا۔ ایک طرف پاکستان بنا گیا اور دوسری طرف آپس میں نفرت کے بیج بو گیا جس سے ہماری آزادی کی خوشیوں میں تاسف، ملال، اندیشوں ناپسندیدہ الفاظ بھی خود بخود شامل ہوگئے۔

اپنے یوم آزادی کے ۵۳ویں جشن مناتے ہوئے ہم کہاں کھوگئے۔ ماضی کے یہ دلخراش واقعات کے بتانے کا اس وقت یہاں کوئی موقع ہی نہیں تھا۔ مگر ہمیں معاف کیا جائے یہ جو اوپر ہمارے قلم سے یہ ناخوشگوار باتیں لکھی گئی ہیں وہ ایک حساس دل کی کیفیت کی ترجمانی ہے بہر حال آزادی کا ہم جشن منا رہے ہیں ہمیں اس بات پر اطمینان ہے کہ ہمارے آزاد ملک کے رہنماؤں نے اور کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو اتنا ضرور ہم کہیں گے کہ ہندوستان کی آزادی کو بنائے رکھنے کے لئے ہمارے رہنماؤں نے قابل تحسین کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں اپنے ملک کی سرحدوں کی حفاظت کی ہے دشمن کی ہر اس کارروائی کا منہ توڑ جواب دیا ہے جس سے ہمارے ملک کی آزادی پر ذرا بھی آنچ آرہی ہو۔ ابھی حال ہی میں کارگل میں دشمن ملک کی خطرناک شرمناک اور افسوسناک کارروائی کا جس طرح منہ توڑ جواب دیا ہے اس کے

لئے ہمارے ملک کے رہنما ہماری حکومت کے سربراہ ہر طرح مبارک باد اور شکریہ کے مستحق ہیں۔ ہمارے فوجی جوانوں کی ہمت وشجاعت اور قربانیاں قابل تعریف قابل داد اور تاریخ کا زرین عنوان بن گئی ہیں جس پر بھارت کے ہر باشندے کا سر اونچا ہے اور یہ بات بھی ہم کہے بغیر نہ رہیں گے کہ مشکل کی اس گھڑی میں ہر ہندوستانی نے جس طرح اتحاد واتفاق اور بھائی چارگی کا مظاہرہ کیا ہے وہ تمام دنیا میں ہندوستان کی نیک نامی کا باعث ہوا ہے دشمن کی مکارانہ کارروائی سے پہلے ہزار اختلاف تھے مگر جب دشمن کی ہماری سرحدوں پر گھس پیٹھ ہوئی دراندازی ہوئی تو ہندوستان کے تمام ہی باشندے سیسہ پلائی دیوار کی طرح ایک ہوکر دشمن کی کارروائی کے خلاف میدان عمل میں مستعد ہوگئے جس سے دشمن کا سر نیچا ہوا تمام دنیا میں بھارت کی واہ!واہ! ہوئی اور دشمن پر لعنت وملامت کی بوچھاڑ ایسی پڑی کہ دشمن الگ تھلگ پڑ گیا۔ ہماری فوجوں کی جانبازی بہادری کے قصے ہر جگہ گونجنے لگے اور انشاءاللہ ہمیشہ گونجتے ہی رہیں گے۔ جن فوجی جوانوں نے اپنی جان کی قربانی دیکر سرحد کی حفاظت کی ان کی شہادت ہمارے سب کے لئے سرمایہ افتخار ہے ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ ہم نے اپنی آزادی کی اپنی سرحدوں کی ہر طرح حفاظت کی ہے۔ اور آئندہ بھی اسی طرح کرتے رہیں گے۔ یہ ہر ہندوستانی کے دل کی آرزو وخواہش ہے۔ آزادی کی ۵۳ ویں سالگرہ کا جشن اس لحاظ سے اور بھی پر مسرت ہے کہ ہم نے اپنے عمل وکردار سے یہ ثابت کردیا ہے کہ ہم اپنی آزادی کو ہرگز مٹا سکتے نہیں، سر کٹا سکتے ہیں لیکن سر جھکا سکتے نہیں۔

ڈھائی سال کی مدت میں ملک پر پارلیمنٹ کا یہ تیسرا انتخاب سر پہ آن پڑا ہے اس میں جس پارٹی کے بھی سربراہ کا دوش ہے اس سے قطع نظر ہم یہ کہے بغیر نہ رہیں گے کہ ملک کے لئے یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ نیتاؤں کی تو رد اہوگئی اور ملک کے عوام کا الیکشن پہ الیکشن ہو رہے کے نتیجے میں زبردست اقتصادی کرائسس اور مہنگائی نے کچومر ہی جو نکال دیا ہے اس کا اندازہ ان نیتاؤں کو کہاں ہوگا۔ جن کے آگے پیچھے سرمایہ داروں کی بے تحاشہ دولت کی تھیلیاں

موٹر گاڑیوں میں گھومتی پھرتی ہیں اور جن کے بھرشٹاچار کے اگر روپے تو ماضی بعید کی بات ہو چکی ہے اربوں کھربوں ہی کے چھپے بھنڈاروں ہی کا انکشاف ہوتا ہے۔ غیر ممالک میں ان کے بینک کھاتوں کا اور تمام عیش و آرام کے سامانوں سے لیس فارم ہاؤسوں، بنگلوں، کوٹھیوں اور فلیٹوں کے راز منکشف ہوتے ہیں۔ آج ان نیتاؤں کی بدولت ہی ملک کے اقتصادی حالات کس قدر خستہ ہو چکے ہیں اس کا اندازہ غریب عوام کو زبردست آسمان کو چھوتی مہنگائی کی مار سے ہوتا ہے۔ اس کو پیٹ بھرنے تک کی روٹی بھی میسر نہیں ہے۔ پانی بجلی کو عوام ترستے ہیں اور یہ نیتا ایئر کنڈیشنڈ روم میں بیٹھ کر سیاست کی گوٹے کھیلتے ہیں۔ اس بار جو پارلیمنٹ کے الیکشن ہو رہے ہیں وہ ملک پر زبردستی تھوپے گئے ہیں۔ حکومت صحیح کام کر رہی تھی بیشک وہ بی جے پی کی تھی لیکن عوام کی منتخب کی ہوئی حکومت تھی جسے پورے پانچ سال تک حکومت کرنے کا حق ہندوستانی عوام نے دیا تھا ایسی حکومت کو سیاسی چالبازیوں سے ایک ووٹ سے گرا کر اچھا نہیں کیا۔ جس نے بھی اس قسم کا کھیل کھیلا ہے اس نے ملک اور ملک کے عوام کے مفاد کے ساتھ کوئی بھلا نہیں کیا ہے اب اس تھوپے گئے الیکشن سے ملک اور عوام کا جس قدر نقصان ہوا ہے اسے الفاظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال اب یہ تو الیکشن کے بعد ہی پتہ چلے گا کہ اس ملک کی باگ ڈور کس پارٹی کے ہاتھ میں ہو گی لیکن اگر عوام نے پھر بی جے پی کو الیکشن میں کامیاب کر دیا تھا تو پھر ان لوگوں پر کیا بیتے گی جو بی جے پی کی حکومت گرا کر اپنی حکومت بنانے کے چکر میں پڑے ہوئے تھے۔ اور اپنے اس چکر اور کھیل میں انہیں اس بات کی قطعاً پرواہ نہیں تھی کہ اس سے ملک پر کس قدر اقتصادی بوجھ پڑ جائے گا۔ عوام کا کیا حال ہو گا انہیں مہنگائی کی مار نے پہلے ہی بے حال کر رکھا ہے الیکشن کے بعد الیکشن پر ہوئے اخراجات کا بوجھ کسی نہ کسی طرح عوام ہی پر پڑے گا تو عوام کا مزید مہنگائی کی مار سے جو حال ہو گا اس کا تصور ہی کر کے دل و دماغ میں خوف و دہشت پیدا ہو رہی ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اس الیکشن میں کسی ایک پارٹی کو اتنی اکثریت مل جائے کہ وہ آرام سے پانچ سال تک حکومت چلا سکے اور اس طرح ملک کے ترقیاتی پلان کامیابی کے ساتھ پایہ تکمیل تک

پہنچ سکیں اور عوام کی بھلائی فلاح و بہبودگی کے عظیم الشان کام انجام پاسکیں۔ عوام بار بار الیکشن سے عاجز آچکے ہیں۔ الیکشن کے اخراجات سے عوام اور ملک دونوں ہی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ رہا ہے۔

آہ! حکیم عبدالحمید دہلوی

موت ہر جاندار کے لئے مقدر ہے جو دنیا میں پیدا ہوا ہے اسے ایک دن جانا بھی ہے۔ موت کسی کو نہیں چھوڑتی ہے چاہے وہ پیغمبر وولی ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن بعض شخصیتوں کی موت کو ایک شخصیت کی موت کہہ کر اور اس پر اناللہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر اسے بھلایا نہیں جاسکتا ہے۔ ان کی موت سے ایک عالم کو رنج و غم اور دکھ وصدمہ کے ساتھ ناقابل تلافی نقصان بھی ہوتا ہے۔ حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی کا شمار ایسی شخصیتوں میں ہوتا ہے جن کی وفات سے ان کے خاندان کے افراد ہی کو صدمہ ورنج تو ہے ہی پوری قوم کو پوری ملت کو ان کی وفات کی خبر سن کر رنج و غم اور دکھ وصدمہ کے ساتھ ساتھ ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ حکیم عبدالحمید صاحب نے اپنی پوری زندگی ملک وقوم کی بے لوث خدمت کے لئے صرف کی ہے۔ وہ اپنے لئے نہیں بلکہ قوم وملک کے لئے جیتے تھے۔ انہوں نے تو اپنی زندگی قوم وملک اور انسانیت کی خدمت اور فلاح و بہبودگی کے لئے وقف کردی تھی۔ ان کے دل میں غریبوں کے لئے تڑپ تھی ہمدردی تھی۔ ۱۹۶۴ء میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے اخبار "صدق جدید" لکھنؤ میں ایک دہلوی صحافی نے حکیم عبدالحمید کی شخصیت اور ملک وقوم ان کی بے لوث خدمات پر ایک مضمون لکھا تھا جس میں حکیم عبدالحمید کو ولی کامل کہا گیا تھا۔

ایک وقت تھا جب حکیم عبدالحمید صاحب پابندی سے ہر جمعہ کو دفتر ندوۃ المصنفین میں تشریف لاتے تھے اور حضرت قبلہ ابا جان مفکر ملت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰنؒ قاضی سجاد حسین صاحب اور سعید احمد اکبر آبادی کے ساتھ رائے ومشورہ کرتے

تھے۔ ہماری والدہ مرحومہ ہر جمعہ کا انتظار کرتی تھیں کہ ان رہنمایان ملت کے لئے اپنے ہاتھ سے کھانے تیار کرتی تھیں اور ہر اتوار کو حکیم صاحب گاڑی بھیج کر مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ، مولانا حفظ الرحمنؒ، قاضی سجاد حسینؒ اور سعید احمد اکبر آبادیؒ کو تلیا مارگ نئی دہلی میں واقع اپنی کوٹھی پر ضروری مشورے کے لئے بلایا کرتے۔ اتوار کو ان علماء کرام کا رات کا کھانا حکیم صاحب ہی کے ساتھ ان کی کوٹھی پر ہوتا تھا۔ یہ مشورہ ہی کی برکت تھی کہ حکیم صاحب نے تغلق آباد میں جہاں اس وقت آبادی کا نام ونشان نہ تھا ہر طرف جنگل ہی جنگل تھا بنجر زمین تھی ہزاروں گز زمین خریدی آج وہاں عالیشان ہمدرد نگر آباد ہے جس میں اسکول سے لیکر ہمدرد یونیورسٹی مجیدیہ ہاسپٹل وغیرہ وغیرہ قائم ہے ہزاروں چنے ہوئے اعلیٰ دماغ کی قابل ہستیاں براجمان ہیں جو ملت کی خیر خواہی کے پلان پر عمل پیرا ہیں۔ حکیم عبدالحمید نے ملک وقوم کے لئے وہ عظیم الشان کام کیا ہے جس پر ہزاروں صفحات پر مشتمل کتابیں لکھی جائیں گی ان کی خدمات پر مورخین ریسرچ کریں گے اور انہیں بیسویں صدی کا انسانیت کا مسیحا کہا جائے گا وہ ہر حال میں قناعت پسندی پسند کرتے تھے اپنے اوپر کچھ خرچ نہ کرتے تھے ان کی کمائی قوم کے کاموں کے لئے فراخ دلی کے ساتھ خرچ ہوتی تھی۔ بہرحال ملت کا یہ محسن آج ہمارے درمیان میں سے اٹھ گیا ہے۔ ادارہ ندوۃ المصنفین حکیم عبدالحمید کے انتقال کو اپنا ذاتی اور ملک وملت کا عظیم نقصان تصور کرتا ہے اللہ تعالیٰ حکیم عبدالحمید صاحب کو جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین

فنّ

تاریخ گوئی کی ابتدا (باب اوّل)

از

ڈاکٹر آفتاب احمد خاں ڈبل ایم، اے. پی، ایچ، ڈی (لیکچرر)

عربی الاساس رسم الخط والی زبانوں میں تاریخ گوئی کی روایت عام رہی ہے، خصوصاً فارسی اور اردو زبانوں میں جس کی بنیاد عربی زبان کے اٹھائیس حروف تہجی پر قائم ہے۔ تہجی کے معنی ہجے کرنا۔ اور حروف مفردہ کو اعراب کے ساتھ ملا کر پڑھنے یعنی تلفظ نکالنے کے ہیں۔ کنایۃً الف سے لے کر یا (ی) تک تمام حرفوں کو حروفِ تہجی کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں حروفِ مبانی، حروفِ مفردہ اور حروفِ منفصلہ بھی کہتے ہیں۔ ان حروفِ ہجائیہ کو لکھنے کے اہلِ علم نے دو طریقے مقرر کئے ہیں جنہیں "ترتیب تعلیمی" اور "ترتیب ابجدی" کہتے ہیں۔ ترتیبِ تعلیمی میں یکساں شکل والے حرفوں کو پاس پاس لکھا جاتا ہے یعنی ا، ب، ت، ث، ج، ح وغیرہ تاکہ نو آموز طلبہ کو سیکھنے میں آسانی رہے چونکہ اس ترتیب کے پہلے چار حرفوں کو ملا کر پڑھیں تو کلمہ "ابتث" بنتا ہے اس لئے اسے "ترتیبِ ابتث" بھی کہتے ہیں۔ جدید ترین تحقیق کی رو سے اس ترتیب کا موجد ابنِ مقلہ (م ۳۲۸ھ / ۹۴۰ء) کو بتلایا جاتا ہے [1] دوسری ترتیب میں جسے طریقۂ ابجدی کہتے ہیں، حروف کو عبرانی اور یونانی حروفِ ہجائی کی ترتیب سے لکھتے ہیں یعنی ا، ب، ج، د، ہ، و، ز، ح، ط، ی وغیرہ سے آخر تک۔ کیونکہ اس ترتیب کے پہلے چار حرفوں کو ملا کر پڑھنے سے لفظ "ابجد" بنتا ہے لہٰذا اسے ترتیب ابجدی کا نام دیا گیا اور یہی قدیم ترتیب ہے [2] جس میں ہر حرف کی ایک سے ہزار تک قیمت مقرر ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ عربی زبان کے مذکورہ حروف تہجی سب سے پہلے حضرت

---

[1] مقالہ "اردو حروفِ تہجی" از ڈاکٹر ابو محمد سحر مشمولہ ماہنامہ شاعر جلد ۵۷ شمارہ ۳ و ۴ ص ۸۔

[2] فنِ تحریر کی تاریخ از محمد اسحاق صدیقی ص ۲۱۱ و ۲۲۳ مطبوعہ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ ۱۹۶۲ء

آدمؑ پر نازل ہوئے کیونکہ انہیں کائنات کی تمام اشیاء کے نام، ان کی حقیقت اور اصول واساس کا علم عطا کیا گیا تھا۔ اس خیال کی بنیاد قرآن پاک کی آیت "وَعَلَّمَ اٰدَمَ الاَسْمَآءَ كُلَّهَا" (۳۱:۲) پر رکھی گئی ہے یعنی (پھر تب ایسا ہوا کہ مشیت الٰہی نے جو کچھ چاہا ظہور میں آ گیا) اور آدمؑ نے یہاں تک معنوی ترقی کی کہ) تعلیم الٰہی سے تمام چیزون کے نام معلوم کر لئے۔[۱] تسلیم سہسوانی اور ولا مدراسی نے مختلف حوالوں کے ساتھ لکھا ہے کہ :سب سے پہلے جو چیز حضرت آدم علیہ السلام پر نازل ہوئی (وہ) حروف ہجا تھے[۲] کیونکہ انہیں خلافت فی الارض کے فرائض تفویض کرنے سے قبل زیور علم سے آراستہ کیا گیا تھا۔ جیسا کہ منقولہ بالا آیت سے واضح ہوتا ہے، محققین نے حضرت آدمؑ پر نازل شدہ حروف تہجی کو "ترتیب تعلیمی" کے عین مطابق قرار دیا ہے اس ترتیب تعلیمی کو، جسے ابجد آدم یا "ابتث آدم" کے نام سے بھی موسوم کیا گیا ہے اور جس میں تمام حرفوں کی قیمت ایک سے ہزار تک مقرر کی گئی ہے، ذیل میں ایک جدول کی شکل میں درج کیا جاتا ہے۔

الفاظ	ابتث				جحخد				ذرزس			
حروف	ا	ب	ت	ث	ج	ح	خ	د	ذ	ر	ز	س
اعداد	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۲۰	۳۰
الفاظ	شصضط				ظعغف				قکلم			
حروف	ش	ص	ض	ط	ظ	ع	غ	ف	ق	ک	ل	م
اعداد	۴۰	۵۰	۶۰	۷۰	۸۰	۹۰	۱۰۰	۲۰۰	۳۰۰	۴۰۰	۵۰۰	۶۰۰
الفاظ	نوھی											
حروف	ن	و	ھ	یٔ								
اعداد	۷۰۰	۸۰۰	۹۰۰	۱۰۰۰								

[۱] ترجمہ مولانا آزاد ترجمان القرآن ۲: ۳۳ ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی ۱۹۶۶ء

[۲] ملہم تاریخ ص ۸ (ترجمہ تخلص تسلیم) از اقتدار احمد ساحر سہسوانی مطلع العلوم مراد آباد ۱۹۱۲ء نیز غرائب الجمل از نواب۔ عبدالعزیز ولا مدراسی ص ۲۵ و ۲۶ عزیز المطابع حیدر آباد ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء

[۳] ملاحظہ ہو ملہم تاریخ ص ۷، غرائب الجمل ص ص ۲۵ و ۳۸ نیز مقالہ فن تاریخ گوئی مولانا میر نذر علی کاکوروی مشمولہ پندرہ شاعر آگرہ ص ۸ بابت یکم ستمبر ۱۹۳۱ء۔

اس جدول سے اندازہ ہوگا کہ اس کے ساتوں کلمے چہار حرفی ہونے کے علاوہ ان میں سے ہر ایک کا پہلا حرف مفتوح، دوسرا مکسور، تیسرا مضموم اور چوتھا ساکن ہے یعنی اَبِتُث، حَجِخُد، ذَرِزُسْ وغیرہ اس لیے راقم الحروف کے خیال میں انہیں ابجد کے بجائے "ابتث آدم" کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ بظاہر ابتث آدم کے یہ کلمات بے معنی معلوم ہوتے ہیں لیکن ممکن ہے سریانی یا عبرانی زبان میں ان کے کچھ معانی و مطالب رہے ہوں۔ [1] ابتث آدمؑ کو کبھی کوئی مقبولیت حاصل نہ ہوسکی اور اگر کبھی کوئی مقبولیت حاصل رہی بھی ہوگی تو وہ طوفانِ نوحؑ کے ساتھ ہی غرقِ آب ہوگئی۔ صاحبِ غرائب الجمل کے خیال میں اگر کوئی تاریخ گو اس ابتث آدمؑ میں تاریک برآمد کرے تو اس پر کوئی اعتراض وارد نہ ہوگا بلکہ اس کا موجد کہلائے گا، بشرطیکہ اس کی صراحت کردے۔ [2] اسے ابجد شمسی بھی کہتے ہیں۔

عربی حروف ہجا کو لکھنے کا جو دوسرا طریقہ رائج ہے اسے ترتیب ابجدی کہتے ہیں۔ فن تاریخ گوئی سے متعلق تصنیفات میں اسے "ابجد نوحی" کے نام سے بھی موسوم کیا گیا ہے اس ابجد نوحی کا دائرہ وسیع ہے چنانچہ اس کے مقررہ اعداد کے ذریعہ تاریخیں برآمد کرنے کے علاوہ دیباچوں اور مضامین کے صفحات پر نمبر لگانے، اُصطرلابوں (Astrolabes) اور گھڑیوں، تعویذ وطلسمات اور فال ورمل کے عملیات اور ٹونے ٹوٹکے وغیرہ کے اعداد لکھنے میں بھی ابجدی حروف ہی کا استعمال ہوتا ہے۔ یورپ میں اس کے لئے رومی (Roman) حروف کا استعمال ہوتا ہے۔ ابجدِ نوحی کے آٹھ کلمات ہیں۔ جن کے حروف کو ان کی عددی قیمتوں کے ساتھ ذیل کی جدول میں درج کیا جاتا ہے:

الفاظ	ابجد				ہوز			حطی		
حروف	ا	ب	ج	د	ہ	و	ز	ح	ط	ی
اعداد	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰

[1] دیکھئے ملہم تاریخ ص ۷ اور غرائب الجمل ص ۳۸

[2] غرائب الجمل ص ۳۸۔ ابتثِ آدم میں اعجاز جود چپوری کی ایک تاریخ ملاحظہ ہو:

حرف میں ہے روح مدغم سی ذرا — اک توجہ چاہئے کم سی ذرا
سن عیاں ہو رنگ پر آئے اگر — "صرف تاب ابجد شمسی ذرا" ۱۹۷۲ء

(دیکھئے نوشتۂ تاریخ از اعجاز جود چپوری ص ۶۹ مطبوعہ دبیر پرنٹنگ پریس حیدر آباد (پاکستان) ۱۹۷۲ء

الفاظ	کلمن				سعفص				قرشت			
حروف	ک	ل	م	ن	س	ع	ف	ص	ق	ر	ش	ت
اعداد	۲۰	۳۰	۴۰	۵۰	۶۰	۷۰	۸۰	۹۰	۱۰۰	۲۰۰	۳۰۰	۴۰۰

الفاظ	ثخذ			ضظغ		
حروف	ث	خ	ذ	ض	ظ	غ
اعداد	۵۰۰	۶۰۰	۷۰۰	۸۰۰	۹۰۰	۱۰۰۰

ابجد نوحی کے ان مروجہ کلمات کو ابجد قمری بھی کہتے ہیں کیونکہ عربوں نے منازلِ قمر کی تعداد بھی اٹھائیس قرار دی ہے۔ قدماء نے بھی کرۂ فلکی کو اٹھائیس منازلِ قمر پر ہی تقسیم کیا تھا[1] اور عربی حروفِ تہجی کی تعداد بھی اٹھائیس ہی ہے۔[2] دلچسپ بات یہ ہے کہ اب اگر مذکورہ بالا جدول پر نظر ڈالی جائے تو ان میں ابجد، کلمن، سعفص اور قرشت چہار حرفی الفاظ ہیں اور باقی تین حرفی یعنی ہوز، حطی، ثخذ اور ضظغ۔ باعتبارِ اعداد ان کا شمار اس طرح ہے کہ "ابجد" کے الف سے "حط" کے طا (طوے) تک بالترتیب تمام نو حرفوں کو ایک سے نو تک اکائی (احاد) کے تحت شمار کیا جاتا ہے اور "حطی" کی "یا" سے "سعفص" کے "صاد" تک نو حروف کو ترتیب وار دہائی (عشرات) کے ذیل میں رکھا جاتا ہے یعنی دس سے نوے تک۔ باقی قاف قرشت سے ظائے ضظغ تک نو حرفوں کو علی قدرِ مراتب سیکڑے (مآت) کے ضمن میں رکھتے ہیں یعنی سو سے نو سو تک اور آخری حرف غ معجمہ کو ہزار (الف) کی قیمت میں شمار کیا جاتا ہے۔

کسی فارسی گو شاعر نے ان ابجدی حروف کی قدروں کو آسانی سے یاد رکھنے کے لئے ذیل کا قطعہ لکھا ہے:

۱۔ ملاحظہ ہو مقالہ "واقعاتِ سیرت نبوی میں توقیتی تضاد اور اس کا حل" از مولانا اصحق النبی علوی رامپوری مشمولہ ماہنامہ برہان دہلی بابت جون ۱۹۶۴ء ص ۳۳۱ نیز شمس المعارف

۲۔ مقدمہ ابن خلدون ۱: ۲۰۵ ترجمہ مولانا راغب رحمانی دہلوی، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ۱۹۸۶ء

یگاں شمار زابجد حساب تا حطی　　　چناں کہ از کلمن دِہ دِہ ست تا سعفص
ولیک از قرشت تا ضظغ بود صد صد　　　دل از حسابِ جمل شد تمام مستخلص [۱]

درگاہ پرشاد نادر کا اردو قطعہ بھی اس سلسلہ میں شہرت رکھتا ہے:

تو ابجد سے حطی تک ایک ایک گن　　　مگر تا بہ سعفص دے دس دس بڑھا
پھر آگے سے سو سو فزوں کرکے یار　　　دل اپنا جمل سے لے نادر چھڑا [۲]

محوّلہ بالا دونوں قطعات مفہوم کے اعتبار سے یکساں ہیں۔ چنانچہ جیسا کہ ذکر کیا گیا، عربی حروف تہجی (ہجا) کی اس تحریری شکل میں ابجد سے حطی تک ایک ایک عدد کا اضافہ کرتے ہوئے تمام دس حروف کے ایک سے دس تک "عدد" شمار کئے جاتے ہیں یعنی الف کا ایک، بائے موحدہ کے دو، جیم تازی کے تین، دال مہملہ کے چار، ہائے ہوز کے پانچ، واو کے چھ، زائے معجمہ کے سات، حائے حطی کے آٹھ، طائے مہملہ کے نو اور یائے تحتانی کے دس۔ اسی طرح کلمن سے سعفص تک دس دس عدد زائد کرتے ہوئے کاف عربی کے بیس، لام کے تیس، میم کے چالیس، نون کے پچاس، سین مہملہ کے ساٹھ، عین مہملہ کے ستّر، "فا" کے اسّی اور صاد مہملہ کے نوے عدد محسوب ہوں گے یعنی یائے حطی سے سعفص کے صاد تک دہائیوں کے حروف ہیں، باقی قرشت سے ضظغ کی ظوئے (ظائے معجمہ) تک نو حروف عشرات میں شامل ہیں۔ جن پر سو سو عدد بڑھائے جائیں گے اس طرح ترتیب وار قاف قرشت کے سو، رائے مہملہ کے دو سو، شین معجمہ کے تین سو، تائے فوقانی کے چار سو، ثائے مثلثہ کے پانسو، خائے منقوطہ کے چھ سو، ذال معجمہ کے سات سو، ضاد معجمہ کے آٹھ سو اور ظائے منقوطہ کے نو سو نیز آخری حرف غین معجمہ کے ایک ہزار اعداد ہوں گے۔

واضح ہو کہ ان مُمِدِ حفظ آٹھوں کلمات کے حروف و اعداد کا یہ تعلق طبعی اور عقلی نہ ہو کر محض وضعی ہے۔ [۳]

۱۔ لغاتِ ہیرا ص ۹ و ۴۳۱ مؤلفہ منشی لچھمن لال بدایونی سیٹھ ہیرالال پرنٹنگ ورکس علی گڑھ۔ مگر میر کرامت اللہ نے تیسرے مصرع کی قرأت "ولیکن از قرشت تا ضظغ شمر صد صد" لکھی ہے۔ ملاحظہ ہو "مقالہ ابجد کی ایجاد" مشمولہ زمانہ کانپور ۱۹۰۱۸ء ص ۳۰۶ حاشیہ نمبر ا۔

۲۔ "مراۃ خیالی" ص ۱۱۸ بحوالہ صنادید تاریخ گوئی از ڈاکٹر محمد انصار اللہ ص ۲۴۸ مشمولہ مجلّہ دانش ویژہ نمبر ۵-۷

۳۔ مقدمہ ابن خلدون ۲: ۴۱۲ (اردو ترجمہ)

ولا مدراسی نے لکھا ہے کہ کلماتِ ابجد کو بعض حضرات نے بے معنی قرار دیا ہے یعنی صرف اعلام (علامت و نشان) جب کہ بعض محققین ان کو بامعنی خیال کرتے ہیں، ان حضرات نے یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ یہ ان کے قلتِ علم کی دلیل ہے۔[1] یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں، تاہم ان کلمات کی معنویت کے متعلق مولانا غیاث الدین کے خیالات کا مطالعہ ضروری ہے۔

مولانا موصوف نے ابجد نوحی کے جملہ کلمات کے معنی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

ابجد:- "اَیْ اَبِیْ وَجَدَّ فِیْ الْمَعْصِیَةِ" یعنی "پدر من کہ آدمؑ بود یافتہ شد در گناہ یعنی گناہے از وے بوجود آمد" مطلب یہ کہ میرا باپ جو کہ آدمؑ تھا گناہ میں پایا گیا یعنی ان سے گناہ سرزد ہوا۔

ہوز:- "اَیْ اتَّبَعَ هَوَاهُ" یعنی "پیروی کرد ہوائے نفسانی خود را" یعنی اس (آدمؑ) نے اپنی خواہشاتِ نفسانی کی پیروی کی۔

حطی:- "اَیْ حَطَّ ذَنْبُهُ بِالتَّوْبَةِ وَالْاِسْتِغْفَارِ" یعنی "گم کردہ شد گناہِ او بتوبہ کردن واستغفار" یعنی اس کا گناہ اس کی توبہ واستغفار سے کھو دیا گیا۔

کلمن:- "اَیْ تَکَلَّمَ بِکَلِمَةٍ فَتَابَ عَلَیْهِ بِالْقُبُوْلِ وَالرَّحْمَةِ" یعنی "کلام کردہ بکلمہ پس قبول شد توبۂ او" یعنی ایک کلمہ سے اس نے کلام کیا پس اس کی توبہ قبول ہوئی پروردگار کی رحمت سے۔

سعفص:- "اَیْ ضَاقَ عَلَیْهِ الدُّنْیَا فَاُفِیْضَ عَلَیْهِ" یعنی "تنگ شد بر و دنیا پس ریختہ شد برو" یعنی "دنیا اس پر تنگ ہوئی اس لئے (توبہ کرنے کے بعد) اس پر (دنیا) بہادی گئی" مطلب یہ کہ بہت دی گئی۔

قرشت:- "اَیْ اَقَرَّ بِذَنْبِهِ فَشَرُفَ بِالْکَرَامَةِ" یعنی "اقرار کرد بگناہِ خویش پس شرف بکرامت یافت" یعنی "اپنے گناہ کا اقرار کیا اس لئے بزرگی اور عظمت سے مشرف ہوا۔

ثخذ:- "اَیْ اَخَذَ مِنَ اللّٰهِ قُوَّةً" یعنی "گرفت از حق تعالیٰ قوت را" یعنی "اللہ تعالیٰ سے اس نے قوت حاصل کی"۔

---

[1] غرائب الجمل ص ۱۴۱

ضظغ:- " اَیْ سَدَّ عَنْهُ نَزْغُ الشَّیْطَانِ بِالْعَزِیْمَۃِ " یعنی " بند شد از و نزغ الشیطان بعزیمت اے بکلامِ حق و توحید [۱] " یعنی " اس سے شیطان کا فساد اور وسوسہ (نزغ) کلامِ حق اور توحید کی برکت سے روک دیا گیا یا عزیمتِ کلامِ حق و توحید کے سبب اس سے شیطان کا شر دور ہوا"،

کلماتِ ابجد کے مزکورہ معانی کے علاوہ درجِ ذیل معانی بھی بتلائے گئے ہیں:

ابجد:- " آغاز کرد " یعنی شروع کیا۔ ھوز:- " در پیوست " یعنی مل گیا یا ملادیا۔ نیز آپس میں جوڑدیا۔ حطی:- " واقف شد " یعنی واقف ہوا۔ کلمن:- " سخن گو شد " یعنی سخن گو ہوا۔ سعفص:- " ازو آموخت " یعنی اس نے سیکھا۔ قرشت:- " ترتیب کرد " یعنی ترتیب دیا۔ ثخذ:- " نگاہ داشت " یعنی نگاہ رکھا گیا، حفاظت کیا گیا یا محفوظ رکھا۔ ضظغ:- تمام کرد [۲] " یعنی تمام کیا۔

کلماتِ ابجد کے ان ثانی الذکر معانی کے متعلق درد کاکوروی نے لکھا ہے کہ اصلاً یہ کلمات انبیائے کرام پر نازل ہوئے تھے اس لئے ان کا مطلب جاننے والا اور ان کا موجد اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں [۳]۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا مذکورہ ترتیب حروف تہجی کو "ابجد نوحی" بھی کہتے ہیں لیکن ترتیب "ابتثِ آدم" اور اس ترتیب میں حروف کی تعداد یکساں (اٹھائیس) ہے۔ چنانچہ یہی ابجد نوحی عربی رسم الخط والی تمام زبانوں، خصوصاً فارسی اور اردو زبان میں بھی مروّج ہے، لیکن یہاں اس جانب بھی اشارہ ضروری ہے کہ اہلِ فارس نے پ، چ، ژ اور گاف کا اضافہ کرکے اپنے حروفِ تہجی کی تعداد بتیس ۳۲ کرلی ہے اور شناخت کے لئے ان اضافہ شدہ حروف کے نام بھی بائے فارسی، جیم فارسی، زائے فارسی اور کافِ فارسی یا کافِ بربری [۴] رکھے ہیں۔ اردو میں فارسی کے ان حروف

---

[۱] و [۲] غیاث اللغات، ص۱۱ مطبع اودھ اخبار کانپور مارچ ۱۹۰۴ء۔ اس فن کی دیگر کتابوں میں بھی ان کلمات کے معنی غیاث اللغات ہی سے لئے گئے ہیں۔ البتہ میر مہدی حسین ناصری اور منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی نے سعفص کے معنی " زود بیاموخت " یعنی جلد سیکھ لیا اور ثخذ کے معنی " در دل گرفت " یعنی دل میں پکڑ لیا یا لے لیا، بتلائے ہیں۔ ملاحظہ مخزن الفوائد ص ۳ مشن پریس الہ آباد ۱۹۲۲ء اور ملہم تاریخ ص ۶ [۳] آیہ کریمہ " من الشیطان نزغ " ... (۴۱:۳۶) سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے، نیز عزیمت اصطلاح صوفیا میں اس ورد یا دعا کو کہتے ہیں جسے خطِ حصار کے اندر بیٹھ کر پڑھتے ہیں تاکہ بلیات حصار کے اندر نہ آسکیں۔

کے علاوہ تین ہندی حرفوں ٹ، ڈ اور ڑ کا بھی اضافہ کیا گیا ہے اور اس طرح اردو کے حروفِ تہجی کی تعداد پینتیس ہو گئی۔ ان اضافہ شدہ حروف کی عددی قیمت وہی ہے، جو عربی میں ان کے ہم شکل حرفوں کی ہے۔ اس وضاحت کے لئے ذیل کا نقشہ ملاحظہ فرمایئے:

عربی حروف	ب	ج	د	ز	ک	ر	ت
ایزادِ فارسی	پ	چ	-	ژ	گ	-	-
ایزادِ اردو	-	-	ڈ	-	-	ڑ	ٹ
اعداد	۲	۳	۴	۷	۲۰	۲۰۰	۴۰۰

اس سے اندازہ ہوگا کہ اردو، فارسی کے ان اضافی حروف کی قیمت عربی میں ان سے پہلے آنے والے حرفوں کی قیمت کے برابر ہے۔

کہا جاتا ہے کہ دنیا کی سب سے قدیم زبان عربی ہے۔ حافظ الحدیث علامہ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ) نے اپنی تصنیف "کتاب المزہر" میں عبدالملک بن حبیب کے حوالے سے لکھا ہے کہ سب سے پہلی زبان عربی تھی جو حضرت آدمؑ پر نازل ہوئی [۲]۔ حضرت آدمؑ نے اپنے بیٹے ہابیل کی شہادت پر جو کلمات کہے اُسے بعض حضرات مرثیہ کہتے ہیں۔ لیکن بعضے اسے اسلوبِ نثر بھی تسلیم کرتے ہیں، مگر مرثئے کے عربی زبان میں ہونے سے کسی کو انکار نہیں۔ [۳]

زبان کی ابتداء کے سلسلہ میں دیگر نظریات کی نسبت یہ قدیم ترین نظریہ ہے جس کی

۱۔ مقالہ "حروف تہجی شناخت اور تعداد" از سلیم شہزاد مشمولہ ماہنامہ کتاب نما، نئی دہلی اگست ۱۹۸۶ء ص ۲۳ و ۲۵، صحیفۂ خوشنویساں از مولانا احترام الدین شاغل عثمانی ص ۲۳۴ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی ۱۹۸۷ء لیکن مولوی عبدالحق صاحب نے یہ تعداد پچاس، مولوی سید احمد دہلوی نے اردو حروف کی مجموعی تعداد پچپن اور ان سے بہت پہلے سید انشاء اللہ خاں انشاء نے پچاسی لکھی تھی، دیکھئے حسبِ ترتیب اردو قواعد ۳۸، ۴۲ تاج پبلشرز دہلی سنہ درج نہیں، فرہنگ آصفیہ ۱:۷ ترقی اردو بورڈ نئی دہلی ۱۹۷۴ء نیز دریائے لطافت، ترجمہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی مرتبہ مولوی عبدالحق ص ۱۳۱، ۱۳۴ انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی ۱۹۸۸ء، مگر محمد اسحٰق صدیقی ۳۸ بتلاتے ہیں دیکھئے فن تحریر کی تاریخ ص ۱۳۔

۲۔ مقالہ فن تاریخ گوئی مشمولہ پندرہ روزہ شاعر آگرہ یکم ستمبر ۱۹۳۱ء ص ۸

۳۔ برائے تفصیل ملاحظہ کیجئے مآثر الکرام ۲: ۱۱ و ۱۲ مصنفہ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی حیدر آباد دکن ۱۹۱۳ء ص ۱۲ پر مرثیہ کے تین شعر بھی دیئے ہیں نیز گلستانِ سخن از مرزا قادر بخش قادر ص ص ۷۵ و ۷۷ مطبوعہ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۲ء اور فرہنگ آصفیہ ۱: ۵۵۔

بنیاد بلا شبہ الوہیت یا الہام پر ہے۔ یہود و ہنود بھی اپنی قدیم زبانوں کے متعلق اسی قسم کا خیال رکھتے ہیں۔ انگریز مستشرق ہرڈر نے ۱۷۷۲ء میں زبانوں کے اس الوہی نظریہ پر دو اعتراضات وارد کئے ہیں، اوّلاً یہ کہ زبان خدا کی تخلیق ہوتی تو وہ بہت با قاعدہ ہوتی لیکن تمام زبانوں میں عجب بے اصولی و بے ترتیبی پائی جاتی ہے۔ ثانیاً یہ کہ زبان میں بنیادی الفاظ فعل کے مادّہ ہیں جن سے متعدد اسماء کا اشتقاق ہوتا ہے۔ اگر خدا تخلیق کرتا تو ماجرا برعکس ہوتا (اور) وہ انسان کو سب سے پہلے چیزوں کے نام سکھاتا، فعل بعد میں آتے۔[۱] سر دست یہاں ہرڈر کے پہلے اعتراض سے ہمیں کوئی سروکار نہیں، البتہ دوسرے اعتراض کے سلسلہ مین کہا جا سکتا ہے کہ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر عربی زبان کی قدامت اور الوہی نظریہ کا اقرار کر رہا ہے کیونکہ قرآن کریم میں برملا اعلان کیا گیا ہے کہ: "اور سکھلا دیے اللہ نے آدمؑ کو نام سب چیزوں کے"[۲] یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو پہلے تمام چیزوں کے نام ہی سکھائے تھے، ذاتی و صفاتی نام بھی نیز اشیاء کی حقیقت اور اوصاف و خواص بھی۔[۳] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ نے انسانِ اول کو بجائے افعال (Verbs) کے ابتداءً چیزوں کے نام (Nouns) ہی سکھلائے اور یہ نام بھی عقیدۂ اسلامی کی رو سے عربی زبان میں تھے۔ علامہ سیوطی کا حوالہ پہلے آچکا ہے، انہوں نے بھی اپنی تصنیف "کتاب المزہر" میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حضرت آدمؑ پر سب سے پہلی زبان عربی ہی نازل ہوئی مگر امتدادِ زمانہ کے سبب سُریانی ہوگئی جو ملک سوران سے منسوب ہے۔ سوران ایک جزیرہ تھا جس میں حضرت نوحؑ اور ان کی قوم طوفانِ نوح سے پہلے رہتے تھے اور جو عذابِ الٰہی کے سبب طوفان میں غرقاب ہوگیا[۴]۔

کہتے ہیں کہ یہیں آدمؑ پر ماہ صیام کی پہلی شب میں دس صحیفے (بیس ورق میں) نازل ہوئے، جن میں حروف معجم (ابتث) اور حروف مقطعات کی سورۃ تھی[۵]۔

حروف مقطعات قرآن پاک کی انتیس سورتوں[۶] کے اوائل میں بھی آئے ہیں، مثلاً

---

[۱] لسانی مطالعے از ڈاکٹر گیان چند جین ص ۳۶، ترقی اردو بیورو نئی دہلی ۱۹۷۷ء
[۲] آیت شریفہ "وعلم آدم الاسماء کلہا... الخ" ۲:۳۱ ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ۔
[۳] تفسیر ابن کثیر اردو ص ۹۵ کتب خانہ ہاشمیہ دیوبند یوپی نیز تفسیر حقانی "الم" کی تفسیر کے تحت۔
[۴] غرائب الجمل ص ۲۷۔ [۵] ملاحظہ ہو "طلائع المقدور من مطالع الدہور" ص ۶ از نواب سید محمد صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی مطبع "الکائنۃ" بھوپال ۱۳۰۱ھ نیز مقالہ "فن تاریخ گوئی" از درد کاکوروی مشمولہ پندرہ روزہ شاعر آگرہ یکم ستمبر ۱۹۳۱ء ص ۸
[۶] برائے تفصیل ملاحظہ ہو: The meaning of the Glorious Quran by Abdullah Yusuf Ali 1:118-120 Appendix 1

الٓمٓ، حٰمٓ، طٰہٰ، یٰس، الٓرٰ وغیرہ، یہ کل چودہ حروف ہیں جو عربی کے تمام حروف تہجی کی مجموعی تعداد کا نصف ہیں یعنی "ا، ح، ر، س، ص، ط، ع، ق، ک، ل، م، ن، ہ اور ی" اگر ان حروفِ مقطعات کی ترکیب سازی کی جائے تو یہ بامعنی عبارت تشکیل پاتی ہے: "نص حکیم قاطع لہ سر"[1] یعنی "دانش سے (بھرپور) نص جو دلیل قاطع ہے اور جس میں اسرار ہیں" علامہ ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) نے "الٓمٓ" کی تفسیر کے ذیل میں بعض دوسری باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھا ہے کہ "الف" سے مراد ایک سال ہے اور "لام" سے تیس سال نیز "میم" سے چالیس سال[2]۔ گویا اہلِ عرب حروفِ ابجد کی عددی قیمتوں سے واقف تھے۔ جس کی تائید امام السیر والمغازی محمد بن اسحٰق بن یسار (م ۱۵۰ھ / ۱۵۱ھ) جن کا شمار سیرتِ نبویؐ کے اولین مؤلفین میں ہوتا ہے، کی بیان کردہ اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ ابویاسر بن اخطب یہودی اپنے چند ساتھیوں کو لے کر ایک روز نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ اس وقت سورۂ بقرہ (مدنی) کی ابتدائی آیات "الٓمٓ" ذالك الكتب لاريب فيه ... الخ" کی تلاوت فرمارہے تھے۔ وہ اسے سن کر اپنے بھائی حی بن اخطب کے پاس گیا اور کہا کہ میں نے آج حضورِ اکرمؐ کو یہ آیات تلاوت کرتے ہوئے سنا ہے۔ اس نے پوچھا کیا تو نے خود سنا؟ یاسر کے اثبات میں جواب دینے پر حی بن اخطب اپنے پاس جمع سب یہودیوں کو لے کر حضورِ انورؐ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ کیا یہ سچ ہے کہ آپ "الٓمٓ" کی تلاوت فرمارہے تھے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں سچ ہے۔ جواب سن کر حی بن اخطب نے کہا: آپ سے پیشتر جتنے نبی آئے ان میں سے کسی کو بھی نہیں بتلایا گیا تھا کہ اس کا ملک اور مذہب کب تک رہے گا؟ لیکن آپ کو بتلادیا گیا اور کھڑے ہو کر لوگوں سے کہنے لگا۔ سنو! الف کا عدد ہوا ایک، لام کے تیس اور میم کے چالیس، میزان اکہتر ہوا اور اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا کیا تم اس نبی کی تابع داری کرنا چاہتے ہو جس کے ملک اور امت کی مدت کل اکہتر سال ہو۔ پھر حضورِ اکرمؐ کی طرف متوجہ ہو کر دریافت کیا کہ کیا کوئی اور آیت بھی ایسی ہے؟ آپؐ نے فرمایا:

---

[1] تفسیر ابن کثیر (اردو) پارہ (۱) ص ۴۸، مقدمہ ابن خلدون ۲: ۱۸۶ علامہ موصوف نے حروف مقطعات سے مرکب فقرہ "الم یسطع نص حق کرہ" بتلایا ہے

[2] تفسیر ابن کثیر اردو ص ۷۴ سورۂ بقرہ پارہ (۱)

ہاں " المص " یہ سن کر حی کہنے لگا یہ بڑی بھاری اور لمبی ہے . . . جس کے اعداد کا میزان ایک سو اکسٹھ ہوتا ہے۔ اس نے پھر پوچھا کیا اور بھی کوئی ایسی آیت ہے۔ آپؐ نے فرمایا: " الر " وہ کہنے لگا یہ بھی بہت طویل ہے جس کے کل عدد دو سو اکیس ہوتے ہیں۔ کیا اس کے ساتھ کوئی اور ایسی آیت بھی ہے ؟ سرورِ عالمؐ نے فرمایا: ہاں " المر " حی نے تعجب سے کہا: یہ تو بہت ہی بھاری ہے جس کے حروف کا مجموعہ دو سو اکہتر ہوتا ہے۔ اب تو کام بڑا مشکل ہو گیا اور بات خلط ملط ہو گئی۔ لوگو چلو! ابو یاسر نے اپنے بھائی اور دوسرے علمائے یہود سے کہا کہ کیا تعجب ہے کہ ان تمام حرفوں کا مجموعہ حضرت محمد صلعم کو ملا ہو جن کے اعداد کا میزان سات سو چونتیس سال ہوتا ہے۔ [1]

منقولہ بالا احادیث سے یہ باور کرنے میں کوئی اشکال نہیں کہ قرآن مجید حسبِ جُمل پر مبنی معجزات کا بھی حامل ہے۔ نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ عرب بشمول یہود حسابِ ابجد سے قوموں کے زمانۂ حکومت اور ان کے عروج و زوال کا حساب اور اندازہ بھی لگایا کرتے تھے۔

ادب و تاریخ کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں کلمات ابجد اتنے عام تھے کہ عرب کے صحرا نشین (بدوی) بھی ان سے واقف تھے۔ ایک بدوی جب دربار میں آیا اور خلیفہ ثانیؓ نے اس سے قرآن اچھی طرح پڑھنے کی بابت پوچھا تو اس نے عرض کیا کہ ہاں۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ سورۂ فاتحہ پڑھ کر سناؤ، تو اس نے گستاخانہ جواب دیا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے اس کے درّہ مارا اور سورۂ فاتحہ لکھ کر دی۔ یہ سورۃ لے کر بدوی اپنے قبیلہ میں بھاگ گیا اور گاؤں والوں سے کہا:

اتیت مہا جرین فعلمونی ثلاثۃ احرف متتابعات

وخطوالی "اباجاد" وقالوا تعلیم "سعفصا وقریشمیات"

وما انا والکتابۃ و التہجی وما خط البنین مع البنات [2]

---

[1] دیکھئے تفسیر ابن کثیر اردو ص ۱: ۳۸ مطبع مصطفیٰ محمد مصر ۱۳۵۶ھ تفسیر حقانی آیت "الٓمٓ" کی تفسیر کے تحت، مقدمہ ابن خلدون ۲: ۱۸۷ مترجمہ راغب رحمانی دہلی ۱۹۸۷ء، مقالہ فن تاریخ گوئی از مولانا میر نذر علی درد کاکوروی مشمولہ پندرہ روزہ "شاعر" آگرہ بابت ۱۵؍ اگست ۱۹۳۱ء ص ۸، نواب عبدالعزیز والا مدراسی نے اس حدیث کو محمد بن اسحٰق کی "سیرۃ" کے علاوہ امام بخاری کی تصنیف کتاب التاریخ، شیخ ابو محمد عبدالملک بن ہشام الحمیری کی کتاب السیرۃ قاضی بیضاوی کی تفسیر بیضاوی، جلال الدین سیوطی کی شواہد الافکار اور تفسیر درّ منثور کے حوالہ جات سے بھی بیان کیا ہے ملاحظہ ہو غرائب الجمل ص ۱۷ نیز فن تاریخ گوئی از کیپٹن منظور حسن ص ۳۳ گلوب پبلشر لاہور ۱۳۸۷ھ بحوالہ تفسیر فتح العزیز از شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی۔

[2] مقالہ "علم الکتابت، یا ابجد کی تاریخ" از مولانا عبدالرزاق مشمولہ ماہنامہ زمانہ کانپور فروری ۱۹۲۸ء ص ۱۹

ترجمہ: یعنی میں مہاجرین کے پاس آیا تو انہوں نے مجھ کو پے در پے تین حرفوں کی تعلیم دی اور میرے لیے ابو جاد لکھ کر کہا کہ تم سعفص اور قریشیات کو سیکھو، حالانکہ مجھ کو لکھنے اور ہجے کرنے سے سروکار نہیں ہے اور نہ لڑکیوں کے ساتھ لڑکوں کو لکھنے سے۔ (ترجمہ کے لیے راقم مولانا قاضی اطہر مبارکپوری صاحب مرحوم کا شکر گزار ہے۔ مکتوب بنام راقم مورخہ ۷، ۲ مارچ ۱۹۹۶ء)

کلمات ابجد کی ایجاد سے متعلق مختلف روایات

ابجدی ترتیب کے ان آٹھ کلمات کی ایجاد اور ان کے موجد کے بارے میں اس فن کی دیگر تصنیفات اور لغات کی کتابوں میں مختلف روایات ملتی ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

(۱) مسلمانوں کے عقیدہ کی رو سے حروف تہجی (ابجدین) منزل من اللہ ہیں جو مع عددی قیمت سب سے پہلے حضرت آدمؑ پر نازل ہوئے۔ جسے ابتث آدم یا آدمی ابجد کہتے ہیں۔ بعد ازاں حضرت نوحؑ پر ایک نئی ترتیب میں نازل ہوئے اور یہی رائج الوقت ابجد ہے جو ہماری تاریخ گوئی کی بنیاد ہے اور ابجد نوحی کہلاتی ہے[۱] ایک دوسری روایت کے مطابق یہ تحریر حضرت شیثؑ پر نازل ہوئی۔ [۲] اس کے برخلاف بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ ابجد حضرت ادریسؑ کی ایجاد ہے جنہوں نے عربی کے اٹھائیس حروف کو ترتیب دیکر آٹھ بامعنی کلمے بنائے۔ [۳] اسی لئے اسے ابجد ادریسی بھی کہتے ہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ابجد کے آٹھوں کلمات سُریانی (Syriac) زبان کے الفاظ ہیں جو حضرت آدمؑ، نوحؑ، ادریسؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰ علی نبینا پر نازل ہوئے۔ لیکن سریانی کو دوام حاصل نہ ہو سکا اور اس کی جگہ عبرانی نے لے لی۔ [۴]

(۲) کیپٹن منظور حسن کے خیال میں ابجد کے یہ کلمات الہامی ہیں۔ جملہ انبیاء کرام کو اس حساب کی تعلیم بذریعہ وحی ملتی رہی، چنانچہ اس کی ایجاد کا سہرا نبی اول حضرت آدمؑ کے سر ہی بندھتا ہے۔ [۵]

(۳) مذکورہ روایات کے سلسلہ میں کسریٰ منہاس کہتے ہیں کہ "اگر تاریخی اعتبار سے اس مسئلے کا

---

[۱] خیابان تاریخ از سید محمد علی جویا مراد آبادی ص ۷۹۶ مطبع نولکشور لکھنو، غرائب الجمل ص ۱۸
[۲] خیابان تاریخ ص ۷
[۳] تفہیم تاریخ ص ۶ نیز فرہنگ آصفیہ ا: ۸۴ سید احمد دہلوی ترقی اردو بورڈ ایڈیشن ۱۹۷۴ء فن تاریخ گوئی اور اس کی روایت ص ۹ مصنفہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۸۴ء
[۴] غرائب الجمل ص ۷ و ۸۱ بحوالہ شمس المعارف
[۵] فن تاریخ گوئی صفحات ۲۳ تا ۲۵

جائزہ لیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہماری ابجد فیضان ہے حضرت علیؓ کا جو اسلامی عقیدہ کے مطابق باب علم تھے..... (جسے ایک واسطے سے ان کے) ایک شاگرد ابوادریس احمد بن احمد بن کو احمد ئی..... (نے) ایک نئی ترتیب دے کر ہر حرف کی جداگانہ قیمت مقرر کردی.... (اسے ہی)..... ابجد نوتی یا ابجد ادریسی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔"[1] لیکن حضرت علیؓ کے بارے میں یہ قول اس لئے محلِ نظر ہے کہ اگر موجودہ ابجد حضرت علیؓ کا فیضان ہے تو اسلامی عقیدہ کی رو سے نبی اکرمؐ ہی کو اس کا سرچشمہ کیوں نہ تسلیم کیا جائے کیونکہ اگر حضرت علیؓ "باب علم" تھے تو آنحضرتؐ "مدینۃ العلم" جیسا کہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ:

"انا مدینة العلم وعلی بابها" (میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ) نیز "انا دارالحکمة وعلی بابها"[2] (میں حکمت کا گھر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ) اور پھر یہ سلسلہ نبی اول حضرت آدمؑ پر جاکر منتہی ہوتا ہے۔

(۴) مولانا غیاث الدین صاحب کا قول ہے کہ "...... وبعضے نوشتہ کہ اباجاد نام بادشاہے بود کہ ابجد مخفف آنست وہفت کلماتِ باقی اسمائے ہفت فرزندانِ اوست چنانچہ در صراح وغیرہ تصریح آں کردہ اند وبعضے نوشتہ کہ مرامر نام مردے بود کہ خط نوشتن ایجادِ اوست ایں ہشت کلمات اسامی ہشت فرزندانِ اوست۔[3]

ترجمہ: اور بعض لکھتے ہیں کہ اباجاد ایک بادشاہ کا نام تھا ابجد اس کا مخفف ہے اور باقی سات کلمات ابجد اس کے سات بیٹوں کے نام ہیں۔ چنانچہ صراح (جمال القرشی کی لغت) وغیرہ میں اس کی تصریح کی گئی ہے اور بعض نے لکھا ہے کہ مرامر نام کا ایک شخص تھا جس نے لکھنے کا فن ایجاد کیا، یہ آٹھ کلماتِ ابجد اسی کے آٹھوں بیٹوں کے نام ہیں۔

(۵) طامس پیٹرک ہوفز (Hughes) عربی زبان کے مشہور لغت القاموس مؤلفہ مجد الدین فیروز آبادی کے حوالے سے لکھتا ہے کہ ابجد کے پہلے چھ کلمات مدین کے چھ مشہور

---

[1] دیکھئے فنِ تاریخ گوئی ص ۲۳ تا ۲۵ نقوش پبلشرز لاہور ۱۹۸۹ء

[2] ملاحظہ ہو مقالہ "معارف الحدیث" (کتاب المناقب والفضائل) از مولانا محمد منظور نعمانی مشمولہ ماہنامہ الفرقان لکھنو اکتوبر ۱۹۸۸ء ص ۳۰

[3] غیاث اللغات ص ۱۱

بادشاہوں کے نام ہیں اور آخری دو کلمات (ثخذ وضظغ) کا عربوں نے بعد میں اضافہ کیا۔ لیکن بعض کہتے ہیں کہ یہ آٹھوں کلمات ابجد عربی حروف کے مخترع مُرامر بن مُرا کے آٹھ بیٹوں کے نام ہیں۔ ۱؎ اس کے علاوہ بعض حضرات نے ان کلمات کو دیووں، شیاطین اور جنوں کے نام سے منسوب کیا ہے۔ ۲؎

(۶) میر کرامت اللہ کے نزدیک الفاظ ابجد کا موجد ابوادریس احمد بن احمد بن احمد کوفی ہے، جس نے اہل روما کی تقلید میں عربی حروف ابجد کو ایک سے ہزار تک اعداد سے نسبت دی اور اسی بنا پر لوگوں نے اس کا نام ابجد ادریس رکھا۔ ۳؎

(۷) علامہ عنایت اللہ مشرقی اہل بابل کو ابجد کا موجد مانتے ہیں۔ ۴؎

(۸) ڈاکٹر حسن الدین احمد (حیدر آباد) کے نزدیک حسابِ جمل عربوں سے پہلے ہندوستان میں رائج تھا چنانچہ سنسکرت حروفِ تہجی میں مفرد حروف کے علاوہ مخلوط حروف کی قیمت بھی متعین ہے اور سنسکرت میں اسی وجہ سے حروف کے مقابل اعداد ایک سے لے کر ایک سنکھ تک ہیں۔ جسے اشاراتی علم (Nomeroleg) یا سنکیت ودیا کہتے ہیں۔ اس سے مختلف ڈاکٹر موصوف یہ نظریہ بھی پیش کرتے ہیں کہ ابجد کی ایجاد فنیقی قوم نے کی کیونکہ ان کا جہاز رانی سے گہرا تعلق تھا اور وہ فاصلوں کی پیمائش کے سلسلہ میں اعداد کے بجائے حرفوں کو کام میں لاتے تھے اور مجموعہ حروف سے جن کی انہوں نے قیمت مقرر کر رکھی تھی، کلمے بناکر فاصلوں کا حاصل جمع ظاہر کیا کرتے تھے۔ ۵؎

(۹) بقول شیخ محمد اکرام اہل عرب حسابِ ہندی نیز ارقامِ ہندیہ سیکھنے سے پہلے اعداد کو لفظوں میں لکھتے تھے پھر حروفِ ابجد میں لکھنے لگے۔ ۶؎

۱؎ Cit: Doctionary of Islam P.3 By Thomas Patrick Hughes Ist Indian Edition 1976 New Delhi

۲؎ فن تاریخ گوئی اور اس کی روایت ص۹ نیز انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ۱:۹۸ (A.B) ۱۹۶۰ء

۳؎ برائے تفصیل دیکھئے مقالہ ابجد کی ایجاد، ماہنامہ زمانہ ۱۹۰۸، ص۳۰۵ و۳۰۶، معلم تاریخ از منشی اودھم سنگھ امرتسری ص ۱۲ خادم التعلیم اسٹیم پریس امرتسر ۱۹۱۲ء اور کسری منہاس ص ۲۳ تا ۲۵

۴؎ فن تاریخ گوئی از کیپٹن منظور حسن ص۲۹، فن تحریر کی تاریخ ص۱۶۸ تا ۱۶۹۔

حـ لیکن ابن ندیم نے حروف روادف ث، خ، ذ، ظ، ش، غ (ثخذ، ظشغ) بتلائے ہیں (دیکھئے الفہرست ابن ندیم ۱.۶ طبع مصر)

۵؎ مقالہ تاریخ گوئی غیر مطبوعہ ورق ۴

۶؎ آب کوثر ص ۳۲ مصنفہ محمد اکرام تاج کمپنی دہلی ۱۹۸۷ء

(۱۰) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ابجد کی ایجاد فنیقی [1] (Phoenician) قوم نے کی جو بحر روم کے مشرقی ساحل پر فسلطین کے شمال (بائیں جانب) میں آباد تھی اور اس زمانہ میں یہ علاقہ فنیقیہ کہلاتا تھا۔ خط کی تیسری ارتقائی منزل جسے ابجد کہتے ہیں، فنیقی زبان ہی سے آئے ہیں۔ فنیقیوں نے ہر ایک حرف کو کسی جانور یا چیز کے نام کی پہلی آواز کے برابر مقرر کیا اور اس اسم کو حرف کا نام دے دیا۔ اس طرح پہلے حرف کو الف قرار دیا جس کے معنی بھینس یا بیل کے ہیں اور چونکہ الف کی پہلی آواز "آ" تھی اس لیے الف نام ہوا۔ دوسرا حرف فنیقیوں نے "بت" قرار دیا جو عربی لفظ بیت کی اصل ہے اور گھر کے معنی دیتا ہے لہٰذا "الفابت" یا "الفباء" کی اصطلاح انہیں دو فنیقی لفظوں سے بنی ہے باقی حروف بھی اسی ترتیب سے بنائے گئے ہیں۔ [2] لیکن سامی زبان جو فنیقی سے قدیم تر ہے اس میں بھی حروف ہجا کی ترتیب بعینہٖ موجود ہے اور یہ دونوں خط بنیادی طور پر ایک ہیں۔ [3]

(۱۱) ایجادِ ابجد کے سلسلہ میں نواب عبدالعزیز ولامدراسی نے حدیثِ حروفِ مقطعات کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ حسابِ جمل قدیم زبانوں مثلاً عبرانی زبان وغیرہ کا مشہور فن ہے اور توریت میں بکثرت استعمال ہوا ہے جیسا کہ حضرت یعقوبؑ کے ۶۱۳ احکام کو (توریت میں) "تریغ" مصوب کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اور لفظ "تریغ" میں "عین" کے تین عدد شمار کیے ہیں۔ [4]

(۱۲) کیپٹن منظور حسن اس فن کو عجمیوں کی ایجاد بتلاتے ہیں لیکن ان کے نزدیک یہ دعویٰ اسی طرح بلا دلیل ہے جس طرح یہ دعویٰ کہ یہ فن عربوں کی ایجاد ہے اور کہتے ہیں کہ حسابِ جمل کے موجد کی نسبت کچھ سراغ نہیں ملتا کہ اعدادِ ابجد کس بزرگ کی عالی دماغی کے مرہونِ منت ہیں [5] منظور حسن صاحب کا یہ خیال غالباً میر غلام علی آزاد بلگرامی سے ماخوذ ہے جن کے نزدیک یہ پتا نہیں چلتا ہے کہ حسابِ جمل کا واضع کون ہے اور حروفِ تہجی کے بالمقابل اعداد کو کس نے قائم کیا۔ [6] (جاری)

---

[1] فنیقی قوم کو عبرانی میں کنعانی اور آرامی بھی کہتے ہیں، اہل عرب ان کو ارم کہتے ہیں، قرآن پاک میں بھی ان کا نام ارم آیا ہے (سورۂ فجر آیت ۷) یہ قوم شام کے ساحلی علاقوں میں آباد تھی جو بحری راستوں سے تجارت کیا کرتے تھے ان کا مورث اعلیٰ ارم بن سام بن نوحؑ تھا۔ دیکھیے تاریخ ابن قتیبہ ص ۱۹، ۱۹۷۸ء

[2] تاریخ ادبیات ایران از ڈاکٹر رضازادہ شفق مترجمہ سید مبارز الدین رفعت ص ۱۵، ندوۃ المصنفین دہلی فروری ۱۹۸۸ء

[3] فن تحریر کی تاریخ ص ۱۵۴ [4] غرائب الجمل ص ۷ اور ۲۳ [5] فن تاریخ گوئی ص ۲۷

[6] غرائب الجمل ص ۱۸ بحوالہ سبحۃ المرجان جس کی عربی عبارت یہ ہے: "ما وقفت علیٰ من وضع قاعدۃ الجمل وقدر حروف التہجیہ بازاء الاعداد"

ڈاکٹر وجیہ الدین
شعبہ فارسی، مہاراجہ سیاجی راؤ یونیورسٹی
بڑودا، گجرات، انڈیا

پروین اعتصامی
(جدید فارسی کی ممتاز شاعرہ)

فتح علی شاہ قاچار (۱۸۳۴ـ۱۷۹۷ء عیسوی) کے دورۂ حکومت کے بعد ایران اور یورپ کے درمیان تعلقات قائم ہوئے مختلف فنون کے ماہرین اور فوجیوں اور انجینئروں کو دعوت عمل دی گئی اور ان فنون کی تربیت و تعلیم کے لئے مدرسے قائم کئے گئے طلباء و ماہرین کو یورپین ممالک بالخصوص فرانس وار انگلستان بھیجنے کا رواج ہوا۔ امراء کے بچے، شاہزادے اور اعلیٰ طبقہ کے افراد فرانسیسی اور انگریزی ادب سے واقف ہوئے۔ رومانی اور داستانی کتابوں سے لیکر علمی، فنی اور فوجی کتابوں کے فارسی میں ترجمے کئے جانے لگے۔ اسی مدت میں مرزا محمد تقی خاں امیر کبیر نے ۱۲۶۸ ہجری میں مدرسہ دار الفنون کا افتتاح کیا اس کے ذریعہ ایرانیوں کو جدید علوم سے واقفیت حاصل کرنے کا موقع ملا۔ رفتہ رفتہ روزناموں کی اشاعت کا بھی رواج ہوا۔ ایرانی مصلحوں کی جماعتوں کے افراد ایران سے باہر اور ایران میں اپنے سیاسی اور اجتماعی نظریات سادہ اور عام فہم زبان میں قلمبند کرنے لگے علمی و فنی اور درسی کتابوں کو عصری تقاضوں کے مطابق جدید طرز پر لکھنے کی ضرورت محسوس کی جانے لگی اسی زمانے میں مشروطیت کی تحریک بھی اٹھی اور لوگوں میں ہیجان برپا ہو گیا۔ مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والی جماعتیں جدید کتابوں کے مطالعہ میں سرگرم ہو گئیں اور یورپین افکار و عقائد سے اپنے ربط کے استحکام کے لئے کوشاں ہو گئے ایران میں چھپائی کے رواج کی وجہ سے مختلف افکار اور ادبی آثار سے لوگ بخوبی واقف ہو گئے تھے۔[1]

اسی افراتفری کے عالم میں مشروطیت کا انقلاب شروع ہوا بر ملا تقریریں اور جلسے کئے جانے لگے متواتر اخباروں کی اشاعت ہونے لگی۔ نئے مدرسے قائم کئے گئے۔ یورپین زبانیں سیکھی جانے لگیں۔

پڑھے لکھے لوگوں کے لئے مغربی ادب سے واقفیت حاصل کرنا ضروری سمجھا جانے لگا۔ فکر و عقیدہ میں زبردست تبدیلی پیدا ہوگئی اب دربار اور امیروں کی جماعتوں سے نکل کر ادب عوام میں مقبولیت حاصل کرنے لگا۔[۲] اسی ارتقاء کا نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنے کی روش میں تغیر و تبدیلی کے آثار نظر آنے لگے۔ فکر و عقیدہ میں زبردست تبدیلی کی بنا پر نظم و نثر میں نئی فکر سے کام لیا جانے لگا، سادہ اور ہر قسم کی آرائش سے عاری طرز نگارش کا رواج ہوا۔ مختلف قسم کے ادبی اصناف مثلاً داستان ڈرامے اور اجتماعی واخلاقی وسیاسی اور علمی وادبی مباحث اور تاریخی وادبی تحقیقات وغیرہ کا فارسی زبان میں رواج ہوا جس میں یورپی ادبی شاہکاروں کے فارسی ترجموں نے اہم رول ادا کیا۔ مصنفین کی زبان میں بھی بتدریج تبدیلی ہوئی اور عام بول چال کو تحریر میں استعمال کیا جانے لگا۔ نئی تراکیب اور نئے نئے الفاظ فارسی زبان میں شامل ہوئے جن میں سے بیشتر یورپین اور کچھ ترکی استانبولی کے تھے۔ نئے نئے خیال جدید افکار اور تازہ اصطلاحیں وجود میں آئیں۔ فارسی نظم و نثر میں کچھ وجوہ کے سبب تنزل بھی پیدا ہوا اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ جنھیں نظم و نثر لکھنے پر قدرت نہ تھی۔ بلکہ وہ تصنیف اور شاعری کے ابتدائی اصولوں تک سے بے بہرہ تھے شعراء و مصنفین کی صف میں زبردستی داخل ہوگئے۔[۳]

بیسوی صدی کی ابتداء میں مشروطیت کے بعد جن ایرانی خواتین نے شاعری کی ان میں پروین اعتصامی کا مقام سب سے زیادہ بلند ہے۔ پروین اعتصامی مشہور و معروف مترجم اور صحافی میرزا یوسف خاں اعتصام الملک کی صاحبزادی تھیں۔ اعتصام الملک مشہور ادبی مجلّہ 'بہار' کے مدیر تھے۔ انھوں نے فرانسیسی اور عربی کی متعدد کتابوں کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ اس وجہ سے وہ ادبی حلقہ میں کافی مقبول تھے۔[۴]

پروین ۱۹۰۷ء/ ۱۲۸۵ شمسی میں تبریز میں پیدا ہوئیں عمر کا بیشتر حصہ تہران میں گزارا۔ پروین نے فارسی اور عربی زبان وادب کی تعلیم اپنے والد اعتصام الملک سے حاصل کی اور جدید تعلیم تہران کے امریکن گرلز کالج سے حاصل کی ۱۹۲۴ء میں وہاں سے فارغ التحصیل ہوئیں۔[۵]

پروین نے بچپن ہی سے شاعری کے میدان میں قدم رکھا تھا ان کے اشعار پہلی دفعہ ان کے والد کی نگرانی میں 'بہار' مجلّہ کی جلد دوم میں شائع ہوئے۔[۶] ۱۹۳۴ء میں ان کی شادی قریب کے ایک عزیز سے ہوئی لیکن یہ رشتہ دیرپا ثابت نہ ہوا اور ڈھائی ماہ کے قلیل عرصہ میں نوبت طلاق تک پہنچی اس

واقعہ کی طرف پروین نے مندرجہ ذیل قطعہ میں اشارہ بھی کیا ہے۔

ای گل توز جمعیت گلزار چہ دیدی
جز سرزنش وبدسری خار چہ دیدی

ای لعل دل افروز ، تو با انہمہ پرتو
جز مشتری سفلہ، ببازار چہ دیدی

رفتی بہ چمن، لیک قفس گشت نصیب
غیراز قفس، ای مرغ گرفتار چہ دیدی [۷]

اپنے دور کی سب سے مقبول شاعرہ کا انتقال صرف ۳۴ سال کی عمر میں، شنبہ ۱۶ فروردین ۱۳۲۰ شمسی کی رات کو تہران میں ہوا اور شہر قم میں ان کے والد کی قبر کے برابر میں ان کو سپرد خاک کیا گیا۔ [۸]

پروین اعتصامی نے قصائد قدماء کی طرز پر لکھے۔ انھوں نے خاص طور سے ناصر خسرو کے قصائد کی پیروی کی ہے عموماً اخلاقی اور عرفانی مضامین کو پیش کیا ہے۔ [۹] بعض ابیات سعدی وحافظ کی شیریں زبانی کی یاد دلاتی ہیں۔

انھوں نے اپنے اشعار میں پند واندرز اور مکارم اخلاق پر زور دیا ہے اور عارف وفلسفی کی نظر سے دنیا کی حقیقت کو دیکھا ہے ستمزدہ اور آزردہ لوگوں کو تسلی بھی دی ہے۔ [۱۰] اور اسی پیرایہ میں انہوں نے اپنے دور کے ایران کے سیاسی اور سماجی واقعات پر تبصرہ بھی کیا ہے وہ صرف تبصرہ کی حد تک ہی گئیں ہیں اور انہوں نے شاعری میں سماجی اور سیاسی تبلیغ سے گریز کیا ہے۔ [۱۱]

قصائد اور قطعات کا طرز بیان جدا جدا ہے قطعات اور مثنویوں میں مناظرہ کے اصول کو اپنایا ہے جو کہ فارسی شاعری کا ایک روایتی اسلوب ہے۔

خیالات کو اشخاص واشیاء کی زبان سے مکالمہ کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ یہ طریقہ قدما کے یہاں خاص کر شمال وغرب کے ادباء کا تھا۔ اور پہلوی ادب میں اسلام سے قبل بھی مناظرہ کا طریقہ رائج تھا۔ اسلام آنے کے بعد مناظرہ آذربائیجان اور عراق کے شعراء کا خاصہ تھا۔ [۱۲]

پروین کے قطعات میں مطالب وبیان تاثرات معنوی اور افکار مکمل طور پر جدید ہیں۔ پروین

اعتصامی کی شہرت کی وجہ ان کا سہل ممتنع ہے انہوں نے حکمت واخلاق کے علاوہ سماج کے بہترین موضوعات کو سادگی وزیبائی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جس کو ہر طبقہ کا آدمی چاہے عارف ہو یا عامی آسانی سے سمجھتا ہے اور اس سے متاثر ہوتا ہے[۱۳] یہی وجہ ہے کہ پروین کو ایک عوامی شاعرہ کا درجہ دیا جاتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے ان کے مجموعہ کلام کو ایران میں بارہا چھاپا گیا ہے۔

پروین اعتصامی کی ایک اہم خصوصیت جس کا اظہار مختلف شکلوں میں ان کی شاعری میں پایا جاتا ہے وہ غریبوں اور ناداروں کی حالت زار کا احساس ہے۔ ان کے بیان وفکر میں جذبے کی صداقت پائی جاتی ہے وہ کبھی مفلس اور یتیم بچے کی زبان سے سماجی اختلافات کا شکوہ کرتی ہیں مثلاً ان کے قطعے "قلب مجروح" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دی کودکی بدامن مادرگریست زار
کز کودکان کوی بمن کس نظر نداشت

طفلی سراز پہلوی خود بیگناہ راند
آن تیر طعنہ زخم کم از نیشتر نداشت

اطفال را بصحبت من، از چہ میل نیست
کودک مگر نبود، کسی کو پدر نداشت

امروز ، اوستاد بدرسم نگہ نکرد
مانا کہ رنج وسعی فقیران، ثمر نداشت

دیروز ، درمیانۂ بازی زکودکان
آن شاہ شد کہ جامہ خلقان ببر نداشت

من درخیال موزہ، بسی اشک ریختم
این اشک وآرزو زچہ ہرگز اثر نداشت

جز من میان این گل وباران کسی نبود
کو موزہ ای بپاو کلاہی بسر نداشت

آخر تفاوت من و طفلان شہر چیست
آئین کودکی، رہ و رسم دگر نداشت

هرگز درون مطبخ ما هیزمی نسوخت
وین شمع، روشنائی ازین بیشتر نداشت

همسایگان ما بره و مرغ میخورند
کس جز من و تو قوت ز خون جگر نداشت

بر وصله های پیرهنم خنده می کنند
دینار و درهمی، پدر من مگر نداشت[14]

اپنے دوسرے قطعہ "صاعقہ ما، ستم اغنیاسب" میں وہ پسماندہ طبقوں کے حقوق کی ترجمانی کرتی ہیں۔

پیر جهاندیده بخندید کاین
قصه زور است، نه کار قضاست

مردمی و عدل و مساوات نیست
زان ستم و جور و تعدی رواست

گشته حق کارگران پایمال
بر صفت غله که در آسیاست

هیچکسی پاس نگهدار نیست
این لغت از دفتر امکان جداست

پیش که مظلوم برد داوری
فکر بزرگان، همه آز و هو است

انجمن آنجا که مجازی بود
گفته حق راچه ثبات و بقاست

رشوه نه مارا که بقاضی دہیم
خدمت این قوم به روی وریاست

نبض تهی دست نگیرد طبیب
درد فقیر ای پسرک بی دواست

مافقرا، از همه بیگانه ایم
مرد غنی، باہمه کس آشناست

بار خود از آب برون میکشد
هر کس، اگر پیرو گر پیشواست

مردم این محکمه اہر یمنند
دولت حکام، زغصب وربا ست

آنکه سحر، حامی شرع است ودین
اشک یتیمانش گه شب غذاست

لاشه خور انند وبه آلودگی
پنجه آلوده ایشان گواست

خون لبی پیرزنان خورده است
آنکه بچشم من وتو پارساست

خوابگه آنرا که سمور وخزاست
کی غم سرمای زمستان ماست

هر که پشیزی بگدائی دہد
درطلب دنیت عمری دعاست

تیره دلان راچه غم از تیرگیست
بی خبران راچه خبر از خداست[۱۵]

پروین اعتصامی نے ایسے اشعار بھی کہے ہیں جن میں سماجی ظلم و ستم کی طرف اشارہ ملتا ہے مثال کے طور پر "گنج ایمن" قطعہ کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

برو گذشت حکیمی و گفت کای فرزند
مبرہن است کہ مثل تو پادشاہی نیست

ہنوز روح تو ز آلایش بدن پاکست
ہنوز قلب تو رانیت تباہی نیست

ترا بس است ہمین برتری کہ بر در تو
بساط ظلمی و فریاد داد خواہی نیست

تو مال خلق خدا را نکردہ ای تاراج
غذا و آتشت از خون و اشک و آہی نیست

ترا فرشتہ بود رہنمون و شاہا نرا
بغیر آہرمن نفس، پیر راہی نیست

طلا خدا و طمع مسلک و طریقت شر
جز آستانہ پندار، سجدہ گاہی نیست

قنات مال یتیم است و باغ ملک صغیر
تمام حاصل ظلم است مال و جاہی نیست[۱۶]

پروین اعتصامی کے دیوان میں قصائد، مثنویات، تمثیلات اور مقطعات شامل ہیں۔ بقول ملک الشعراء پروین کے دیوان کی روح ان کے قطعات ہیں۔ ایرانی سماج نے پروین کے کلام کو اس لئے بھی بہت اہمیت دیتا ہے کہ اس شاعرہ نے جو کچھ کہا ہے اس کی متانت قابل ذکر ہے اس میں بعض ایسے مسائل سے بھی بحث کی ہے جو خاص نسوانی ہیں۔ یہاں بھی وہ عفت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیتیں۔ نسوانی وقار اس کی شاعری نمایاں ہے اس کے برخلاف بعد کی ایک دوسری معروف شاعرہ فروغ فرخزاد نے عورتوں سے متعلق جو کچھ بے برملا کہا ہے۔ جسے ایرانی سماج کے ایک حصہ نے قبول کیا ہے اور دوسرے نے ناپسندیدگی سے دیکھا ہے

لیکن پروین اعتصامی کا کلام تمام ایرانی سماج کی توجہ کا مرکز رہا ہے اور اس کی وجہ اس کے بیان کی پاکیزگی ہے یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ پروین اعتصامی آج کافی عرصہ گزرنے کے بعد بھی ایران میں احترام کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں اور ان کا کلام انقلاب اسلامی کے بعد بھی متر ود نہیں۔

منابع

۱۔ ذبیح اللہ صفا، مختصری در تاریخ تحول نظم و نثر پارسی، چاپ چہاردہم، ۱۳۷۳ شمسی، ایران، صفحہ ۱۰۲ تا ۱۰۳

۲۔ ایضاً صفحہ ۱۰۳

۳۔ ایضاً صفحہ ۱۰۳

۴۔ منیب الرحمٰن، جدید فارسی شاعری، اشاعت اول، ۱۹۵۹ء، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، صفحہ ۴۸

۵۔ ایضاً

۶۔ سید عبدالحمید خلخالی، تذکرہ شعرای معاصر ایران، ۱۳۳۳، تہران، صفحہ ۶۷۔ ویان ریکا، ہسٹری آف ایرانین لٹریچر، ہولینڈ، ۱۹۶۸ء صفحہ ۳۸۷

۷۔ دیوان پروین اعتصامی، چاپ پنجم، تہران، ۱۳۴۱ شمسی، صفحہ ۲۶۸

۸۔ دیوان پروین اعتصامی، صفحہ ۲۷۳ (حاشیہ)

۹۔ سید عبدالحمید خلخالی، تذکرہ شعرای معاصر ایران، صفحہ ۶۶

۱۰۔ دیوان پروین اعتصامی (دیباجہ چاپ اول از ملک الشعراء بہار صفحہ ح۔ط

۱۱۔ یان ریکا ہسٹری آف ایرانین لٹریچر، صفحہ ۳۸۷

۱۲۔ دیوان پروین اعتصامی (دیباجہ چاپ اول از ملک الشعراء بہار) صفحہ ط

۱۳۔ سید عبدالحمید خلخالی، تذکرہ شعرای معاصر ایران، صفحہ ۶۶

۱۴۔ دیوان پروین اعتصامی، صفحہ ۱۹۴

۱۵۔ ایضاً صفحہ ۱۷۴

۱۶۔ ایضاً، صفحہ ۲۲۸ تا ۲۲۹

میزانِ عدل

عبدالواحد قاسمی، ارریاوی، دارالعلوم محمدیہ بنگلور

انسانی فطرت ظلم وناانصافی سے نفرت کرتی ہے، قانونِ الٰہی ناحق کی زیادتیوں کو ہرگز جائز نہیں سمجھتا، اور دنیا یہ تسلیم کرتی ہے کہ ظلم وستم اور حقوق تلفی بری چیز ہے، خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھنے والے کے خلاف کی جائے..... لیکن افسوس! صد افسوس!! کہ آج حکومت کی سطح سے لیکر عوام الناس تک ہر فرد جس افراتفری کا شکار ہے، ایک فرقہ دوسرے فرقہ کے خلاف، ایک پارٹی دوسری پارٹی کے مقابل جس طرح نبرد آزما ہے اور ایک قوم دوسری قوم کے خلاف جس طرح زیادتیوں کو روا رکھے ہوئے ہے اور انسانیت کی عظمت وتقدس کو پامال کررہا ہے، ان کو دیکھ کر یہی محسوس ہوتا ہے کہ اب دنیا کو عدل وانصاف کی کوئی ضرورت نہیں، تہذیب وتمدن سے کوئی واسطہ نہیں، انسانیت وشرافت سے کوئی تعلق نہیں اور روحانیت واخلاق سے کوئی لگاؤ نہیں، بس! خونخواری، سفاکی، درندگی فحاشی، تخریب کاری اور حقوق تلفی، یہی زندگی کا نصب العین ہے اور یہی معیارِ شرافت ہے۔ ان خراب عناصر نے پوری نوع انسانی اور ان کی صاف وستھری زندگی کو غلط رخ پر ڈال دیا ہے، حالات کے اس رو میں بہنے والے بزرگ بوڑھے بھی ہیں اور کڑیل جوان بھی، عصمت مآب دوشیزہ بھی ہیں اور معصوم بچے بھی، اس سے متاثر مسلمان بھی ہیں اور غیر مسلم بھی، اس محور میں حکومتیں بھی گھوم رہی ہیں اور عوام بھی...... تاہم میں سمجھتا ہوں کہ اگر کسی مشین میں خرابی آجائے تو اسے ٹھیک کردیئے، اس کی چولیں اپنی جگہ بٹھادینے سے وہ پہلے ہی کی طرح کام کرنے لگتی ہے، انسان اس فانی دنیا کا مرکز ہے ساری چیزیں اس کے گرد گھوم رہی ہیں وہ اگر اپنی حقیقت کو پہچان جائے، ضمیر بیدار

ہو حس بر قرار ہو واراس کی فطرت اپنی ڈگر پر ہو، دل و دماغ، خود غرضی، تکبر اور تعصبات سے عاری ہو تو ظلم کیا، بُرائی کیا، حقوق تلفی کیا، انسان اس کے تصور سے بھی کانپنے لگے گا اور ان کو یہ اعمالِ قبیح کرتے وقت ایسا محسوس ہوگا کہ کائنات کا مقتدرِ اعلیٰ، جہانِ فانی کا حاکم مطلق، رب کائنات کی نگاہیں ہمیں دیکھ رہی ہیں اور ان کے فرشتے جہنم کو لئے ہوئے کھڑے ہیں اور تمام تر ہولناکیوں کے ساتھ ہم پر انڈیل دینا چاہتے ہیں...... اور یہ کب ہوگا؟ جب خلافتِ الٰہی قائم ہو، انصاف پروری باقی ہو، دستور کا پاس ولحاظ ہو اور میزانِ عدل قائم ہو۔ کیونکہ میزانِ عدل سے ذرا بھی بے توجہی حق وانصاف کا گلا گھونٹ دیتی ہے، ظلم زیادتی عام ہو جاتی ہے، غریبوں اور بے اثر لوگوں کے حقوق مارے جاتے ہیں، حلال وحرام کی پہچان ختم ہو جاتی ہے، ہزارہا قتل ہوتے ہیں، ڈاکے پڑتے ہیں اور ناقابلِ اصلاح مفاسد کا لامتناہی سلسلہ چل پڑتا ہے، مظلوم کی فریاد سالہا سال حل نہیں ہوپاتی، لوگوں کے نجی مقدمات اس قدر طویل مدت اختیار کر لیتے ہیں کہ اصل نقصان سے بھی زیادہ خرچ مظلوم کا ہو جاتا ہے، اگر اس کے پاس مزید رقم نہیں تو وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کا حق نہیں رکھتا، ایسی صورت میں مظلوم کا بچا کھچا مال بھی عدالت کی نذر ہو جاتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عدل وانصاف کی ساری امیدیں مادیات کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہیں، لمبی مدت تک ٹھوکریں کھانے کے بعد بھی انصاف نہیں ملتا، آخر ظالموں کی جیت ہوتی ہے، حق بولنے والے جیل میں ہوتے ہیں اور مجرم دندناتے پھرتے ہیں۔

اس وقت جو دنیا پریشان ہے، انسانیت چیخ رہی ہے، کراہ رہی ہے، حیات نو کی تلاش میں ٹھوکریں کھا رہی ہے، جرائم ہواؤں کی رفتار سے بڑھ رہے ہیں، بدامنی کا دور دورہ ہے اور اخلاق وانسانیت کی رسوائی ہے وہ محض اس لئے کہ اس نے اشرف المخلوقات کی عظمت وشرافت کو اپنے من مانے اصولوں کے ذریعہ پامال کر دیا، نظام زندگی کا دوہرا معیار اور دستور حیات کے دورخ پیش کئے، دکھانے کے لئے اور، برتنے کے لئے اور، غریبوں کے لئے

کچھ، امیروں کے لئے کچھ، دنیا میں جب تک یہ ذہنیت پائی جاتی ہے، امن و سکون کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

آج کہنے کو تو دنیا کی ہر حکومت اور ہر قوم خود کو عدل و انصاف، مساوات، برابری اور نیک حکمرانی کی دعویدار بتاتی ہے اور اس کے متعلق وسیع پیمانے پر بحث و مباحثہ کرتی ہے اور خود کو حقوق انسانی کی علمبردار کہتی ہے۔ لیکن آپ جب ان کو عملی تناظر میں دیکھیں گے تو سارے دعوے غلط اور ساری بحثیں بے بنیاد نظر آئیں گی۔ ..رومن لا صدیوں چلا، وہاں کھرے بے لاگ انسان کی کون سی مثال قائم ہوئی؟ آج ہندوستان میں ہندو لا بنام جمہوریت چل رہا ہے، برہمنوں کی مرضی کے مقابلے میں کس نے دودھ کو دودھ اور پانی کو پانی کیا؟ ذرا غور کریں کہ اس وقت لوگ محافظ رکھ کر، گھر کے دروازے بند کر کے، حویلیوں اور کوٹھیوں میں نگہبان اور ہتھیار رکھ کر کیوں سوتے ہیں؟ اور کھڑکیوں کو موٹی موٹی سلاخیں کیوں لگاتے ہیں؟..... کہ کہیں چور اور ڈاکو نہ آجائے اور کہیں عصمتوں کا لٹیرا نہ آجائے اور لمحوں میں ہماری زندگی کو مفلوج یا تباہ و تاراج کر دے۔ یہ اس لئے کہ عدالت اپنی فرائض کی ادائیگی میں کوتاہ ہے، حق گوئی و بے باکی معدوم ہو رہی ہے، قانون کے لمبے ہاتھ شل ہو گئے ہیں اور انصاف پروری تاریخ کا ایک حصہ بن کر رہ گئی ہے۔

اس کے بالمقابل اسلام اور مسلمانوں نے میزانِ عدل، مساوات اور سچی جمہوریت کا جو واضح دستور پیش کیا ہے وہ آج کی جعلی جمہوریت کے لئے یقیناً لائق تقلید اور نمونہ عمل ہے۔ قرآن پاک کہتا ہے:

”بے شک اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ اہل حقوق کو ان کے حقوق پہنچادیا کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف سے فیصلہ کرو“ (۴/۵۸)

”اے ایمان والو! اللہ کے واسطے استقامت کے ساتھ انصاف کی طرف داری کرنے والے ہو جاؤ اور کسی قوم کی دشمنی (کا خطرہ) تم سے زیادتی نہ کرادے، انصاف کو نہ چھوڑو کہ وہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو، بلاشبہ اللہ کو تمہارے سب اعمال کی خبر

ہے۔"(۵/۸)

آپ کہہ دیجئے کہ میرے رب نے حکم دیا ہے انصاف کرنے کا(۷/۲۹)اور ہماری مخلوق جن وانس میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو حق کے مطابق ہدایت کرتی ہے اور حق کے مطابق انصاف کرتی ہے۔"(۷/۱۸۱)

حضور ﷺ کے زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ بنو مخزوم کی ایک بلند مرتبہ عورت نے چوری کی، قریش کی عزت کے لحاظ سے لوگوں کی یہ خواہش تھی کہ ملزمہ سزا سے بچ جائے اور معاملہ دب جائے، لوگوں نے حضرت اسامہ بن زیدؓ کو سفارش کے لئے تیار کیا، انہوں نے آنحضرتؐ سے معافی کی درخواست کی، آپ نے غضب آلود ہوکر فرمایا کہ "بنی اسرائیل اسی کی بدولت تباہ ہوئے، وہ غریبوں کو تو سزا دیتے تھے اور امیروں کو بخش دیتے تھے، خدا کی قسم !اگر محمد کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔"

وہ دیکھیں دستور اسلام کی عملی تصویر، خلافت اسلامی کا دور لوگ اپنے گھروں کے دروازے کھول کر مال ودولت کھلے عام رکھے ہوئے ہیں، عورت ومرد رات کی تاریکی میں سفر کررہے ہیں، نہ خوف ہے نہ ڈر، نہ چوری ہے نہ بدکاری، نہ رشوت ہے اور نہ بیجا زندگی کے مسائل، ہر لمحہ سکون ہی سکون، اگر کوئی نظام زندگی میں گندگی کا ارتکاب کرتا ہے تو اسلامی عدالت اسے عبرتناک سزا دیتی ہے، عدالت کے اس فیصلہ میں نہ اپنوں اور غیروں کی کوئی تفریق ہے، نہ غربت وامارت کا کوئی امتیاز اور نہ جاہ وحشمت کا خیال۔

خلیفۂ وقت حضرت عمرؓ کے صاحبزادہ حضرت عاصم کا ایک مقدمہ عدالت میں پیش ہوتا ہے، اسلامی کورٹ اس کی لغزش میں سودرّے سزا مقرر کرتی ہے اور حضرت عمر فاروقؓ اپنے ہاتھوں سے اپنے فرزند کو سزا دیتے ہیں، یہاں تک کہ سزا پوری ہونے سے قبل صاحبزادہ کا انتقال ہوجاتا ہے، پھر بھی آپ سزا پوری کرتے ہیں۔

دوسری مثال: ایک دفعہ حضرت عمر فاروقؓ نے ایک بوڑھے سائل کو دیکھا جو کسی

دروازے پر کھڑا سوال کر رہا تھا، آپ نے اس سے پوچھا آخر تجھے اس حالت پر آنے کے لئے کس چیز نے مجبور کیا؟ اس نے کہا میں جزیہ ادا کرنے اور کبر سنی میں اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے ایسا کر رہا ہوں، آپ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے گھر لے آئے اور اس وقت کی ضرورت پوری کردی، اس کے بعد بیت المال کے خازن کو لکھا۔ ذرا اس شخص کی حالت اور اس کے ٹیکس پر غور کرو، خدا کی قسم ہم نے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے، کیونکہ ہم نے اس کی جوانی کو تو کھالیا اور بڑھاپے میں رسوا کرنے کے لئے چھوڑ دیا، ارے! یہ تو اہل کتاب کے مساکین ہیں۔ اس لئے اس پر سے جزیہ اور ٹیکس اٹھالیا۔

تیسری مثال: جبلہ بن ابہم جو غسان کا شہزادہ تھا، اسلام لا چکا تھا، اتفاق سے دوران طواف ایک معمولی مسلمان کے پاؤں تلے اس کی چادر دب گئی جس سے برہم ہو کر اس غریب کو طمانچہ مار دیا، خلیفۂ وقت کے پاس مقدمہ پہنچا، خلیفہ نے اسلامی قانون کے مطابق حکم دیا کہ اس کو بھی وہی طمانچہ مارا جائے۔ جبلہ شہزادہ تھا وہ یہ سمجھ رہا تھا کہاں میں؟ اور کہاں یہ غریب معمولی انسان؟ اس لئے وہ وہاں سے نکل گیا، بعض روایت میں ہے کہ وہ مرتد ہو کر بھاگ گیا، یہ سب کچھ ہو گیا مگر فیصلہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

آپ دور مت جائیے اپنے ملک ہندوستان کے مسلم سلاطین کے عہد پر نظر ڈالئے کہ انہوں نے حکومت وسیاست اور عدالت وامارت کا کیسا انوکھا انداز پیش کیا: شاہ اکبر کے فرزند کبیر جہانگیر کے بارے میں آتا ہے، اس کی بیوی نے ایک بار غلطی سے ایک ہندو دھوبی کو مار ڈالا اور اس کے ورثاء نے جہانگیر کے دربار میں استغاثہ پیش کیا تو جہانگیر (جو اپنی بیوی نور جہاں کو عشق کی حد تک چاہتا تھا) نے نور جہاں کو قصاصاً قتل کرنے کا فرمان جاری کر دیا۔ لیکن مقتول کے ورثاء نے خون بہا لیکر نور جہاں بیگم کو معاف کر دیا۔ جب ان کی جان بچ گئی تو جہانگیر نے نور جہاں کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

"تو اگر کشتہ شدی آہ. چہ می کردم من"

(اقبال نامہ جہانگیری)

یعنی اگر تو ہلاک جاتی تو میں خود زندہ رہ کر کیا کرتا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مسلمان بادشاہوں کے نزدیک رعایا کی کس قدر عزت تھی کہ ایک معمولی دھوبی اور اچھوت کے مقابلے میں اپنی محبوب ترین ملکہ اور خود کو فنا کر دینے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔

ظہیر الدین بابر نے اپنے بیٹے ہمایوں کو جانشینی کے وقت جو وصیت کی تھی اس سے بھی اسلام کی خصوصیت کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے انہوں نے وصیت کی کہ:

"مذہبی تعصب کو اپنے دل میں جگہ مت دو اور لوگوں کے مذہبی جذبات اور مذہبی رسوم کا خیال کرتے ہوئے کسی رعایت کے بغیر قوموں کے ساتھ پورا انصاف کرو، گاؤ کشی سے خاص طور پر پرہیز کرو تاکہ اس کے ذریعہ تمہیں لوگوں کے دلوں میں جگہ ملے اور وہ دل سے تمہاری اطاعت کریں اور ملک میں امن وامن قائم رہے، تمہیں کسی قوم کی عبادت گاہ مسمار نہیں کرنا چاہئے اور ہمیشہ سب کے ساتھ پورا انصاف کرنا چاہئے، شیعہ سنی اختلافات کو ہمیشہ نظر انداز رکھو، کیونکہ اس سے اسلام کمزور ہو جائے گا، اسلام کی اشاعت ظلم وستم کی تلوار کے مقابلے میں لطف واحسان کے تلوار سے زیادہ بہتر طور پر ہو سکے گی۔ (چشمۂ کوثر ۲۵۸)

یہ اور اس طرح کی بے شمار مثالیں ہیں جس سے اسلام کی بے مثال عدالت کا پتہ چلتا ہے، جس کی نظیر دنیا کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔ کاش! دنیا انصاف کرتی تو معلوم ہوتا کہ اسلام نے دنیا کو کیا دیا تھا اور انسانیت کو کیا دیا تھا؟

الغرض یہ کہ قانونِ عدل ہی پر جماعت اور حکومت کا نظام قائم ہو سکتا ہے، اگر اس کو مٹا دیا جائے تو جماعت اور حکومت کا شیرازہ بکھر جائے گا اور کسی کی جان ومال وآبرو سلامت نہ رہے گی۔

سبق پھر پڑھ عدالت کا سخاوت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

• •

ماخوذ: الرائد الہند، ۲۴ر جمادی الاولی ۱۴۱۹ھ آخری قسط

یوگینڈا میں اسلام اور مسلمان

اندرونی و بیرونی چیلنجوں کے آئینے میں

از ـــــ کلیم صفات اصلاحی

۱۸۸۴ء میں موتیسا اول کے بعد جب موانفا وارث ہوا تو باپ کے نقش قدم پر چلنے کے بجائے اس نے عیسائیوں کی مصاحبت اور عیسائیت کیطرف میلان کو ترجیح دیا۔ یہ بات بھی صحیح ہے کہ پروٹسٹانٹین وفود کو یوگینڈا میں داخل ہونے کی اجازت اس کے باپ ہی نے اپنے عہد حکومت میں دے رکھی تھی۔ پھر ۱۸۷۹ء میں کیتھولکس کو اجازت ملی۔ اس کے بعد موانفا کا دور تو اسکی اسلام اور مسلم دشمنی سے پُر اور عیسائیوں اور کیتھولکس کے تعاون سے مملو ہے۔

۱۸۸۰ء میں کیتھولک اور پروٹسٹانٹین نے متحد ہو کر مسلمانوں کے خلاف صف آرائی کی جس میں مسلمانوں کو شکست فاش نصیب ہوئی۔ اس کے بعد مذکورہ دونوں طاقتوں کے عزائم بلند ہوتے گئے اور انہوں نے یوگینڈا کے پڑوسی ملک یونیورو پر جابرانہ و قاہرانہ چڑھائی کی۔ اور موانفا کی طرف سے ان کے خلاف کوئی تحریک نہیں ہوئی۔ ۱۸۹۱ء میں عیسائیوں نے یونیورو میں داخل ہو کر مسلمان پر چیرہ دستی کر کے ان کا قتل عام کیا۔ پھر بھی موانفا نے ان کے خلاف کچھ نہیں کیا۔ پھر اس کے بعد ۱۸۹۴ء میں اس کا لڑکا داؤد شوا برسر اقتدار ہوا۔ ۱۹۳۹ء تک اس کی حکومت رہی۔ پھر اس کے لڑکے ایڈوارڈ فریڈریک کا قبضہ ہوا۔ اس کے سریر آرائے سلطنت ہونے کے بعد سے ملکی خانہ جنگیوں کا آغاز ہو گیا۔ اس کے بعد برطانیہ سے خود مختاری کا مطالبہ عمل میں آیا۔ ۱۹۵۲ء میں شاہ موتیسا ثانی (ایڈوگارڈ فریڈریک) نے برطانیہ سے ذاتی حکومت کا مطالبہ کیا تو

برطانیہ نے منظوری دیدی۔ اور اسی سال عام انتخابات بھی ہوئے۔ جس میں مؤتمر الشعب الاوغندی کے قائد ڈاکٹر ملتوون ابوتی کو کامیابی ملی اور خود مختاری کے بعد یہ یوگینڈا کے پہلے لیڈر کی حیثیت سے نمایاں ہوئے۔ ۱۹۶۶ء میں شاہ موتیسا ثانی سے اختلاف کی بناء پر اس نے ان کی گرفتاری کے لئے اپنے خاص آدمی مقرر کئے۔ چنانچہ وہ بھاگ کر برطانیہ میں پناہ گزیں ہوئے اور بقیہ ایام زندگی وہیں گذار کر ۱۹۶۹ء میں انتقال کر گئے۔ اس کے بعد ۱۹۷۱ء میں فوجی انقلاب رونما ہوا۔

یوگینڈا میں اسلام پہونچنے کے بعد سے ہی وہاں اسلامی تہذیب وثقافت کی نشر واشاعت کا آغاز ہو چکا تھا۔ بایں طور کہ وہاں مساجد ومدارس کا قیام عمل میں آیا۔ ان سے اسلامی معاشرہ میں فعال اور سرگرم رکن بن کر نکلنا شروع ہوئے، تاہم یہ تہذیب وثقافت ان اصولوں سے مربوط تھی جنہیں یوگینڈا میں پہلے آنے والے مسلمان لیکر آئے تھے اور جس طرح کے عقائد وافکار کے حامل یہ لوگ تھے۔ اسی طرح کے اعتقادی اثرات آئندہ نسلوں پر بھی مرتب ہوئے۔

یہ بات بھی واضح ہے کہ اسلامی کلچر کی نشر واشاعت میں خوشگوار اضافہ عربی زبان کے سیکھنے، پڑھنے اور بولنے کے ذریعہ ہوا۔ کیونکہ عربی زبان ہی اسلام کے بنیادی عقائد وتصورات، دینی علوم ومعارف، اور شعائر وعبادات کے اخذ وستنباط کا اصل ماخذ ہے۔

علم فقہ کی تحصیل انہوں نے مسلک شافعی کی ان بعض مختصر کتابوں سے کی جو انہیں تجارتی وفود کے ذریعہ آسانی سے دستیاب ہو سکیں۔ مثال کے طور پر سفینۃ النجاۃ، ارشاد المسلمین، الغایۃ والتقریب النفیس، مبادی الفقھیہ، عمدۃ الممالک وعدۃ الناسک، وغیرہ اہم فقہی مسائل میں بھی انہوں نے واعظین ومبلغین کے مواعظ پر اعتماد کیا اور اس سے انہوں نے یوگینڈا میں اسلامی تہذیب وثقافت کا بنیادی پتھر رکھنے کی کوشش کی۔

غرض اسلامی تہذیب وثقافت کو ہر دور میں متعدد چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جن کا احاطہ دو قسموں میں کیا جا سکتا ہے۔

پہلا اندرونی چیلنج دوسرا خارجی (بیرونی) چیلنج

اندرونی چیلنج

اس سے مراد خود مسلمانوں کی مخالفتیں ہیں۔ جس کے حقیقی ذمہ دار علماء ہیں۔ باوجودیکہ پروگینڈا میں اشاعت اسلام کے سلسلے میں ان کی کوششیں لائق تحسین اور ان کی سرگرمیاں نہایت اہم ہیں تاہم اس سلسلے میں انہوں نے بعض ایسی خطرناک اور بدعقیدگیوں کی حامل کتابوں کا سہارا لیا ہے جو بدعات و خرافات اور غلط اور اسلام سے منافی عقائد سے بھری پڑی تھیں، اور جنہیں بعد کے علماء نے مصادر و مراجع کی حیثیت دیدی۔ اس سے دلچسپ تاہم حیرت انگیز بات یہ ہے کہ قرآن و سنت کے عربی زبان میں ہونے کی وجہ سے ان کے دل میں یہ غلط عقیدہ جاگزیں ہو گیا کہ وہ تمام کتابیں جو عربی زبان میں ہیں مصدر اصلی کی حیثیت رکھتی ہیں جس طرح سے قرآن ہمارے بنیادی علوم و عقائد کے اخذ و انبساط کا ذریعہ ہے، یہ کتابیں بھی اسی توقیر و احترام کی حامل ہیں۔ بعد میں یہی کتابیں اپنے مباحث و بنیادی موضوعات کی بناء پر وہاں کے مسلمانوں کے اعتقادات کے سلسلے میں چیلنج کی صورت اختیار کر گئیں۔ ان کتابوں میں حضور پاک ﷺ کی شخصیت میں غلو اور تعریف و توصیف میں حد سے تجاوز کیا گیا ہے۔ مثلاً برزنجی کی کتاب المولد اسی طرح کے مزخرفات اور بدعات کا نمونہ ہے۔ تاہم اس کے باوجود یہ کتاب وہاں کے لوگوں میں کافی مقبول ہے۔ ان کے نزدیک اس کتاب کی اہمیت و حسن قبول کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے ابواب وہاں کی اسلامی تقریبات و مجالس میں خاص طور پر پڑھے جاتے ہیں۔ اور ہر مسلمان اس کو نہایت دلچسپی سے سنتا اور اس پر کان دھرتا ہے یہاں تک کہ اس کے نام و موضوعات سے ناآشنا شخص بھی اس کے احترام و تقدس کا اعتراف کر بیٹھتا ہے۔

اسی طرح کی ایک کتاب، کتاب البردہ للبوصیری ہے۔ یہ کتاب بھی حضور پاک ﷺ کی سراپا شخصیت کی تعریف و توصیف میں غلط، بے بنیاد اور فرسودہ عقائد پر مبنی ہے۔ اس کے بعض موضوعات تو شرک باللہ کے حد تک پہونچا دیتے ہیں۔ تاہم بعض مسلمان اس کو زبانی یاد بھی کرتے ہیں۔ نیز ہر جمعہ کی شب اور پھر رمضان بھر اس کا درس ہوتا ہے۔

علم شعبدہ اور نجوم

کتاب الاباجاد میں علم نجوم اور شمس المعارف میں سحر کی تعلیمات بتفصیل مذکور ہیں۔ یہ دونوں ہی کتابیں گمراہ کن عقائد و کفر و شرک سے زیادہ قریب ہیں۔ موخر الذکر کتاب کے آخر میں کچھ ایسے اشارے بھی پائے جاتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جن اور شیاطین کو خدا اور اس کے رسول کے بالمقابل زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔

ایسے نامساعد حالات میں اسلامی تہذیب و ثقافت کا اصل چہرہ مسخ ہونا لازمی ہے۔ نیز اس طرح کے ماحول میں اسلامی تشخص کی بقاء کا تصور کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔ اس کی وجہ یوگینڈا میں اسلام کے بنیادی اور صحیح عقائد و افکار کا فقدان اور حقیقت سے چشم پوشی کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

بیرونی چیلنج

مذہب اور اسلام کی تہذیب و ثقافت کو خارجی نقصان غیر اسلامی سرگرمیوں اور اسلام دشمن تحریکات کی طرف سے لاحق ہے۔ جو پورے ملک میں اعلیٰ پیمانے پر اسلامی تحفظات و روایات کو پامال کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ اور جن کی پشت پر حکومت برطانیہ کا ہاتھ ہے۔ یوگینڈا پر ۱۸۹۴ء کے قبضہ کے بعد ہی سے برطانیہ وہاں کے اسلامی آثار و نقوش کو مسخ کرنے اور اس کی بیخ کنی کے لئے کوشاں ہے اور یہ کام حکومت برطانیہ دو طریقوں سے انجام دے رہی ہے۔

۱۔ عیسائی مشنریاں اس کی مقصد براری کے لئے معین ہیں۔ جو یوگینڈا کے مسلمان کو مذہب اسلام سے پھیرنے اور اس سے بیزار کرنے میں سرگرم ہیں۔

۲۔ دوسرے اسلام کو قادیانیت، اسماعیلیت اور بہائیت سے بھی کافی خطرہ ہے۔

●●●

نگران اعلیٰ

حضرت مولانا

حکیم محمد زماں حسینی

برہان

مجلس ادارت اعزازی

☆سید اقتدار حسین

☆ڈاکٹر معین الدین بقائی

☆محمود سعید بلالی

☆ڈاکٹر جوہر قاضی

جلد: ۱۲۵ — ستمبر/اکتوبر ۱۹۹۹ء — شمارہ: ۳، ۴

اس شمارے میں

جملہ خط وکتابت اور ترسیل زر کا پتہ:

منیجر ماہنامہ برہان

4136-اردو بازار، جامع مسجد دہلی-110006 فون نمبر: 3262815

زر تعاون

فی پرچہ: ۶/روپے

سالانہ: ۷۲/روپے

رحمن کمپیوٹرس دہلی

Ph.:6952082

عمید الرحمن عثمانی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان، اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

جب آزادی کے حصول کے لئے ہندوستانی انگریزی سامراج سے ٹکر لے رہے تھے قربانیاں دے رہے تھے قید وبند کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے ہنستے کھیلتے پھانسی پر لٹک رہے تھے کیا اس وقت کسی نے یہ بات سوچی تھی کہ جب سر زمین ہندوستان سے انگریز سامراجیت رفو چکر ہو جائے گا اور ہندوستان پر ہندوستانیوں کی حکومت ہوگی اس وقت ہندوستان کو ہندوستانی ہی لوٹ رہے ہوں گے ہر جگہ بھرشٹاچار کا بول بالا ہوگا۔ رشوت کے بغیر کسی کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانا بڑا مشکل مرحلہ ہوگا۔ چند ٹکوں کے عوض ملک سے کچھ لوگ غداری پر بھی آمادہ ہوں گے منافع خور منافع خوری سے باز نہیں آئیں گے عوام و ملک کو نظر انداز کر کے اپنی تجوریوں کو بھرنے ہی کی طرف ان کی تمام توجہ مرکوز ہوگی۔

آج ملک میں کیا حال ہے کوئی بھی محب وطن اس حال کو دیکھ کر دکھی ہوئے بغیر نہ رہے گا۔ جہاں کبھی رشوت خوری کا نام سننے میں نہیں آتا تھا وہاں بھی رشوت خوری کی جب بات کانوں میں سنائی پڑتی ہے تو دل ودماغ کو دھچکا سا لگتا ہے۔ غریبوں کو آزاد ملک میں راحت کا سامان نصیب ہونے کے بجائے مہنگائی نے مار رکھا ہے۔ نہ تو درمیانی طبقہ ہی مطمئن ہے اور نہ ہی غریب آدمی سکھی ہے۔ راحت و آرام تو دور کی بات ہوگئی ہے کسی نہ کسی طرح سے انسان جی ہی لے یہ ہی غنیمت ہے۔ کس طرح بتایا جائے کہ آج ملک میں مہنگائی سے عام آدمی کی زندگی اجیرن بن چکی ہے اور اس بات کا احساس ان لوگوں کو کہاں ہوگا جو لاکھوں نہیں کروڑوں، اربوں میں کھیل رہے ہیں۔ پہلے گھوٹالے ہوتے تھے ہزاروں کے یا بہت زور دکھایا تو تو لاکھوں کے گھوٹالے سننے میں آتے تھے لیکن اب تو گھوٹالے کروڑوں اور اربوں میں اس طرح آتے ہیں کہ

جیسے کوئی برائی ہی نہیں ہے۔ روزانہ اخبارات میں اسی قسم کی خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے دلچسپ حیرت ناک اور افسوسناک بات یہ ہے کہ ایک وقت میں کوئی بدعنوان شخص کسی شخص یا جماعت کے نزدیک سب سے زیادہ برا ہے اور بدعنوانی کی وجہ سے قابل نفرت ہے وہ کچھ ہی وقت گزرنے پر اسی شخص یا جماعت کی گود میں بیٹھا ہوا نظر آتا ہے اور پھر اسے وہ سب سے اچھا اور ایماندار کہنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے ہیں۔ ملک کے حالات کا یہ پہلو بڑا ہی افسوسناک ہے اسے ہم کیا کہیں یعنی جب بدعنوان شخص کسی دوسرے پلیٹ فارم پر ہے یا کسی دوسری جماعت میں ہے تو اس کے خلاف زبردست شور و غوغا اٹھانے میں کوئی کسر نہ اٹھائی رکھی جاتی ہے۔ لیکن جب وہ دوسری جماعت سے چھلانگ لگا کر اپنے مفاد کے حصول کی خاطر اس جماعت میں شامل ہو جاتا ہے تو پھر شور و غوغا مچانے والے اس کی ساری کرتوتوں کو بھول کر اس کے دفاع کے لئے میدان میں کود جاتے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ پنڈت سکھ رام جی پر کس قدر الزامات لگائے گئے اربوں روپے کے گھوٹالے اس کے نام سے وابستہ کئے گئے اور اخبارات میں شائع ہوئے جس کی وجہ سے پارلیمنٹ میں اس وقت کی اپوزیشن پارٹی نے اس کے خلاف ایک مسلسل پارلیمنٹ کے اجلاس کو چلنے نہ دیا اور اس کے خلاف کارروائی کر کے اسے جیل بھیجنے کے مطالبات کی گونج نے زمین و آسمان ایک کر دیا اور پھر وہ عدالت کے ایک حکم کے تحت جیل میں بھی بند رہا۔ لیکن جب پنڈت سکھ رام جی اس اپوزیشن پارٹی میں جو اس وقت اپوزیشن میں تھی۔ لیکن اس وقت وہ حکمراں جماعت ہے میں شامل ہو گئے اور کسی طرح حکمراں جماعت کو اقتدار کی دہلیز پر پہنچانے کے لئے سیڑھی ثابت ہوئے تو پھر پنڈت سکھ رام جی اس جماعت اور اس کے رہنماؤں کی نظر میں قابل مذمت، قابل نفرت نہ رہے۔ موجودہ سیاست اس قدر گندی ہو چکی ہے کہ اس میں برے کو اچھا اور اچھے کو برا بنا دیا جانا ایک روزمرہ کا کھیل بن چکا ہے اور یہ جو کچھ بھی گندگی ملک کی سیاست یا ملک کے معاشرہ میں سرایت کر چکی ہے وہ ہندوستان ہی میں نہیں ہے دنیا کے ہر ملک میں اس کا نظارہ ہو رہا ہے۔ انسانی قدریں روبہ زوال ہیں اور انسان مغائر باتیں

عروج پر ہیں۔ کچھ عرصہ بعد ہمیں انسانیت کو ایک گم شدہ چیز سمجھ کر ہی چپ ہو جانا پڑے گا انسانیت کی تلاش کرتے کرتے انسان تھک جائے گا مگر انسانیت کہیں نہیں ملے گی۔ ملک میں الیکشن اس قدر مہنگا ہو گیا ہے کہ عام آدمی تو الیکشن میں امیدوار ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتا ہے۔ گو الیکشن کمیشن کی طرف سے امیدواروں پر اخراجات کی حد مقرر ہے مگر اخراجات کی اس حد کا کوئی صحیح معنوں میں خیال رکھے گا تو وہ ہماری سمجھ سے باہر کی بات ہے کہ الیکشن کس طرح لڑے گا؟ جبکہ عوام کا خیال ہے کہ ہر امیدوار اپنے الیکشن پر اس قدر روپے خرچ کرتا ہے کہ الیکشن کمیشن کی حد سے تجاوز ہی ہو جاتا ہے بھاری خرچ کے بعد جب امیدوار کامیاب ہوتا ہے تو پھر وہ اپنے اس خرچ کو پورا کرنے کی طرف اپنی توجہ صرف کرے گا یا پھر وہ قوم کی اور ملک کی مخلصانہ خدمت میں اپنی توانائیاں صرف کرے گا کیا؟ اس سلسلے میں اب دوسرے پہلو کی طرف بھی غور کر لیا جائے۔ پارلیمنٹ کی میعاد پانچ سال ہے لیکن کسی ایک پارٹی کی مکمل اکثریت نہ ہونے کی وجہ سے پارلیمنٹ میں برسر اقتدار پارٹی جب اپنی اکثریت سے محروم ہو جاتی ہے تو پھر الیکشن کی نوبت آجاتی ہے جس پر حکومت کا بھی اربوں روپے خرچ ہوتا ہے اور امیدوار کا بھی روپیہ پانی کی طرح بہتا ہے بار بار الیکشن پانچ سال میں ایک بار کی بجائے جب تین بار یا پانچ بار الیکشن ہوتے رہے تو پھر ملک کی معیشت بری طرح بگڑے گی اس کی طرف کسی نے بھی اگر توجہ نہ دی تو جمہوریت سے لوگوں کا ناطہ ہی ٹوٹ جائے گا اور پھر وہ الیکشن کو فضولیات ہی کے زمرہ میں رکھنے پر مجبور ہوں گے۔ تمام دنیا میں ہندوستان کی جمہوریت سے شان ہے عزت ہے اور اونچا مقام ہے یہ آئے دن الیکشن کے ہونے سے ملک کے عوام میں الیکشن کے تئیں دلچسپی ختم ہو جائے گی اور جب عوام کی دلچسپی الیکشن میں نہ رہے گا تو پھر جمہوریت بے معنی بات ہو کر رہ جائے گی۔ اندرون ملک جمہوریت کی اہمیت جب نہ رہے گی تو باہر کی دنیا والوں کی نظر میں ہم کیا ہو کر رہ جائیں گے یہ سوچنے سمجھنے کی بات ہے اور اس پر ابھی سے ارباب حل و عقد کو غور و خوض کر لینا چاہئے یہ ہی ملک کے لئے بھی بہتر ہوگا اور ملک کے عوام کے مفاد کے لئے یہ اچھی بات ہوگی۔

آہ! ہمارا چھوٹا بھائی

نجیب الرحمان عثمانی کا انتقال پر ملال

دل ودماغ رنج وغم اور صدمہ میں ڈوبا ہوا ہے ہاتھ کانپ رہا ہے، قلم لرز رہا ہے یہ لکھتے ہوئے کہ میرا پیارا لاڈلا چھوٹا بھائی نجیب الرحمان عثمانی اس دنیا میں نہیں رہا موت کے ظالم ہاتھوں نے اس کی روح قبض کر لی ہے اور وہ زندگی سے لڑتا ہوا بالآخر موت کی آغوش میں ہمیشہ ہمیشہ کی نیند سو گیا ہے۔

"انا للّٰہ وانا الیہ راجعون" اب کیا لکھوں کیا نہ لکھوں طبیعت سخت پریشان ہے اور گہرے رنج میں ڈوبی ہوئی ہے کہ میرا چھوٹا بھائی کس طرح مسلسل دو سال تک بستر علالت پر اور تقریباً ۸ ماہ تک ڈائیلاسز پر موت وزندگی کی کشمکش میں مبتلا رہا اور پھر ۲۲ر ستمبر ۱۹۹۹ء کی شب کو ہم کو روتا بلکتا ہوا چھوڑ کر اس دنیا سے اس دنیا میں چلا گیا۔ ہر زندگی کے لئے موت مقدر ہے کسی کو آگے جانا ہے اور کوئی پیچھے چلا جاتا ہے جانا سب ہی کو ہے مگر بہت سی موتیں زندوں کے لئے ہمیشہ کے لئے رنج وصدمہ کا باعث بن جاتی ہیں۔ برادر خورد نجیب الرحمان عثمانی ہم سب کا پیارا تھا چہیتا تھا ماں باپ کا تو تھا ہی لاڈلا، ماں باپ کے بعد ہم سب نے اس کی محبت اپنے سینوں میں بٹھالی تھی وہ ہماری آنکھوں کا تارا بن گیا تھا یہ کیا خبر تھی کہ موت اسے اس قدر جلد ہم سے چھین لے جائے گی کہ ہم دیکھتے رہ جائیں گے روتے بلکتے ہوئے اس کی موت کے صدمہ سے بلبلا کر چیخ پڑیں گے۔

نجیب الرحمان عثمانی عرف بڑے میاں قبلہ ابا جان حضرت مفکر ملت مفتی عتیق الرحمان عثمانی رحمتہ اللہ علیہ کے سب سے چھوٹے اور لاڈلے بیٹے تھے اللہ پاک نے خوبصورت بنایا تھا ماں کا بھی چہیتا تھا اور پھر اس کے ظاہری حسن کے ساتھ باطن میں خوبیاں ہی خوبیاں بھر رکھی تھیں۔ عجز وانکساری میں اپنے قابل احترام باپ ہی کی طرح تھے۔ علم وقابلیت میں نمایاں جوہر تھے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے نمایاں نمبروں کے ساتھ ایم اے پاس کیا تھا۔ اخلاق وانسانیت ہمدردی ملت جیسے اعلیٰ اوصاف بدرجہ اتم موجود تھے۔ شعائر اسلام صوم وصلوٰۃ کے سخت ترین پابند تھے۔ اتنی ساری خوبیوں کے ساتھ غرور وتکبر نام کا بھی ان میں نہ تھا۔ حضرت مفتی عتیق الرحمان صاحب عثمانی رحمتہ اللہ

علیہ نے ان کے لئے رشتہ زوجیت بھی بڑی ہی تلاش وجد وجہد اور چھان بین کے بعد علمی دنیا کے نامور ثقہ عالم وادیب مفکر ومدبر بہترین انشاء پرداز ملت اسلامیہ کے مشہور ومعروف راہنما وقائد ملک کی قابل احترام شخصیت اور دین ودنیا کے مدیر شہیر ضرت مفتی شوکت علی فہمی رحمتہ اللہ علیہ کی صاحبزادی سے طے کر کے قلبی طمانیت وخوشی حاصل کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے نجیب الرحمان عثمانی کی زوجہ زرینہ رحمان کو ان کے زمانۂ علالت میں جس طرح خدمت وتیمارداری کی سعادت عطا فرمائی ہے ایسی سعادت کسی کو کم ہی نصیب ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ نیک عفت زرینہ رحمان زوجہ نجیب الرحمان عثمانی کو ان کے شوہر کی بے پناہ خدمت کرنے کا بہترین اجر وصلہ عطا کرے اور انہیں اپنے شوہر کے غم کو برداشت وصبر کی توفیق عطا کرے۔

اس وقت خاندان کے تمام ہی افراد بھائی نجیب الرحمان عثمانی کی وفات کے صدمے سے بے حال ہیں کیا بتائیں ان کی خوبیاں یاد کر کر کے دل ودماغ کو کس طرح تڑپا رہی ہیں۔ کسی کروٹ چین ہی نصیب نہیں ہو رہا ہے غم ہلکا کیا جائے تو کس طرح کیا جائے۔ ایسا پیارا بھائی کس کو نصیب ہوتا ہے ہمارا نصیب اچھا تھا کہ ہمیں نجیب الرحمان عثمانی جیسا پیارا بھائی ملا مگر اب یہ بھائی ہم سے بچھڑ گیا ہے موت کی آغوش میں چلا گیا ہے تو دل کو کس طرح ڈھارس دیں کس طرح تسلی دیں وہ کون سے الفاظ ہیں جو یاد کر کے اپنے اس پیارے بھائی نجیب الرحمان عثمانی کی موت پر صبر کر لیں۔ نہیں ہو رہا ہے صبر اللہ ہی سے دعا ہے کہ ہمارے دل ودماغ کو کسی طرح صبر کرادے ایسا پیارا بھائی اب دیکھنے کو نہیں ملے گا یہ سوچ کر ہی دم نکلا جارہا ہے۔ یاالٰہی! تو بڑا رحیم وکریم ہے۔ ہمارے بھائی نجیب الرحمان عثمانی نے دنیا میں تیرا حکم ہر حال میں مانا ہے تیری رضا ہی میں اس نے اپنی رضا سمجھی ہے یا پروردگار عالم! میت جنازہ میں شریک ہر مومن کے دل کی آواز تھی کہ یہ جنتی ہے آواز خلق کو نقارہ خدا سمجھو اس لئے یقین ہے کہ نجیب الرحمان عثمانی کو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور رحم سے جنت الفردوس نصیب ہوگی۔

ادارہ ''برہان'' اپنے قارئین کرام سے گزارش کرتا ہے کہ مرحوم نجیب الرحمان عثمانی کے ایصالِ ثواب کے لئے گھروں میں اسلامی درسگاہوں میں قرآن خوانی کا اہتمام فرمائیں اور مغفرت کے لئے دعاگو رہیں۔ اس کے لئے ہم تمام حضرات کے ذاتی طور پر شکرگزار رہیں گے انشاء اللہ!

مولانا محمد عبدالرشید نعمانی کی وفات حسرت آیات

ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی سے جن کا علمی واسطہ ورابطہ تھا وہ رفتہ رفتہ اب اس دنیا سے اٹھتے جارہے ہیں جس کی وجہ سے علمی میدان میں ایک خلا سا محسوس ہو رہا ہے۔ ایک کے بعد ایک علمی ہستی اس دنیا سے اٹھتی جارہی ہے اور ہم کو رنج و غم کے صدمہ میں مبتلا کرتی جارہی ہے۔ ایسی ہی ایک عظیم شخصیت حضرت مولانا محمد عبدالرشید نعمانی کی ہے جو ماہ اگست ۱۹۹۹ء کے آخر عشرہ میں کراچی پاکستان میں موت کی آغوش میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سوگئی انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم مولانا عبدالرشید نعمانی کا بانی ندوۃ المصنفین دہلی حضرت مفکر ملت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ سے خصوصی تعلق تھا حضرت قبلہ مفتی صاحب نے ان کی علمی صلاحیتوں کو پہچان کر ان سے کتاب لغات القرآن لکھوائی جو مفید قرآنی خدمت ہے یہ حروف معجم پر مرتب کی گئی ہے اور چھ جلدوں میں مکمل ہوئی ہے شروع کی چار جلدیں جو الف سے شروع ہو کر ع پر ختم ہوئی ہے مولانا نعمانی کی محبت وریاضت کا ثمرہ ہے اس کی پہلی جلد کے شروع میں مولانا نعمانی مرحوم کا بیش قیمت معلوماتی مقدمہ ہے جس میں کتاب کی نوعیت اور اس کی ترتیب میں ملحوظ رکھے جانے والے امور کے علاوہ اپنی محنت وجاں فشانی وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے اس کو بڑے اہتمام سے حضرت مفتی صاحبؒ کی نگرانی میں ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی کی طرف سے شائع کیا گیا۔ باقی دو جلدیں مرحوم کی عدم فرصت کی وجہ سے حضرت مولانا سید عبدالدائم جلالیؒ نے مرتب فرمائیں۔ جب بھی مرحوم دہلی میں قیام فرماتے رسالہ "برہان" کے لئے علمی مضامین لکھتے جو برہان میں شائع ہو کر علمی دنیا میں قبولیت کی سند حاصل کرتے مرحوم میں بے پناہ خوبیاں تھیں پاکستان جاکر بھی ہندوستان کی یاد انہیں ستاتی رہتی ان کے انتقال سے ادارہ "برہان" کو زبردست صدمہ ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا محمد عبدالرشید نعمانی کی بال بال مغفرت فرمائے اور کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

مولانا محمد عبدالرشید نعمانی کے انتقال سے تمام علمی دنیا تعزیت کی مستحق ہے۔ ادارہ برہان اظہار تعزیت کرتا ہے اور تمام متعلقین کے لئے صبر جمیل کی بارگاہ عالی میں دعا کرتا ہے۔

(ادارہ برہان دہلی)

مفتی عزیز الرحمٰن چمپارنی
دفتر ملی کونسل صوبہ دہلی

اسلامی نظام زندگی اور مدارس دینیہ کا کردار

نور، ہدایت کی شعاعوں سے کفر، الحاد شرک اور ظلم واستبداد کی چھٹتی ہوئی ظلمت نے انسانوں کو اسلام کی حقانیت کی طرف متوجہ کردیا ہے اور محرومی ویاس کی گرداب میں غوطہ لگاتی انسانیت اپنے دلوں میں امید کی کرن محسوس کررہی ہے، اور دنیا کی نگاہیں اسلام کی طرف مرکوز ہیں۔

اسلامی فتح وظفر اور خدائی نصرف وتائید کا تشکر یہ ہے کہ ان حقانی افکار کے شیوع کی ذمہ داری کا احساس علماء حقانی اپنے دلوں میں پیدا کریں۔ کیونکہ پورے صبر واستقامت ثبات پامردی یقین محکم اور جہد پیہم کے ساتھ معاشرہ انسانی کی تعمیر اسلامی فکروں کی بنیاد پر کرنے اور قانون شریعت کی راہ پر گامزن کرنے کی ذمہ داری کا حق علماء ربانی کے سوا امت کا کوئی دوسرا طبقہ نہیں ادا کرسکتا ہے۔

یہ اس لئے کہ ہر انفرادی واجتماعی انقلاب انہیں فکری بنیادوں کا آئینہ دار ہوتا ہے جو اس فرد یا معاشرے کے ذہن وفکر میں پیدا ہوتا ہے کیونکہ جب تک انسان کے ذہن میں ایسی فکری بیداری کا نور اپنی ضیاپاشیاں نہیں کرتا اسلامی نظام زندگی کے لئے راہ ہموار نہیں ہوتی اور جب تک اسے فکری انقلاب کی تحریک شروع نہیں ہوتی انسانیت کی کشتی ظلم واستبداد کے طوفانوں میں تھپیڑے کھاتی رہتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ موجودہ حالات میں اسلامی نظام زندگی کی آواز طوطی بہ نعرا ہے۔ اس لئے کہ جو کان ہنگاموں کے عادی ہوتے ہیں ان پر طوطی کی نرم ونازک آواز کا اثر نہیں ہوتا۔

ع مرد ناداں پر کلام نرم ونازک بے اثر

زاغ وزغن کی پکار کے خوگر صوت بہزاد کا لطف نہیں اٹھا سکتے۔ طوفانوں سے لطف لینے والے موجوں کی لطافت محسوس نہیں کرتے، کانٹوں میں الجھنے والے پھول کی نزاکت نہیں جانتے، لیکن جیسے جیسے قوت احساس میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ جذبات وعواطف کی لطافت بڑھتی جائے گی اور سماج وماحول سے دبی ہوئی فطرت اپنا پیغام دے کر رہے گی۔

تاریخ کا ایک مسلم قانون "جبر تاریخ" یعنی تاریخ اپنے مخصوص قوانین کے تحت آگے بڑھتی ہے اس کے قوانین کسی شخص کے تابع نہیں اور نہ وہ کسی کی مرضی کا پابند ہے۔ اس پر کسی جابر و قاہر کا جبر نہیں وہ خود اپنے جبر سے ہر طاقت کو دبا دیتی ہے اور جبر تاریخ کے کرشمے دنیا نے بڑھا دیکھے ہیں۔ بہت سے ملکوں کے حکمرانوں اور بادشاہوں نے ایک لمحہ کے لئے سوچا تھا کہ ان کی سلطنت جا بھی سکتی ہے اور اس حکومت کو زوال بھی آسکتا ہے۔ مگر جبر تاریخ نے اپنا کرشمہ دکھایا کتنوں کے تاج سلطانی ٹھوکروں میں آگئے اور کتنے تاج و تخت سے محروم ہو کر کاسہ گدائی لینے پر مجبور ہو گئے۔

جذبہ نو جو اٹھا وقت کے دھارے کی طرح
تخت سیلاب میں بہنے لگے تختے کی طرح

تاریخ شاہد ہے کہ کسی آواز کو کمزور یا کسی طاقت کو ضعیف سمجھنا انتہائی بھول ہے۔

آواز میں سنجیدگی اور طاقت میں متانت ہو تو ایک نہ ایک دن انسانوں کا حقیقت پسند طبقہ اس کی حمائت کے لئے تیار ہو ہی جاتا ہے۔

کیا یہ حقیقت نہیں کہ وہ لوگ جن کا مقدر غلامی اور جن کی قسمت بادشاہوں کی جوتیوں سے لگی ہوئی تھی۔ وہی تاج و تخت کے مالک اور ملکوں کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے والے بن گئے۔

غربت وافلاس کو اپنا مقدر سمجھ کر کاہلی و بے حسی کو قناعت کا نام دینے والے بھی آج بیدار ہو کر زندگی کی دوڑ میں اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ جب بھی سسکتی اور تڑپتی انسانیت میں زندگی کی صحیح روح پھونکی گئی ہے انسانیت جاگ کر اپنے مقصد زندگی اور نصب العین کے لئے ہر طرح مستعد اور چاق و چوبند ہو گئی ہے۔

آج انسانیت تاریخ کے اس موڑ پر کھڑی ہے جہاں اس کی رہنمائی اور قیادت کے لئے علماء حقانی کو ماضی کے مقابلہ کہیں زیادہ حساس اور علم واخلاق سے مسلح ہو کر میدان میں سرگرم عمل ہونے کی ضرورت ہے اور ہمہ جہتی کوششوں کو بار آور کرنے کے لئے پورے عزم وحوصلہ کے ساتھ خدا کی بخشی ہوئی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی حاجت ہے۔

حوصلہ شکن حالات میں تابناک مستقبل

کاروان ملت کے لئے حالات کا موجودہ انداز اگرچہ پریشان کن اور بظاہر حوصلہ شکن ہے مگر مستقبل انتہائی تابناک اور امید افزا ہے اس لئے کہ ان حالات نے اتنا ضرور ثابت کردیا ہے کہ دور حاضر کا انسان نہ تو بے جان بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہونے کے لئے تیار ہے نہ بے عمل انسانوں کی عظمت کا قائل ہے۔ اب کسی عظمت کا بت نہیں پوجا جاسکتا اور نہ کوئی انسان کسی کو بلاوجہ اپنی بالاتری کے لئے مجبور کرسکتا ہے۔ اب زمانہ "عقل وہوش کا ہے نسل نو" دعوت فکر وعمل چاہتی ہے، الفاظ کا جادو انہیں نہ تو مسحور کرسکتا ہے اور نہ پرفریب نعروں سے انہیں بہلایا جاسکتا ہے۔

تاریخ نے دولت کے اصل چہرے سے نقاب کشائی کرکے اس حقیقت کو بھی واشگاف کردیا ہے کہ دولت کار بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ مزدور کی زندگی سرمایہ دار کے رحم وکرم پر نہیں بلکہ سرمایہ دار کی حیات وکائنات مزدور کے دست وبازو سے وابستہ ہے۔ وہ دور لد گیا جب ایک مزدور سرمایہ دار کو اپنی قسمت کا مالک سمجھتا تھا اور اس کے ہاتھوں ملنے والی مزدوری کو دست خدائی تصور کرتا تھا۔

سرمایہ دار کے خلاف آواز دست رزق سے ہاتھ دھو بیٹھنے کے مرادف تھا لیکن تاریخ نے ثابت کردیا کہ مزدوروں کی آواز سے سرمایہ داروں کے ناطقے بند ہوگئے، اور ان کی آہوں سے دولت مندوں کی راتوں کی نیند حرام ہوگئی، اور بندگی وغلامی کی زنجیروں کو انہوں نے توڑ کر آزادی حاصل کرلی۔ ع

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے ایک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی

اور ظالم سرمایہ داروں کے ظلم وجبر پر مظلوموں کی آہ وفغاں نے خاتمہ سرمایہ داری کا نقارہ بالآخر بجا کر چھوڑا اس لئے کہ ظلم کی کوئی صورت کا انجام زوال ہے۔ علامہ جزری نے ایک مظلوم کی آہ کا نقشہ عجیب انداز میں کھینچا ہے۔

الا قولا لشخص قد تقوی　　علی ضعفی ولم یخشی رقیبہ
خبات لہ سہا مافی اللیالی　　وارجو ان تکون لہ مصیبہ

سن لو ظالم سے کہہ دو جو جری بنا ہوا مجھے کمزور سمجھ کر اپنے حقیقی نگہبان سے بے خوف نہ ہو جائے میں نے راتوں میں بیٹھ کر ایسے دعاؤں کے تیر اس کے مقابلہ کے لئے پوشیدہ طور پر تیار کر رکھے ہیں اور مجھے اللہ سے امید ہے کہ ان تیروں کا نشانہ ضرور لگے گا۔

موجودہ ناقص نظام کے مقابلہ میں مکمل اسلامی نظام زندگی

موجودہ عالمی نظام جو قرآنی ہدایت اور الہامی روشنی سے دور ہٹ کر وضع کئے گئے ہیں اور یہ کہنا چاہئے کہ خواہ وہ شوشلزم یا جمہوریت یا سرمایہ داری نظام ہو سبھی باطل اور روضعی نظام ہیں جو الہامی نظام کے یکسر منافی ہیں ان کے مدوجزر اتھل پتھل اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ انسانی زندگی کے مسائل کا یہ حل نہیں بن سکتے۔ مگر چونکہ وہ اس طرح رائج اور ذہنوں کو ان سے مانوس کر دیا گیا ہے کہ ان نظام ہائے باطل کے مقابلے میں جب یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام ہی مکمل نظام حیات ہے۔ تو یہ دعویٰ اہل باطل اور اسلامی نظام سے غیر متعارف اور غیر مانوس ذہنوں کو اجنبی سا لگتا ہے اور اس دعویٰ کو وہ مہمل تصور کرتے ہیں۔

لیکن اب تاریخ کے پے در پے انقلابات نے سوئے ہوئے ذہن کو جھنجھوڑ دیا ہے۔ اب ضرورت صرف اتنی ہے کہ اسلام کے عادلانہ اور حقیقت پر مبنی نظام کو سنجیدگی سے معقول انداز میں پیش کیا جائے کام متوازن اور پر مغز کیا جائے تو قبول کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ ع

اٹھ کہ دنیا میں تیرے دور کا آغاز ہے　　اب زمانہ کا اور ہی انداز ہے

صرف اسلام ہی ہر شعبہ زندگی کا حل ہے

لوگ یہ سوال کرتے ہیں اور معقول سوال ہے کہ موجودہ مسائل کے طوفان میں کیا اسلام مکمل حل بن سکتا ہے، اس کا جواب عام فلسفہ کی روشنی میں بھی دیا جاسکتا ہے اور خالص اسلامی انداز میں بھی۔

اسلامی انداز میں تو آسانی سے یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ اسلام کے مکمل نظام حیات کا تصور ان تمام شر پسند عناصر کا جواب ہے جو اسلام کے دینِ کامل ہونے کا مذاق اڑاتے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام صرف نماز روزے اور صرف عبادت کا مذہب ہے، اس کا عالمگیر دستور اور جامع قانون زندگی کا دعویٰ کرنا کیسے درست ہو سکتا جبکہ اس کے پاس مارکس جیسا معاشی فلسفہ ہے اور نہ یورپین مفکرین جیسا فلسفہ حیات،

حقیقت کی طرف

میں اپنے ان دوستوں سے کہوں گا کہ کسی نظام زندگی کے بارے میں قطعی رائے قائم کرنے سے پہلے اس کی خوبیوں اور خرابیوں کی تحقیق اس کا تجربہ اور تجزیہ ضروری ہے۔ میں پھر کہتا ہوں اور پورے اطمینان قلب اور یقین کے ساتھ کہ اسلام کے دامن میں ہر شعبہ زندگی کا حل موجود ہے۔ اس نے زندگی کی ہر بیماری کا علاج مہیا کیا ہے یہ اور بات ہے کہ اسلام کو مکمل ضابطہ حیات کی حیثیت سے کم لوگوں نے پہچانا اور اس کی ہمہ جہتی چہرہ کا عرفان کم لوگوں کو ہوا جو پورے طور پر فلسفہ حیات کو پیش کرتا ہے۔

اور اس مقام پر اپنے رنج درد دروں کا اظہار کرتے ہوئے عرض کروں تو حرج نہیں ہے کہ اسلام کے پیش کرنے والے مفکرین نے بھی اس انقلاب انگیز ترقی یافتہ دور میں زندگی کے اٹھنے والے مسائل کا حل اسلام میں ڈھونڈھ کر پیش کرنے کے بجائے فرار کی راہ میں انہوں نے عافیت سمجھی اور اس کے محدود تصورات ہی پر اکتفا کر لیا بڑے ادب واحترام کے ساتھ ان مقدر ہستیوں کی خدمت میں عرض کرنے کی جرأت کر رہا ہوں جن کے مبلغ علم وسعت مطالعہ اور

درک کتاب وسنت پر ہمیں مکمل اعتماد اور ان کے رسوخ فی العلم کا کامل ایقان ہے کہ

وہ موجودہ چیلنج کو سمجھنے کی طرف اپنی توجہات مبذول فرمائیں اور دنیائے زندگی میں نئے ابھرتے ہوئے مسائل اور باطل نظام کے مقابلے میں اسلام کو ایک مکمل زندگی کے قانون کی صورت میں صرف پیش ہی نہیں اس کے اصولوں کی تنفیذ کے لئے کوشاں ہوں۔ انجام خدا کے ہاتھ میں ہے کوشش کے ہم مکلف ہیں۔ جس خدا کی زمین ہے اور جو کائنات کا حقیقی مالک ہے کیا ہم اس کی طرف سے آئے ہوئے قوانین کے نفاذ کے لئے جدوجہد بھی نہیں کر سکتے اس کے لئے سب سے پہلے ضروری ہے کہ ہم اپنی صفوں سے بالاتر ہو کر سوچیں اور ذاتی منفعت و مفاد سے صرف نظر کر کے ہم دنیا کے چیلنجوں کو قبول کرنے اور دنیا کے سامنے زندگی کے تمام شعبوں میں اسلام کے قوانین کو پیش کرنے کے لئے تیار ہو جائیں تو ملکوں کا دستور کتاب وسنت قرار پائے گا اور اس روئے زمین پر مالک حقیقی کا قانون نافذ ہو کر رہے گا اس لئے اب تک جتنے نظام آئے ہیں ان کی ناکامی دنیا کھلی آنکھوں دیکھ رہی ہے۔ اور انسان کو ان جملہ نظام ہائے باطل میں سوائے ضیق و تنگی بے چینی واضطراب ظلم وزیادتی کے سوا کچھ نہیں مل سکا۔

اب وقت آگیا ہے اس مضطرب انسانیت کو امن وسکون دینے والے نظام عدل وانصاف پر مبنی جامع دستور حیات کی روشنی دکھائیں۔ خدا کی قسم الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی کا یہی مفہوم ہے کہ ہم ثابت کر دیں کہ دین مکمل جس پر انسانیت کے لئے خدا نے اپنی نعمتوں کا اتمام کر دیا وہ دین حق ہے۔ جس میں زندگی کے تمام شعبوں عبادت اخلاقیات معاشیات معاشرت حکومت اقتدار تدبیر مملکت غرض کہ کوئی شعبہ نہیں جس کو اسلام نے تشنہ چھوڑا ہو یہی انسان کو حقیقی سکون دے سکتا ہے اور اسی میں سماجی انصاف مل سکتا ہے۔ یہی صحیح معنوں ایک مظلوم کی اشک شوئی کر سکتا ہے اور اس کے علاوہ سارے نظام باطل ہیں۔ ومن یبتغ غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منہ وھو فی الآخرۃ من الخاسرین آخرت کا خسارہ اس پر ہی صرف نہ ہوگا کہ اس کا معتقدات پر ایمان کامل نہ تھا اس کا نظام عبادت بہت مستعد نہ تھا بلکہ آخرت کا خسران اس پر بھی ہوگا کہ دنیا میں تجارت معیشت معاشرت

حکومت و حکمرانی کا نظام غیر اسلامی تھا جس کے لئے ہم تیار تھے یا جس پر ہم خاموش تھے۔

یہ بہت ہی اہم فکر ہے کاش ارباب مدارس اس پر غور فرماتے اور دنیا کے اس چیلنج کو قبول کر کے دوش بدوش ہو کر اس کے لئے جد وجہد کرتے، اور ہمارے مدارس اور ارباب مدارس میں توافق کا ماحول پیدا ہو جاتا۔ یہ کام اتنا اہم ہے کہ اس کی اہمیت کا احساس کروڑوں انسانوں کی نجات اور ملت اسلامیہ کے لاکھوں نونہالوں کے تابناک مستقبل کی فکر سے دبا ہوا طبقہ ہی کر سکتا ہے۔

آزاد فضا میں غیر ذمہ دارانہ زندگی گزارنے والا اس گھٹن کا اندازہ نہیں کر سکتا پر سکون ماحول میں سانس لینے والا اس ذہنی پریشانی کو کس طرح محسوس کر سکتا ہے۔

یہ احساس اس کی سعادت ہے جسے فطرت نے درد اور بشریت نے احساس دیا ہے۔ یہ اندازہ اس کا حصہ ہے جسے حالات نے تڑپ اور تڑپ نے قوت اظہار دی ہے۔

اب دور حاضر کو یہ یقین دلانا ہوگا کہ اسلام کا دامن وسیع ہے، لیکن تنگی نظر اور کوتاہ بینی نے دنیا کو ان حقائق سے محروم کر رکھا ہے، اور آج بھی وہ اسلام کی گہرائی میں اترنا چاہیں تو یقیناً زندگی کے ہر مسئلے کا حل اسلام میں مل سکتا ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ معاشی حالات نے انسان کو حقیقت سے اتنا لاتعلق اور کاہل بنادیا ہے کہ مشکل کام کرنا تو بڑی بات ہے۔ مشکل بات کا سننا بھی ناگوار ہے، نفس کی تسکین اور نظر کے فریب ہی کو زندگی کا حاصل سمجھ لیا گیا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ ذہن سمجھنے سے قاصر اور دماغ فہم و فکر سے عاجز ہو گئے ہیں بلکہ اس لئے کہ حالات سے تھکا ہوا انسان بہلاؤں کی چھاؤں میں پناہ لینا چاہتا ہے اور محنت کے بجائے راحت و آرام کا خواہاں ہے مشکلات کو حل کرنے کے بجائے سہل انگاری اس کا مزاج بن گیا ہے۔

خطرات اور ہماری ذمہ داری

اس ذیل میں ایک اہم مسئلہ کی طرف اشارہ کرنا مناسب ہے ادھر کچھ عرصے سے سماج کے بعض ہندو عناصر مسلمانوں کے بعض مخصوص قوانین میں ترمیم کر کے ان کی جگہ مشترکہ

قوانین کی تنفیذ کے لئے بضد ہیں، جن کے خلاف مسلمانوں کی طرف سے بھی صدائے احتجاج بلند کی گئی ہے۔ دور حاضر میں ناچیز راقم نے جہاں تک سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ اس پورے احتجاجی کوششوں میں مسلمانوں نے مسئلہ کی روح کو نظر انداز کر دیا ہے کیونکہ کوئی مسئلہ جذبات کی بنیاد پر عمل نہیں ہوا کرتا۔

اور میں اس لئے یہ عرض کر رہا ہوں کہ جب تک مسئلہ میں مسلم غیر مسلم کا تفرقہ باقی رہے گا مخالفین کو سیکولرزم کے حوالہ سے صدائے احتجاج کے اثرات ختم کرنے کا موقع ملتا رہے گا۔

اگر غور کیا جائے تو مسئلہ کی روح حکومت وقت کے سامنے نئے انداز میں پیش کرنے اور ارباب حکومت کو وقت کی نزاکت کا احساس دلاتے ہوئے عالمی فسا کو مٹانے کی کوشش کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ گذشتہ دور غلامی نے مسلمانوں کے ذہن کو اس قدر مسخ کر دیا ہے کہ مسلمان حکومت وقت کے جملہ قوانین پر عمل کرنے کے بعد صرف نکاح وطلاق اور میراث ووقف وغیرہ جیسے معدودہ مسائل کو ہی مخصوص اسلامی قانون سمجھ کر احتجاج کر رہا ہے اسے یہ احساس ہی نہیں کہ اس طرح وہ غیر شعوری یا شعوری طور پر اسلام کے ایک محدود نظریہ زندگی ہونے کا دنیا کے سامنے اعلان کر رہا ہے ہمیں چاہئے کہ ایوان حکومت سے یہ کہا جائے کہ 'اسلام کے ضابطہ حیات کو مسلمانوں کا مخصوص قانون قرار دینے کے بجائے ایک عام دستور زندگی سمجھ کر زندگی کے تمام شعبوں میں اسے اسی طرح منطبق کیا جائے جس طرح دوسرے قوانین منطبق کئے جاتے ہیں۔"

اور اگر انگریزی قوانین کے نفاذ سے ملک انگریزی نہیں ہو جاتا، کمیونزم کے اصولوں سے ملک کمیونسٹ نہیں ہو جاتا۔ سرمایہ داری کے نظام اپنانے سے ملک کی حریت وجمہوریت پر آنچ نہیں آتا تو اسلامی زندگی کے رائج کرنے سے جمہوریت کیسے متاثر ہو جائے گی۔ بہر اسلام اور دوسرے مذاہب میں ایک امتیازی فرق یہ بھی ہے کہ دوسرے مذاہب کے پاس زندگی کا مکمل فلسفہ نہیں ہے۔ مگر اسلام کے پاس مکمل فلسفہ زندگی اور دستور حیات موجود ہے اس لئے انصاف کا تقاضہ یہی ہے کہ کم از کم ایک مختصر وقت کے لئے ہی تجرباتی طور پر اس کے قوانین کو

سماج پر منطبق کیا جائے اگر اس کے نتائج امید افزا بر آمد ہوتے ہیں تو اس کو آخری قانون قرار دے دیا جائے۔

انسانوں کی ابتری اور تباہی کا سب سے اہم سبب یہ ہے کہ مذہب کو ہوا بنا کر میدان عمل سے دور کر دیا گیا ہے اور خود ساختہ اصولوں کو انسانیت کا معیار نجات قرار دے دیا گیا ہے۔

ملوکیت کی جگہ پر جمہوریت سرمایہ داری کے بجائے اشتراکیت کی ضرورت اسی لئے دنیا نے محسوس کی کہ ملوکیت کے مفاسد و مظالم نے جمہور کو آواز بلند کرنے پر مجبور کیا اور سرمایہ داری کے لوٹ مار نے مزدوروں کو اپنے حقوق کے مطالبہ پر آمادہ کیا اور دنیا نے ملوکیت و سرمایہ داری کے مفاسد و مظالم کو ایک زمانے تک جھیلنے کے بعد یہ سمجھ لیا کہ انسانیت کو نظام امن واطمینان عدل وانصاف دے سکتے۔

اب کوئی وجہ نہیں کہ ان باطل نظریات کی بنیاد پر رائج کئے گئے ناقص نظاموں سے اکتائی دنیا کو اسلام کے عادلانہ نظام کا سایہ مل جاتا ہے تو اس سائے سے صرف اس لئے فرار اختیار کرے کہ اس کا نام "مرغوب خاطر" نہیں ہے۔ ڈوبنے والا تنکے کا سہارا ڈھونڈتا ہے ٹھوکر کھا کر گرنے والا اپنے سر کو بچانے کے لئے ہاتھ ٹیک دیتا ہے۔

اس نظام اسلام کو لاگو کرنے اور اسلامی قانون زندگی کی تنفیذ سے گھبراہٹ عام انسانوں کو نہیں ہے۔ بلکہ دنیا کے وہ سرمایہ دار جنہوں نے پوری دنیا کے اقتصادیات پر پنجہ گاڑ دیا ہے اور جن کے قبضے میں مالیاتی ادارے ہیں، وہ اپنی گرفت سے کسی وقت بھی جس ملک کو چاہتے ہیں اپنی مرضی کے مطابق گھما دیتے ہیں جس ملک کو اٹھانا چاہتے ہیں اٹھا دیتے ہیں، اور جس ملک کو گرانا ہو معاشی بحران پیدا کر کے اپنی پالیسی کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

سخت افسوس اس بات پر ہے کہ مسلم حکومتیں حتی کہ سعودی عربیہ وغیرہ بھی اس گرفت سے آزاد نہیں ہیں اور تمام ملکوں کو ان مٹھی بھر انسانیت کے دشمن سرمایہ داروں نے

معاشیات پر کنٹرول رکھنے کے ذریعہ بوتل میں اتار رکھا ہے۔ اور ظاہر ہے بوتل میں اتارنے کے بعد جب چاہیں اس پر ڈھکن لگا سکتے ہیں۔

امریکا میں گو عیسائی اکثریت میں ہیں مگر حکومت واقتدار اور حکومت کی پالیسی یہودیوں کی مرضی سے بنتی ہے، اسی طبقہ کی پشت پناہی سے اسرائیل تمام عرب ملکوں پر گھنٹی بجایا کرتا ہے۔ اور پھر ہمارے اس ملک کے اسرائیل کے ساتھ جدید معاہدات نے کس حد تک یہودی پالیسیوں پر عمل کرنے کا پابند کر دیا ہے۔ اسی سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے اور اس ذیل میں آپ غور فرماسکتے ہیں کہ ہندوستان کے اندر اسلامی تحریکوں دینی اداروں اور دینی مدارس تعلیم گاہوں اور ملی تنظیموں کے سلسلے میں حکومت ہند اسرائیل اور یہودی پالیسی کے تحت دباؤ سے کس طرح کی ترجیحات اختیار کر سکتی ہے، اور جب کہ پہلے سے اسلام اور مسلمان ان یہودیوں کے لئے کباب کی ہڈی رہے ہیں۔

مومن کی فراست ایمانی جس سے دنیا کانپتی تھی خدا کے فضل سے ہمارے دینی مدارس کے ذمہ داروں اساتذہ کرام اور ہماری ملت کے رہبروں علماء و مشائخ عظام اس دولت سے وافر حصہ میں بہرہ ور ہیں اور دینی بصیرت سوز دروں ملت کا بھرپور درد رکھنے والے روشن ضمیر حضرات علماء کرام کی ان حالات میں کیا کچھ ذمہ داری ہوتی ہے۔

یقین جانئے دینی مدارس کا ماضی میں جو رول رہا ہے، اور دینی مدارس نے علم حریت لیکر میدان کارزار میں مجاہدانہ داخل ہونے والی جو فوج تیار کی ہے، اور دینی مدارس نے ماضی میں انسانیت کو امن وسلامتی عدل وانصاف کا پیغام دیا ہے، اور میزان عدل قائم کرنے میں جو کلیدی رول ادا کیا ہے، ملت کی پاسبانی اور حفاظت کا فریضہ ادا کیا ہے۔ یہ زریں تاریخ اسلام دشمن عناصر کے سامنے کھلی کتاب کی طرح ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اسلام کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز کو انہیں بوریہ نشینوں نے زیر زمیں دفن کر دیا ہے مغرب کے سمندر میں اٹھنے والے الحاد وزندیقیت ارتداد ودہریت کے ہر طوفان دتھپیڑے ان دینی مدارس کی دیواروں سے ٹکرا کر ختم ہوگئے ہیں۔ ۱۸۵۷ کا غدر ہو کہ تحریک آزادی غلامی کی

زنجیروں کو توڑ دینے اور حصول آزادی کی روح عوام میں پہنچانے کا فریضہ انہیں دینی مدارس نے ادا کیا ہے۔ دار و رسن ہو کہ انڈمان ومالٹا کی قید و بند علماء کرام نے ہنستے ہوئے ان کا استقبال کیا ہے ہماری اس روشن تاریخ کے تناظر میں وہ فیصلہ کر سکتے ہیں اور ہمارے دینی مدارس کے بارے کیا کچھ وہ سازشیں کر سکتے ہیں۔

تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے ۱۸۵۷ء میں یہاں کے برٹش سیاسی رپورٹر نے حکومت برطانیہ کو جب اپنے رپورٹ میں یہ لکھا کہ اب ہمارا اقتدار ہندوستان میں دو وجہوں سے قائم نہیں رہ سکتا۔

ایک دینی مدارس۔ دوسرے دینی علماء

اس لئے کہ مسلمان بیدار ہو چکے ہیں اور ان کی بیداری ان کی مذہبی کتاب قرآن اور ان دینی مدارس کے علماء کی وجہ سے ہے اس لئے کہ خالق کائنات کی کتاب انسان کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر صرف خدائے وحدہ لاشریک کی غلامی کی دعوت دیتی ہے اور ان دینی مدارس کے علماء غلامی کو موت پھانسی دار و رسن سے زیادہ ذلیل سمجھتے ہیں اور پھر اسی رپورٹ پر حکومت برطانیہ نے دینی مدارس کو تاخت و تاراج کر دینے اور علماء کرام کو پھانسی دے دینے کی ہدایت جاری کی، اور تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۷ء تک کا دور کیسا خونین گزرا سولہ ہزار علماء کرام کی گردنیں اڑائی گئیں۔ لاہور کی جامع مسجد میں پھانسی کا تختہ لٹکایا گیا اور اس کے نیچے آگ کا الاؤ جلایا گیا اور اسی حالت میں کسی عالم کی گردن میں پھانسی کا پھندا اڈالا جاتا تو کسی دوسرے کو جلتے ہوئے الاؤ پر لٹایا جاتا اور تیسرے عالم کو مذاق اڑاتے ہوئے کہا جاتا کہ کہاں ہے تمہارا خدا جو تمہاری حفاظت کرتا ہے، اور برٹش کی اسی ہدایت پر صرف دہلی کے اندر ایک روز میں ایک ہزار مدرسوں کی تخریب کاری ہوئی، اس وقت تاریخ آزادی کو دہرانا مقصود نہیں ہے، بلکہ آپ کے اسلاف کی ملک وملت کے لئے قربانیوں کی روشن تاریخ کی ایک جھلک صرف پیش کر کے یہ ظاہر کرنا تھا کہ جس قوم نے اسلام کو کبھی بھی پسند نہیں کیا وہ اسلام کے داعیوں اور اسلام مراکز اور دینی درس گاہوں کے

لئے اپنے دل میں کوئی نرم گوشہ رکھ سکتے ہیں۔

اس وقت بھی ہم حالات کے اس موڑ پر ہیں جہاں حکومت ہند یہودی لابی کے زیر اثر ہمارے دینی مدارس کے سلسلے میں گہری سازشیں اور ان کی تخریب کاری کے لئے اندر خانہ (Under Ground) پروگرام بنا رہی ہے۔

ہمیں اس طرف بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ یہ شاطر دشمن ہماری صفوں میں کبھی بھی اتحاد کو پسند نہیں کرتے رہے ہیں اور مختلف حکمت عملی سے تفریق انتشار اور اختلافات کو ہوا دے کر اس انتشار کا بھرپور فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔

اس میں ایک طرف تو ہماری توانائیاں ان کے لئے خطرہ بننے کے بجائے آپس میں ختم ہوتی رہی ہیں اور دور سے ہمارے ان اختلافات کو دیکھ کر مطمئن اپنی کمین گاہ میں مسکراتے رہے ہیں۔

دوسرے یہ کہ وہ کسی وقت میں کسی کی موافقت کرکے اس کو شہ دے کر اپنے ہی دوسرے ہاتھ کو نقصان پہنچانے کی پالیسی پر عمل کرتے رہے ہیں۔

کبھی وہ ایک دوسرے پر ہاتھ ڈالتے رہے ہیں یہ وہ تدبیریں رہی ہیں جن کا اندازہ ہم ڈیڑھ ہزار سالہ تاریخ کے مختلف ادوار سے کر سکتے ہیں۔ وقتی اور عارضی طور پر اپنے سیاسی مفادات اور مصلحتوں سے بسا اوقات ہمدردی کا اظہار کر دیا جاتا ہے یا بعض موقعوں پر انصاف کے مطالبوں میں ہمارے ہمدوش بھی ہو جاتے ہیں تو اس سے ملت کو دھوکہ نہیں کھانا چاہئے، اس لئے کہ کسی حکیم نے نہایت معقول بات کہی ہے۔

"دشمن کے حسن سلوک پر کبھی بھروسہ مت کرو، کیونکہ پانی کو آگ سے کتنا گرم کیا جائے پھر بھی وہ اس کو بجھانے کے لئے کافی ہے۔" ع

ریاض جس سے بڑھائے تھے دوستی کے ہاتھ
اسی کے ہاتھ میں خنجر دکھائی دیتا ہے

(دوسری قسط)

فن
تاریخ گوئی کی ابتداء

از

ڈاکٹر آفتاب احمد خاں ڈبل ایم، اے. پی، ایچ، ڈی (لیکچرر)

(۱۳) اردو دائرہ معارف اسلامیہ کا مقالہ نگار "ابجد" لکھتا ہے کہ عربی حروف کی یہ ابجدی ترتیب صوتی یا صوری اعتبار سے کسی خاص چیز سے واقعتاً مطابقت نہیں رکھتی اگرچہ وہ یقیناً بہت قدیم ہے۔ جہاں تک پہلے بائیس حروف کا تعلق ہے تو یہ ترتیب ایک قدیم لوح میں بھی موجود ہے جو راس شمرہ (مغربی شام میں لاذقیہ کے قریب واقع ایک گاؤں) میں ۱۹۲۸ء دستیاب ہوئی ہے...... (یہ اوگاریت یا یگارت کے باشندوں کے حروف ہجا تھے جو "راس شمرہ" کے پاس قدیم شہر تھا)...... اوگاریت زبان ایک سامی زبان ہے جس کا رشتہ قدیم عبرانی سے ملتا ہے۔ لہٰذا اس ابجدی ترتیب کا کم از کم کنعانی الاصل ہونا یقینی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ عبرانی اور آرامی حروف ہجا میں یہ ترتیب قائم رکھی گئی اور بلاشبہ عربوں نے موخر الذکر حروف کے ساتھ ہی یہ ترتیب بھی اختیار کرلی ہوگی۔[۴]

(۱۴) ڈاکٹر محمد انصار اللہ لکھتے ہیں کہ: "محققین کا اس بارے میں اتفاق ہے کہ دنیا کے تمام قدیم وجدید حروف تہجی سامی حروف سے ماخوذ ہیں۔ عربی اور ہندوستانی حرفوں کا ماخذ بھی یہی سامی حروف ہیں۔" [۵] اور چونکہ سامی ابجد کے تمام بائیس حروف کے بالترتیب ایک سے چار سو تک اعداد مقرر کر رکھے ہیں لہٰذا عربوں نے بھی انہیں اختیار کرلیا۔

(۱۵) محمد اسحاق صدیقی صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ سامی قوم سے پہلے کسی قوم نے حروف

---

[۴] ا:۳۳۷و۳۳۸

[۵] منادید تاریخ گوئی مشمولہ مجلہ دانش دیژہ (خصوصی) نامہ نمبر ۵۔۷، ص ۲۱۸

سے اعداد کا اظہار نہیں کیا تھا چنانچہ بعد میں جب کسی قوم نے سامی خط اختیار کیا اور اپنی ضرورت کے مطابق کچھ نئے حروف ایجاد کئے تو ان سے رسماً اعداد بھی منسوب کئے۔ چنانچہ عبرانی میں حروف سے چار سو تک، یونانی میں نو سو تک، عربی میں ہزار تک، جار جین میں دس ہزار تک اور آرمینین میں بیس ہزار تک اعداد منسوب ہیں۔[1]

(۱۶) علامہ سید سلیمان ندوی کے مطابق عربی میں ابتداءً اعداد کو لفظوں میں لکھا کرتے تھے بعد ازاں یہودیوں اور یونانیوں کی تقلید میں رقم حروف ابجد میں لکھنے لگے، جیسا کہ اب بھی عربی ہیئت (Astronomy) میں اختصار اور صحت کے خیال سے یہ طریقہ رائج ہے اور جس پر مشرق میں "ابجد ہوز......" کے قاعدہ سے مادۂ تاریخ نکالنے کا رواج ہے۔[2]

حروف کی ابجدی ترتیب اور اس سے متعلق آٹھ کلمات کی بابت یہاں تک جن روایات کا ذکر کیا گیا، ان کے بارے میں علامہ نیاز فتح پوری کا ارشاد ہے کہ:

"یہ سارے بیانات لغو ہیں، حقیقت یہ ہے کہ عربوں نے حروفِ ہجا عبرانی اور آرامی زبان سے حاصل کئے اور چونکہ وہاں یہی ترتیب تھی جو ابجد، ہوز وغیرہ میں پائی جاتی ہے اس لئے عربوں نے اسے بجنسہ لے لیا بعد کو البتہ اس ترتیب میں بلحاظ اسلوبِ تحریر و مخارج کچھ فرق ہو گیا۔"[3] تین تین چار چار حرفوں کو ملانے سے بعض کلمات کا بن جانا محض اتفاق ہے، لیکن ان سے یہ فائدہ ضرور ہے کہ اس طرح حروف کو بآسانی بالترتیب یاد رکھا جا سکتا ہے، اور شاید اسی غرض سے کلماتِ ابجد وضع کئے گئے تھے۔[4]

اس مقام پر رائے بہادر گوری شنکر ہیرا چند اوجھا کے ایک مقالہ بعنوان "علم الاعداد کا ارتقاء" کا ذکر ضروری ہے صاحبِ مقالہ نے لکھا ہے:

"علم الاعداد کی طرزِ جدید کی ایجاد ہندوستان میں ہی ہوئی۔ پھر یہاں سے اہلِ عرب نے یہ علم سیکھا اور عربوں نے اسے یورپ میں رائج کیا۔ اس کے قبل ایشیا اور یورپ کی کلدانی،

---

[1] فن تحریر کی تاریخ ص ۱۶۸
[2] عرب و ہند کے تعلقات ص ۱۳۴ مطبع معارف اعظم گڑھ طبع جدید ۱۹۹۲ء
[3] فن تاریخ گوئی اور اس کی روایت ص ۹ بحوالہ نگار (لکھنو) معلومات نمبر ص ۱۰۴ جنوری فروری ۱۹۵۸ء
[4] فن تحریر کی تاریخ ص ۲۳۵ بحوالہ مجموعہ استفسار و جواب جلد دوم

یونانی عربی تو میں ہندسہ کا کام حروف ہجی سے لیتی تھیں۔ عربوں میں خلیفہ ولید اوّل کے زمانہ تک اعداد کا رواج نہ تھا (۷۰۵-۷۱۵ء) اس کے بعد انہوں نے ہندوستان سے یہ فن سیکھا۔[1]

اس بیان پر یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ اگر ترتیب ابجد ولید بن عبدالملک کے عہد حکومت میں رائج ہو گئی تھی تو پھر مشرقی و مغربی ابجد کی ترتیب میں فرق کیوں واقع ہوا اور اس کے اسباب کیا تھے؟ یا پھر ولید کے عہد تک ذیل کی مغربی ترتیب ہی مشرق میں کیوں رائج نہیں ہوئی:

کلمات	ابجد				ہوز			حطی			کلمن			
حروف	ا	ب	ج	د	ہ	و	ز	ح	ط	ی	ک	ل	م	ن
اعداد	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۲۰	۳۰	۴۰	۵۰

کلمات	صعفض				قرست				ثخذ			ظغش		
حروف	ص	ع	ف	ض	ق	ر	س	ت	ث	خ	ذ	ظ	غ	ش
اعداد	۶۰	۷۰	۸۰	۹۰	۱۰۰	۲۰۰	۳۰۰	۴۰۰	۵۰۰	۶۰۰	۷۰۰	۸۰۰	۹۰۰	۱۰۰۰

واضح رہے کہ شمالی افریقہ اور جزیرہ نمائے اسپین و پرتگال میں پانچویں، چھٹے اور آٹھویں مجموعہ حروف کی ترتیب مختلف ہے، جس کی بنا پر مشرقی و مغربی ابجدی ترتیبوں کے چھ حرفوں کی عددی قیمتوں میں بھی فرق واقع ہو گیا ہے۔ ذیل کے نقشے میں ان چھ حروف کی عددی قیمت کے فرق کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

حروف	س	ش	ص	ض	ظ	غ
مشرقی اعداد	۶۰	۳۰۰	۹۰	۸۰۰	۹۰۰	۱۰۰۰۰
مغربی اعداد	۳۰۰	۱۰۰۰	۶۰	۹۰	۸۰۰	۹۰۰

اس فرق کی بنیادی وجہ کیا ہے اس سوال کا جواب بہ ظاہر آسان نہیں لیکن قیاس کے طور پر کہا

ـ حروف ابجد کے اعداد کے لحاظ سے یہ علم بقراط اور افلاطون کے زمانہ میں بھی یونان میں عام تھا (شمس المعارف ج ۱، ص ۳۹۲)

[1] قرونِ وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص ۱۳۵ و ۱۳۶، مترجمہ منشی پریم چند، ہندوستانی اکیڈیمی یوپی الہ آباد ۱۹۳۱ء بحوالہ بھارتی پراچین لپی مالا ص ۱۱۷

جاسکتا ہے کہ ہسپانیہ کی فتح اور وہاں اموی شہزادہ عبدالرحمٰن الداخل کے زمانہ (۱۳۸ تا ۱۷۱ھ / ۷۵۵۔۷۸۷ء) تک کلمات ابجد کی آٹھ مجموعوں میں تقسیم تو ہو گئی ہو مگر اس پر کامل اتفاق نہ ہوا ہو اور اس کے سبب ہی مشرقی و مغربی ترتیب کے مابین فرق واقع ہوا ہو اور ازاں بعد مشرقی ابجد نے ہارون الرشید کے زمانۂ خلافت (۱۷۰ھ / ۷۸۶ء۔ ۱۹۳ھ / ۸۰۸ء) میں، جو علوم و فنون اور تراجم کے اعتبار سے عہدِ زریں تھا، مستقل شکل اختیار کی ہو۔ ہمارے اس قیاس کو اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ خلیفہ ہارون کے عہد میں عبرانی زبان کے حروف تہجی پر جو تعداد میں بائیس ہیں اور بہ اعتبار ادبیات و علوم تمام سامی زبانوں میں سب سے زیادہ قدیم ہے۔ "ثخذ و ضظغ" کا اضافہ بھی ملتا ہے اور مزید علامہ سید سلیمان ندوی کے لفظوں میں کہ "عربی زبان میں حروف ہجا کی یہ تبعیت (پیروی) عبری کی ترتیب پر تھی" [۱] اس خیال کی تائید ابوریحان البیرونی (م ۴۴۰ھ / ۱۰۴۸ء) کے درجِ ذیل اقتباس سے بھی ہوتی ہے، وہ لکھتا ہے، "اہلِ ہند اپنے رسم الخط کے حروف سے اعداد کا کام نہیں لیتے جیسے کہ ہم عبرانی حروف کی ترتیب سے عربی حروف سے کام لیتے ہیں۔" [۲] طامس پیٹرک بھی اسی خیال کا ہم نوا ہے۔ چنانچہ اس کے لفظوں میں عربی ابجد کے پہلے چھ کلمات عبرانی "الفابیت" سے مشابہ ہیں اور آخری دو مجموعے عربی سے مخصوص ہیں۔ [۳]

عبرانی حروف تہجی کے بائیس حروف یہ ہیں:

الف (Alerh) بیط (Beth) گیمل (ج Gimal) دالط (Daleth) ہے (ہ) (He- E) واو (Vaw) زین (Zen) حیط (Hath) طیط (Tath) یود (Yod,Jod) کاف (Kaf) لامد (Lamed) مم (Mom) نن (Nun) سن یا سامک (Sun) عین (Ain) فے (Fe) صح یا صادے (Sade) قف یا قوف (Qof) رش یا ریش (Rash) شن یا شین (Shan) اور تاؤ (Taue) [۴]

عربی تلفظ کے اعتبار سے ان عبرانی حروف کی عددی قیمت اس طرح ظاہر کی جاسکتی ہے:

---

[۱] مقالات سلیمانی ۳: ۲۳۔۲۲ مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۳۹۱ھ / ۱۹۷۱ء [۲] قرونِ وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص ۱۳۷

[۳] "The First Six Of These Words Correspond To The Hebrew Alphbet ,The Last Two Consist Of The Letters Peculiar To Arabic "Cit Dictionaryof galam P.681Col.1

[۴] مقالات سلیمانی ۳: ۲۳۔۲۲، فن تحریر کی تاریخ ص ۱۵۸ پر شکل (نقشہ) نمبر ۱۰۸ نیز رائل ڈکشنری ان ٹوپار لیکے مختلف صفحات مطبوعہ میتھوڈسٹ پبلشنگ ہاؤس لکھنؤ ۱۸۹۳ء

ا، ب، ج، د، ہ، و، ز، ح، ط، ی، ک، ل، م، ن، س،
۱　۲　۳　۴　۵　۶　۷　۸　۹　۱۰　۲۰　۳۰　۴۰　۵۰　۶۰

ع، ف، ص، ق، ر، ش، ت۔
۷۰　۸۰　۹۰　۱۰۰　۲۰۰　۳۰۰　۴۰۰

ان حروف سے جو کلمات بنتے ہیں، ان کی ترتیب یہ ہے:

"ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت، ان کی عددی قدر چار سو تک ہے عربوں نے "ثخذ اور ضظغ" کا اضافہ کر کے ان تمام کلمات سے ایک ہزار تک اعداد منسوب کر لئے جو ان کے سامی مزاج کے مطابق تھے۔ یہاں اس جانب بھی اشارہ ضروری ہے کہ رومن ابجد کے آخری چھ حروف یعنی (U,V,W,X,Y,Z) بھی بعد کا اضافہ ہیں۔

اس بحث سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ عربی زبان کی یہ ابجد بے حد سائنٹفک اور جامع ہے چنانچہ دنیا میں سب سے زیادہ رائج زبان انگریزی کی چھبیس حرفی "ابتث" (الفابیٹ) کے بارہ حروف یعنی A.B.C.D جس سے ابجد بنتا ہے۔ [1] K.L.M.N جو براہِ راست کلمن سے اور Q.R.S.T قرشت سے ماخوذ ہیں۔ اسی عربی ابجد کے غیر معمولی اثرات کا نتیجہ ہیں۔ "ہوز" کے لئے انگریزی میں کئی حروف استعمال ہوئے ہیں جیسے "E.F.G.H.I.J" اس مجموعے میں 'E' ہائے ہوز (ہ) کی جگہ ہے اور F.G.H "واؤ" کے قائم مقام ہیں Though اور "Though" میں ہم آج بھی G.H کی آواز "واو" ہی نکالتے ہیں) J. از (زائے معجمہ) کی جگہ ہے۔ یوں مجموعی طور پر انگریزی حروف E F G H I J ہوز ہو جاتا ہے۔ [2] اس مثال سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ انگریزی زبان کے مذکورہ حروف عربی زبان کی ترتیبِ ابجد سے کتنے قریب اور اس سے متاثر ہیں۔

علم الاعداد کی ترویج واشاعت سے پہلے اہلِ عرب کی مانند یونانی اور رومی بھی ہندسوں (ارقام) کا کام حروفِ تہجی ہی سے لیتے تھے۔ چنانچہ رومن حرفوں کا استعمال اعداد کے بجائے آج کل بھی دیباچہ میں صفحات کی تعداد اور گھڑیوں میں وقت ظاہر کرنے کے لئے عمومی طور پر

---

[1] انگریزی کا حرف "C" اصل میں "ج" کا قائم مقام ہے۔ "جلال" کو ترکی میں آج بھی "CELAL" لکھتے ہیں۔ ملاحظہ ہو مقالہ "عربی زبان کی اہمیت" از ڈاکٹر نثار احمد فاروقی مشمولہ ماہنامہ منادی، نئی دہلی جلد 68 شمارہ ۱۱ ص ۷

[2] لسانی مطالعے ص ۱۶

کیا جاتا ہے۔ گرچہ آج کل ہر تعلیم یافتہ رومن حروف کے اعداد سے واقف ہے، تاہم ذیل کی جدول میں اس زبان کے ان حرفوں کو درج کیا جاتا ہے، جن سے اعداد منسوب کئے گئے ہیں۔ واضح ہو کہ اس رومن خط کا رواج انگلینڈ میں جولیس سیزر (Julius Caeser) کے حملے (۵۴۔۵۵ق۔م) کے بعد ہوا تھا۔

صورت حروف	تلفظ	عدد	صورت حروف	تلفظ	عدد	صورت حروف	تلفظ	عدد
I	آئی	۱	L	ایل	۵۰	D	ڈی	۵۰۰
V	وی	۵	C	سی	۱۰۰	M	ایم	۱۰۰۰
X	ایکس	۱۰	G	جی	۴۰۰	---	---	---

اس جدول کے رو سے G (جی اور L (ایل) پر آڑی [۱] لکیر بنا دینے پر ان دونوں حرفوں کی قیمت سو گنا و ہزار گنا بڑھ جائے گی یعنی علی الترتیب چالیس ہزار اور پچاس ہزار ہوں گے لیکن یہ دنو حروف بطورِ اعداد عام طور پر مستعمل نہیں۔ انہی حرفوں سے چھوٹے بڑے عدد رومن حساب سے بنا لیے جاتے ہیں یعنی بڑے عدد والے حروف کے بائیں جانب چھوٹے عدد والا حرف لکھنے سے قیمت کم اور دائیں جانب لکھنے سے قیمت زیادہ ہو جاتی ہے۔ مثلاً: IX: نو، XV: پندرہ، VC: پچانوے، GX: چار سو دس وغیرہ۔ لیکن انگریزی میں "G" کے علاوہ صرف سات حرفوں سے ہی بالعموم گنتیوں کا کام لیا جاتا ہے اب سوال یہ ہے کہ کیا عربی اساس زبانوں کی طرح تاریخ گوئی کا رجحان مغربی اور بالخصوص انگریزی زبان وادب میں بھی موجود ہے؟ تاریخی شواہد کی روشنی میں اس کا جواب نفی میں ہوگا۔ البتہ خواجہ حافظ کی وفات سے متعلق ذیل کی مثال کو مستثنیات یا محض تفریحِ طبع کا نتیجہ سمجھنا چاہئے:

Thrice Take From Mosullah Garth its Richest Grain Which is The Year of Hafiz's Death [۲]

یعنی صحنِ مصلّٰی سے اس کے سر سبز دانے کو تین مرتبہ اٹھالو یہی حافظ کا سالِ وفات ہے۔

---

[۱] دی رائل ڈکشنری ان ٹو پارٹس حروف G و L کے تحت

[۲] فنِ تاریخ گوئی از کسریٰ منہاس ص ۹

واضح رہے کہ یہ تاریخ بھی اصلاً فارسی کے درج ذیل مادۂ تاریخ پر مبنی ہے:

بجو تاریخش از "خاک مصلّی"[1] ۷۹۱ھ

منقولہ بالا انگریزی (Chronogram) سے سال اس طرح برآمد کیا گیا ہے کہ لفظ Mosullah (مصلّی) کے حروف "M" اور دو "LL" (ایل) کے اعداد کا میزان (۱۱۰۰) ہوتا ہے اس میزان میں سے اگلے مصرع (Hemistich) کے الفاظ Its Richest Grain کے ایک "C" (سی) اور تین "I" (آئی) کے ایک سو تین عدد کو تین گنا (۳۰۹) کر کے (۱۱۰۰) میں سے خارج (۱۱۰۰-۳۰۹) کرتے ہوئے مطلوبہ تاریخ ۷۹۱ھ حاصل کر لی گئی یعنی یہ تاریخ تخرجہ سے برآمد کی ہے۔ علاوہ ازیں بعض دیگر تاریخیں بھی ملتی ہیں۔

اہلِ یورپ نے جب عربوں سے حساب اور ہندسہ کا علم سیکھا تو معمولاتِ زندگی کے دیگر شعبوں سے حروف کا استعمال بطورِ اعداد متروک ہو گیا جیسا کہ خود اہلِ عرب نے ہندوؤں سے حساب ہندی (اَرقامِ ہندیہ) سیکھنے کے بعد حروفِ ابجد کو بطورِ اعداد استعمال کرنا ترک کر دیا تھا۔

سنسکرت میں بھی ویدوں کے زمانہ سے اعداد کو حرفوں سے ظاہر کرنے کی روایت رہی ہے۔ ابتداءً اس زبان کے چھتیس حروفِ تہجی یا حروفِ مقطعات کی ایک سے لیکر مہاسنگھ تک قیمت مقرر کی گئی ہے۔[2] یعنی حرف प (پا) کا ایک عدد ہے تو फ (پھا) کی قیمت مہاسنگھ ہے۔[3] اس علم کو سنکیت وِدّیا کا نام دیا گیا ہے۔ سنسکرت میں تاریخ گوئی کے اس طریقہ کا موجد آریہ بھٹ اول (پیدائش ۴۷۶ء)[4] کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن دسویں صدی عیسوی میں آریہ بھٹ ثانی[5] (ماہر ریاضی) نے سابقہ طریقہ کو آسان بنایا۔ اس نے سنسکرت کے تمام حروفِ تہجی کو درج ذیل چار گروہوں میں تقسیم کیا اور ہر گروہ کے حرفوں کی قیمت صفر سے نو تک مقرر کی۔

---

[1] دیوانِ حافظ مترجمہ پروفیسر عنایت اللہ راولپنڈی ص ۵۷۸ مطبوعہ بار اول ۱۹۲۴ء

[2] برائے تفصیل دیکھئے غرائب الجمل ص ۳۳ کی جدول اور فن تاریخ گوئی از کسریٰ منہاس ص ۱۳ تا ۱۴

[3] مہاسنگھ کے صفر یاد رکھنے کے لئے اردو کا یہ شعر کار آمد ہے: مہاسنگھ کے صفر انیس جان: شمار اس سے آئے نہیں مہربان۔ (لغات ہیر الفظ صفر کے تحت)

[4] پراچین بھارت کا اتہاس از ڈاکٹر رما شنکر ترپاٹھی ص ۲۰۶ ناشر موتی لال بنارسی داس دلی طبع ثالث ۱۹۶۲ء نیز بھارتیہ پراچین لِپ مالا ص ۱۱۶ مصنفہ رائے بہادر پنڈت گوری شنکر ہیراچند او جھا، پبلشر منشی رام منوہر لال، نئی دلی ۱۹۹۳ء

[5] آریہ بھٹ ثانی دسویں صدی عیسوی میں ہوئے، جنکی مشہور تصنیف "سدھانت" اٹھارہ ابواب پر مشتمل ہے۔

تعداد	۰	۹	۸	۷	۶	۵	۴	۳	۲	۱ क
حروف	یاں ञ	جھ झ	ج ज	چھ छ	چ च	ناں ङ	گھ घ	گ ग	کھ ख	ک क
حروف	ن न	دھ ध	د द	تھ थ	ت त	ڈاں ण	ڈھ ढ	ڈ ड	ٹھ ठ	ٹ ट
حروف						م म	بھ भ	ب ब	پھ फ	پ प
حروف			ہ ह	س स	ش ष	ش श	و व	ل ल	ر र	ی य

سنسکرت میں دراصل تینتیس حروف صحیح اور تیرہ حروف علت ہیں ڑ (ड़) اور (ढ़) اضافی حروف صحیح ہیں۔ بنابریں اس تقسیم بالا کی پہلی عمودی سطر میں ابتدائی چار حرف۔ ک، ٹ، پ، ی۔ ہیں لہذا اس طریقہ کو عرف عام میں صوتی اعتبار سے "کاٹاپایا" کا طریقہ کہتے ہیں اور ان چاروں حروف کی قیمت ایک ہے۔ دوسرے مجموعے "کھاٹھاپھارا" کے ہر ایک حرف کی قیمت دو علیٰ ہذا۔ چونکہ بنیادی عدد ایک سے نو تک ہی ہوتے ہیں اس لئے اس طریقہ میں تمام حروف کی قیمت بھی ایک سے نو تک ہی رکھی گئی ہے۔ ماتراؤں (اعراب) کا کوئی عدد شمار نہیں کیا جاتا۔ اس کے علاوہ تاریخ نکالنے میں ان حرفوں کا مجموعہ بھی بامعنی نہیں ہوتا، لیکن اس سے قطع نظر ابتدائی زمانے میں تاریخ گوئی کے لئے بعض ایسے الفاظ کا انتخاب کیا جاتا تھا، جن کی تعداد متعین تھی۔ یہ طریقہ آج بھی رائج ہے۔ چنانچہ ان الفاظ کو لکھ کر ان کی تعداد کے مطابق عدد شمار کرلئے جاتے ہیں مثلاً:

(۱) آکاس یا سنیہ: صفر، (۲) برہم (خدا) یا چندرما (چاند): ایک (۳) آنکھ، کان، ہاتھ: دو (۴) گُن (خواص): تین (۵) وید، ورن (ذات) جگ (زمانہ سمندر: چار (۶) پنج بھوت (عناصر خمسہ) اندری (حواسِ خمسہ) بان، تیر: پانچ (۷) رَس، شاستر (Scriptures) یعنی (عہد نامے) بھر مر (بھونرا) جس کے چھ پر ہوتے ہیں: چھ (۸) پاتال، سپت پوری، دھاتو، پربت، رشی، سُر (سا، را، گا، ما، پا، دھا، نی): سات (۹) جوگ [1] (نیک ساعت) گج (ہاتھی جو آٹھوں سمت کی حفاظت کرتے ہیں): آٹھ (۱۰) گرہ (تارے): نو (۱۱) دِشا (سمت): دس (۱۲) رُدر (دیوتاؤں کا گروہ جس کا مکھی شو ہے): گیارہ (۱۳) راشی (راس، بُرج) آدتیہ [2] (سورج جو بارہ حصوں میں تقسیم ہے): بارہ اسی طرح تیرہ، چودہ وغیرہ کو قیاس کیا جانا چاہئے۔ مثلاً رَتن: چودہ۔ (جاری)

[1] ریاضت و مجاہدہ (جوگ۔ یوگ) کے بھی آٹھ ذرائع ہیں دیکھئے سنسکرت ہندی کوش از وامن شورام آپٹے ص ۸۳۹ موتی لال بنارسی داس پبلشر زدلی ۱۹۸۹ء　[2] بحوالہ مقالہ مذکورہ تاریخ گوئی ص ۲۲۰ تا ۲۲۳ نیز وامن آپٹے۔ ص ۱۲۳، ۱۷۶، ۳۲۸، ۳۵۸، ۵۶۳، ۸۳۶، ۸۳۹، ۱۰۱۴، ۱۰۷۱، ۱۰۸۱، ۱۱۲۱، ۱۲۰۵ نیز ۱۲۶۳۔

عبدالرؤف خاں ایم اے
خیلدار محلہ اودئی کلاں (راجستھان) ۳۲۲۲۰۱

لغات ابجد شماری ایک مطالعہ

فن تاریخ گوئی پر اردو فارسی زبان میں کم از کم سو کتابیں ملتی ہیں ان میں چند ہم عدد الفاظ کی لغات بھی ہیں۔ اس سلسلہ کی ایک کتاب "لغات ابجد شماری" ڈاکٹر سید احمد صاحب کی ذہنی کاوش کا نتیجہ ہے۔ موصوف اس وقت مکماسٹر یونیورسٹی کینڈا میں علم معاشیات کے استاذ ہیں راقم الحروف کے پیش نظر اس وقت اس کتاب کی جلد اول کا حصہ اول ہے۔ یہ گرانمایہ تصنیف فن تاریخ گوئی کے ذخیرہ میں نہایت اہم اور وقیع اضافہ ہے اور اس فن سے شغف رکھنے والوں کے لئے بہترین عملی سوغات بھی جو بڑی محنت اور دقت نظر سے ضبط تحریر میں لائی گئی ہے۔ جیسا کہ اس کے تاریخی نام سے ظاہر ہے۔ یہ تصنیف ۱۹۹۲ء میں مکمل ہوئی مگر ترقی اردو بیورونئی دہلی سے ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئی۔ شروع میں پیش لفظ شکریے اور مقدمہ (۲۲ صفحات) ہے۔ صفحہ ۲۳ سے ۵۸ تک یعنی ۳۶ صفحات پر اس فن کا تاریخی پس منظر، اختلافی مسائل اور اقسام وصنائع کا مختصر مگر دلچسپ وواضح بیان ہے اور یہ صفحات ہی قابل مطالعہ ہیں اگرچہ بعد میں دیئے گئے ہم عدد الفاظ بھی تاریخ کہنے کے لئے بڑے اہم ہیں۔ اس تصنیف کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ موصوف نے قدیم وجدید اساتذہ فن کی آرا کو پیش نظر رکھتے ہوئے اختلافی مسائل کے بارے میں جو اصول مرتب کئے ہیں۔ ان سے متعدد الفاظ میں انحراف نہیں کیا۔ جبکہ اس فن کی دیگر تصنیفات میں اس بات کا خیال نہیں کیا گیا۔ لیکن جناب سید احمد صاحب نے الف ممدودہ وغیرہ کے سلسلہ میں قدیم اساتذہ فن کے جو مادّے پیش کئے ہیں۔ ان پر از سر نو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً صفحہ ۳۲ پر قائم چاندپوری کی وفات پر جرأت کا کہا ہوا مادہ ہے۔

"قائم بنیاد شعر ہندی نر ہی کیا کہیے اب آہ" ۱۲۰۸ھ

اس میں "آہ" کے الف ممدودہ کے دو عدد شمار کیے ہیں اور دو عدد اخذ کرنے کی مثال ہی میں اسے پیش کیا ہے لیکن یہ تاریخ جرات نے مستزاد میں لکھی ہے جس میں ایک عدد کا تعمیہ مدخلہ کیا گیا ہے:

جب سیل فنا ملک عناصر میں بہی		آکر ناگاہ
قائم کے جو تن کی تھی عمارت سوڈہی		لی زیست نے راہ
جرأت نے کہی رو کے یہ تاریخ وفات		یکتائی کے ساتھ[1]
"قائم بنیاد شعر ہندی نہ رہی		کیا کہیے اب آہ" ۱۲۰۷ = ۱۲۰۸ھ

اگر موصوف "یکتائی کے ساتھ" پر غور فرما لیتے تو یقین ہے کہ "آہ" کے چھ عدد ہی اخذ کرتے نہ کہ سات۔ الف ممدودہ اور مقصورہ کے بارے میں انوار حسین تسلیم سہسوانی کا قول نقل کیا ہے:

"جو لوگ ناواقف ہیں وہ الف ممدودہ اور مقصورہ میں فرق نہیں کرتے"

منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی کی مذکورہ رائے کے بارے میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ:

(تسلیم) "اس کی وضاحت آگے یوں کرتے ہیں کہ الف ممدودہ میں دراصل دو الف "چھپے" ہوئے ہیں! مثال دیتے ہیں۔

زجود شاہ جہاں بادشہہ ملک آرائے (۱۰۰۰ھ)

جو شاہ جہاں کی ولادت کی تاریخ ہے (اور خدا نے اُنہیں کیا بے مثال سال دیا تھا!)

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ "تسلیم صاحب کے مطابق "آرائے" کے الف کو دو دفعہ محسوب کرنے سے یہ تاریخ پوری ہوتی ہے (وہ یہ نہیں بتاتے کہ اسے ہمزہ کے ایک محسوب کرنے کا نتیجہ کیوں نہ قرار دیا جائے؟)"[2]

ڈاکٹر سید احمد صاحب کے مذکورہ بیان کے سلسلہ میں عرض ہے کہ شاہ جاں کی ولادت کے مادے کے تعلق سے دو زبردست اور فاش سہو سرزد ہوئے ہیں۔ اولاً مادہ درست املا کے

---

[1] دلی کا دبستان شاعری ص ۲۶۱، مصنفہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، لکھنو ۱۹۹۲ء

[2] لغات ابجد شماری ص ۳۳ بحوالہ علم تاریخ

ساتھ نقل نہیں فرمایا۔ یہ مادہ اصل میں آغا سنجر طہرانی کے بارہ بیتی اُس قصیدے کا ہے جو اس نے شاہ جہاں کی ولادت کے موقع پر صنعت ترصیع میں کہا ہے۔ جس کے ہر مصرع سے مطلوبہ سن ہجری بر آمد ہوتا ہے۔ یہ مادّہ اس قصیدے کے تیسرے شعر کا پہلا مصرع ہے جو صحیح قرأت کے ساتھ یوں ہے:

زجود شاہ جہاں بادشاہ ملک آرائے ۱۰۰۰ھ

پدید آزدُرِشاہوار صد عماں [1] ۱۰۰۰ھ

اور پورا قصیدہ بحر مجتث مثمن مخبون محذوف میں ہے، جس کے ارکان ہیں مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن جبکہ لغات ابجد شماری کی قرأت سے مصرع وزن سے ساقط ہو جاتا ہے۔

دوسرے منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی صاحب نے بھی منقولہ بالا شعر ہماری درج کردہ قرأت کے ساتھ ہی دیا ہے اور لکھا ہے کہ "الف آز اور آرائے کا ایک ایک عدد لیا ہے۔"[2] چنانچہ ڈاکٹر صاحب کا یہ اعتراض از خود رفع ہو جاتا ہے کہ "ہمزہ کے ایک محسوب کرنے کا نتیجہ کیوں نہ قرار دیا جائے۔" تیسرے جو قول انہوں نے تسلیم سے منسوب کیا ہے یعنی جو لوگ ناواقف ہیں الف مقصورہ والف ممدودہ میں فرق نہیں کرتے۔" یہ فی الواقعہ نواب حسین علی خاں اثر کا ہے جسے تسلیم نے اپنی تائید میں پیش کیا ہے اور مثال میں ولادت شاہ جہاں کا مادّہ نہیں بلکہ ریاض الدین محمد ریاضی کا کہا ہوا درج ذیل قطعہ لکھا ہے:

مرحبا خانِ معلےٰ مرتبت خوش سوے دار الایالت آمدند

مصرعہ گفتہ ریاضی فی البدیہہ "مژدہ بادا خود بدولت آمدند"[3] ۱۲۱۶ھ

تسلیم نے بعض دیگر مثالیں بھی دی ہیں۔ مثلاً ریاض ہی کی صنعت مساوی الاعداد میں داروغہ اولاد علی غیور کی وفات کا یہ قطعہ:

اے ریاضی رفت چو از دہر اولاد علی ہر یکے از دوستانش شد گرفتار الم

---

[1] ملہم تاریخ ص ۳۸ نیز ملاحظہ ہو واقعات دار الحکومت دہلی ۱: ۴۴۴، اور مفتاح التواریخ از طامس بیل ص ۲۳۵

[2] ملہم تاریخ از سید اقتدار ساحر سہسوانی، یہ کتاب تسلیم کی ملخص تسلیم (فارسی) کا اردو ترجمہ ہے۔

[3] دیکھیے ملہم تاریخ ص ۲۷

بہر "داروغہ" بسالش گفت ومہ گفتا "غیور" ۱۲۱۶ھ
گفت در گوشم عطارد "آوخ آوخ" کن رقم[۱] ۱۲۱۶ھ

اس قطعہ میں "داروغہ" اور "غیور" ہم عدد (۱۲۱۶) ہیں اور اسی مناسبت سے "آوخ آوخ" میں ممدودہ کے دو عدد محسوب کرتے ہوئے ۱۲۱۶ حاصل کئے ہیں۔

نواب آصف الدولہ کی وفات (۱۲۱۲ھ) پر مولانا دلدار علی لکھنوی کے درج ذیل مادے:

ہہنا روح وریحان وجنت النعیم (۱۲۱۲ھ)

کو لکھتے ہوئے موصوف رقم طراز ہیں کہ "اس عبارت (مادہ) میں کھڑے زبر کو محسوب کئے بغیر ۱۲۱۰ بنتے ہیں۔ مگر ہم دیکھ چکے ہیں کہ آصف الدولہ کا سنہ وفات ۱۲۱۲ھ ہے۔ لہٰذا صحیح تاریخ حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مندرجہ بالا عبارت میں دونوں کھڑے زبر کے ایک ایک محسوب کئے جائیں۔" (ص ۳۴ و ۳۵)

لیکن صاحب مفتاح التواریخ نے مکمل قطعہ تاریخ لکھتے ہوئے مصرع مادہ کا املا درج ذیل لکھا ہے:

"ہاہنا روح وریحان وجنات النعیم" ۱۲۱۲ھ

ازروئے لغت بھی "ہہنا" کا املا "ہاہنا" لکھنا درست ہے۔[۲] اور ایک تاریخ گو "جنّت" کا املا "جنّات" بھی ازروئے اصولِ فن تاریخ گوئی عدد اخذ کرنے کی مجبوری میں لکھ سکتا ہے۔ جیسا کہ مولانا عبدالعلی آسی مدراسی نے نواب محسن الملک کی وفات (۱۳۲۵ھ) پر ایک طویل تاریخ مرثیہ کے ایک بند میں برائے مطلوبہ سنہ لکھا ہے:

خلد قال ارخہ رضواں "سابعا کان داخل الجنات[۳]" ۱۳۲۵ھ

اس صورت میں کھڑے زبر کے ایک ایک عدد شمار کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔

سید علی نقی ماژندرانی نے بخشوع میاں کا سال وفات بھیترین عدد کے تدخلے سے اسی

۱۔ دیکھئے ملہم تاریخ ص ۳۷

۲۔ ملاحظہ ہو مصباح اللغات ص ۹۷۲ کالم الغات ہیرا صفحہ ۹۵۱ جس میں وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے "اس کا املا ہاہنا بھی ہے۔"

۳۔ ملاحظہ ہو ماہنامہ معارف اعظم گڑھ بابت مارچ ۱۹۸۳ء ص ۲۲۶۔

مصرع کے ذریعے بر آمد کیا ہے:

آمدہ ایں مصرعِ دلکش کہ با "احمد" بگو ۳۵

"ماہنا روح وریحان وجنات نعیم[۱] ۱۲۱۲ = ۱۲۶۵ھ

دراصل یہ تاریخ اورنگ زیب عالمگیر علیہ والرحمہ کی وفات کے بشارت آمیز مادہ:

"روح وریحان وجنت النعیم" ۱۱۱۸ھ (القرآن) سے ماخوذ ہے۔

ص ۵۶ پر شہنشاہ ہمایوں کی وفات کا مادہ: "ہمایوں بادشاہ از بام افتاد" ۹۶۲ھ

کے سامنے بھی یک عدد لکھنا چاہئے تھا کیونکہ یہ حادثہ ۹۶۳ھ میں واقع ہوا تھا۔ میر عبدالحئی نے درست سنہ ذیل کے مادہ سے بر آمد کیا تھا:

"ہمایوں بادشہ از بام او فتاد" ۹۶۳ھ

اسی صفحہ پر جہاں گیر کی وفات کا مادہ بھی ایک عدد کی کمی سے ہے:

خرد گفتا۔ "جہاں گیر از جہاں رفت" ۱۰۳۶ھ

جبکہ یہ سانحہ ۱۰۳۷ھ کا ہے "...... ہنگام چاشت روز یکشنبہ بیست و ہشتم شہر صفر سنہ ہزار و سی و ہفت ہجری......" [۲] کسی عصری شاعر نے:

"جہاں گیر از جہاں عزم سفر کرد" [۳]

سے درست سنہ وفات ۱۰۳۷ھ ہی حاصل کیا ہے۔

ص ۴۹ پر صنعت ضرب میں ایک مادہ:

سال فصلی یوں بھی نکلے اے اکمل

"تین چکر لگائے روزگار" [۴] ۱۳۰۲ فصلی

۹۵۹ x ۳

ساقط الوزن ہے۔ چنانچہ یہ مادہ "تین چکر گر لگائے روزگار" ہونا چاہئے۔ یہ مادہ دراصل اسی صنعت میں ص ۵۷ پر آنجہانی اندرا گاندھی کی ولادت کا مادہ بھی درست نہیں:

---

[۱] دیکھئے حقیقت السورت ص ۷۹ مطبوعہ ۱۳۱۷ھ [۲] مآثر جہانگیری ص ۳۸۳ نیز اقبال نامہ جہانگیری ص ۳۲۰

[۳] واقعات دارالحکومت دہلی اور مفتاح التواریخ۔ [۴] ملاحظہ ہو گلبن تاریخ ص ۲۰ مطبع فخر نظامی، حیدر آباد ۱۳۱۳ھ / ۱۸۹۶ء

"فخرِ دو جہانی" ۱۹۱۸ء

مصنف موصوف شاید مادہ کے لفظ "دو" کو ضرب خیال کر گئے جبکہ یہ جزو مادّہ ہے جس کے حروف کی عددی قیمت کا میزان ۹۵۹ ہوتا ہے۔ یہ مادہ سید مسعود حسن مسعود کے درج ذیل قطعہ سے اخذ کیا ہے:

جو اہر لال کی زندہ نشانی مبارک ہو نوید کامرانی

ہر اک کی اندرا یہ تیرے حق میں دعا ہے پائے عمر جاودانی

پئے سالِ ولادت آپ مسعود

کہیں دو بار "فخرِ دو جہانی"[1] ۱۹۱۸ء

۹۵۹x ۲

یعنی اگر "کہیں دو بار فخرِ دو جہانی" نہیں لکھا جائے گا تو "فخرِ دو جہانی" سے صرف ۹۵۹ برآمد ہوں گے۔ یہ مادہ بزیادت یک عدد ہے جس کی وضاحت ڈاکٹر سید احمد صاحب نے حاشیہ میں کردی ہے۔ ص ۴۴ کی سطر ۶ تا ۸ پر صنعت زبر و بینات کے سلسلہ میں "بینات" کے ذریعہ عدد حاصل کرنے کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "واضح رہے بینات حاصل کرنے میں حروف کے فارسی تلفظ استعمال کرتے ہیں مثلاً "ب" کو "با" کہتے ہیں تب بینہ لیتے ہیں، اسے "بے" نہیں کہتے جو اَب عام اردو تلفظ ہے" (بحوالہ فیروز اللغات)

عرض ہے کہ اول تو فیروز اللغات "زبر و بینہ" کے سلسلہ میں ہماری کوئی رہنمائی نہیں کرتی (دیکھئے دونوں متداول ایڈیشن) دوسرے بہت سے اساتذہ فن نے اردو تلفظ "بے، تے، ثے" وغیرہ کے ذریعہ بہت سی تاریخیں کہی ہیں مثلاً ناسخ کے دیوان کی طباعت کا سالی "دیوان ناسخ" مادہ سے اردو تلفظ کے ذریعہ ہی نکالا ہے:

دال یے واو نون نون الف سین خے[2]

۳۵+۲۰+۱۳+۱۰۶+۱۰۶+۱۱۱+۱۲۰+۶۱۰=۱۲۳۲ھ

---

[1] عندلیب تواریخ ص ۶۲، ادارہ انیس اردو، الہ آباد ۱۹۶۳ء

[2] دیوان ناسخ ۲:۲۱۹

واضح ہو کہ اس میں "یے" اور "ئے" اردو تلفظ ہی ہیں۔ سید محمد علی جویا نے کئی مادے اردو تلفظ سے بر آمد کئے ہیں۔[1] سید لطافت حسین لطافت نے ایک حوض کی تعمیر کا سال بھی اردو تلفظ ہی سے حاصل کیا ہے۔[2] ہاں البتہ اس صنت میں عموماً فارسی تلفظ ہی اختیار کئے جاتے ہیں لیکن قید نہیں۔ ص ۴۸ و ۴۹ پر مادہ میں سے عدد بڑھانے اور گھٹانے کے لئے لکھا ہے کہ ...... عدد جوڑنے کو "تعمیہ" اور کم کرنے کو "تخرجہ" کہتے ہیں۔ فارسی کی تقلید میں اردو والے بھی بیشک ایسا ہی کہتے ہیں۔ مگر تعمیہ اور تعبیہ از روئے لغت عیب چھپانے کو کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ عدد جوڑنا بھی ایک عیب ہے لہٰذا تخرجہ کے بالمقابل "تعمیہ" کو تدخلہ کہنا چاہئے خصوصاً اردو والوں کے لئے کیونکہ "تعمیہ" جوڑنے اور گھٹانے کے دونوں عمل پر محیط ہے۔ یعنی ہنر مندی کے ساتھ دونوں عیوب کو ڈھانپتا ہے۔ عیب بھی کرنے کو ہنر چاہئے۔

بعض معمولی فرو گذاشتیں بھی راہ پا گئی ہیں مثال کے طور پر ص ۲۷ کے حاشیہ ۸ پر منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی کو "انور علی" نیز ص ۲۹ حاشیہ ۹ میں "نور علی" اور "ملہم تاریخ" کا نام ص ۴۳ حاشیہ ۲۱ پر "ملا ہم تاریخ" اور ص ۳۱ حاشیہ نمبر ۱۲ نیز ص ۵۷ سطر ۴ پر "عندلیب تواریخ" کو "عندلیب تاریخ" لکھا ہے۔ صفحہ ۱ سے ۱۶ تک جلد بندی میں دوہرے ہو گئے ہیں۔

مذکورہ معروضات کے علاوہ فن تاریخ گوئی کے لٹریچر میں یہ تصنیف بڑا وقیع اضافہ ہے۔ جس کے سبب متنازعہ فیہ مسائل کی روشنی میں یہ ایک سائنٹفک تصنیف ہے جس کے لئے جناب سید احمد صاحب (کناڈا) ہماری دلی مبارک باد کے مستحق ہیں، خصوصاً اس لئے کہ انہوں نے اس زوال پذیر اور مردہ فن کو عروج اور زندگی بخشنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور وہ بھی غیر اردو ملک میں رہتے ہوئے۔ اس سے اردو کی عالمگیر شہرت کا پتا بھی چلتا ہے۔ ۱۲

---

[1] خیابان تاریخ ص ۵۹

[2] دیکھئے ریاض لطافت ص ۳۶۶

ڈاکٹر وجیہ الدین
شعبہ فارسی، مہاراجہ سیاجی راؤ یونیورسٹی بڑودا، گجرات

جدید فارسی کا ایک اہم شعر

(ملک الشعرا بہار)

انیسویں صدی کے آخر تک ایشیا کے مختلف ممالک میں مغربی سامراج کے خلاف تحریکیں پیدا ہو چکی تھیں ان ہی میں ایران کی انقلابی تحریک بھی تھی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ ملک کو مغرب کی استحصالی کارروائیوں سے محفوظ کیا جائے اور بادشاہ کی مطلق العنانی کو ختم کر کے نمائندہ حکومت کی بنیاد ڈالی جائے۔ ۱۹۰۶ء میں ایک مختصر سی جدوجہد کے بعد ایرانی قوم پرست، بادشاہ وقت مظفر الدین شاہ سے اپنی مانگیں منوانے میں کامیاب ہو گئے اور ایران میں مشروطیت کا قیام عمل میں آیا۔ جدید فارسی شاعری کی ابتداء کم و بیش اسی زمانے سے ہوئی ہے۔ا

بیسویں صدی کے اوائل میں ایران میں سیاسی انقلاب اور مشروطیت کے اعلان (۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء) کے بعد سماجی تنقید اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ اس دور کے شعراء نے اپنے کلام سے سیاسی و سماجی بیداری کے لئے بے انتہا کوششیں کیں فارسی شعراء نے یہ ذمہ داری شعوری طور پر غالباً سب سے پہلی بار اس دور میں سنبھالی تھی اس سیاسی انقلاب کو برپا کرنے کے لئے اور ایران میں ایک قانونی اور دستوری حکومت کے قائم کرنے کے لئے شعرا اور دیگر مصنفین نے تن من دھن کی بازی لگا دی۔ اس عہد میں شعراء نے حتیٰ سیاسی تنقید کو بھی اپنے کلام کا موضوع بنایا سماج کے ہر روبزوال پہلو پر تنقیدی نظر ڈالی۔ زوال آمادہ سماج کے سدھار کے لئے اپنے کلام میں تجاویز پیش کیں اس دور میں ایرانی شعراء کا لب و لہجہ نہایت تند و تلخ نظر آتا ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ایرانی شعراء کی یہ سماجی تنقید رائیگاں نہیں گئی۔ ان کی یہ کوششیں

بڑی حد تک کامیاب ہوئیں اور وہ نسبتاً ایک نیا سماج بنانے میں کامیاب ہوئے۔ اس کے مطالب اور اس میں صدیوں سے رائج قالبوں اور ہیکٹوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا اس میدان میں شعراء کی کوششوں نے ایران میں ایک نئے ادب کا آغاز کیا جسے جدید فارسی ادب کہا جاسکتا ہے۔ اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو اس دور میں شاعروں کی کوششوں سے فارسی شاعری میں ایک خوش آئند انقلاب کے رونما ہونے کے واضح آثار نظر آئیں گے۔ قدیم فارسی شاعری کے مقابلے میں اب نئے نئے خیالات کو پیش کیا گیا۔ اصناف سخن بھی اب جدید اپنائے گئے اگر کلاسیکی فارسی ادب میں عربی ادب کا اثر نمایاں تھا تو اس جدید فارسی ادب میں یورپی رنگ غالب ہے۔ اس انقلابی عہد کے شعراء میں ادیب الممالک فراہانی (۱۲۷۷ ہجری۔ ۱۳۴۵ ہجری) اشرف الدین حسینی معروف بہ نسیم شمال (۱۲۸۸ ہجری ۱۳۴۵ ہجری)، میر زادہ عشقی (۱۲ جمادی الثانی ۱۳۱۲ ہجری۔ ۱۲ تیر ماہ ۱۳۴۲ ہجری) ملک الشعراء بہار (۱۳۰۴ھ۔ ۱۳۷۰ھ) وحید دستگردی (۱۲۹۷۔ ۱۳۶۱ھ) پروین اعتصامی (۱۹۰۷ء۔ ۱۹۴۱ء) وغیرہ۔ ایسے شعراء ہیں جن کے کلام میں شدید سماجی تنقید نظر آتی ہے ادیب الممالک، بہار اور دیگر شعراء کے کلام کو اپنی پختگی کے لحاظ سے قدیم اساتذہ، شعراء کا ہم پلہ قرار دیا جاسکتا ہے۔[۲] ذیل میں ہم ملک الشعراء بہار کے متعلق تفصیل سے بحث کریں گے۔

میرزا محمد تقی ملقب بملک الشعراء متخلص بہ بہار ۱۳ ربیع الاول ۱۸۸۶ء/ ۱۳۰۴ھ قمری کو مشہد میں پیدا ہوئے ان کے والد حاج میرزا محمد کاظم متخلص بہ صبوری کو ملک الشعراء کا خطاب ملا ہوا تھا ان کے انتقال (۴۔۱۹۰۵ / ۱۳۲۲ھ) کے بعد یہ خطاب مظفر الدین شاہ کے حکم سے بہار کو عطا ہوا۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ اس کے بعد ادیب نیشاپوری اور دیگر اساتذہ سے مستفیض ہوئے۔[۳]

۱۹۰۶ء/ ۱۳۲۴ھ میں بہار خراسان کے انقلابیوں اور مشروطہ خواہوں کی صف میں شامل ہو گئے چودہ سال کی عمر سے اشعار کہنے شروع کئے اور بیس سال کی عمر میں ان کا ایران کے بڑے شعراء میں شمار ہونے لگا۔ اسی وقت سے ان کی سیاسی زندگی کا بھی آغاز ہوا۔[۴] بہار نے اپنے

دوستوں کے ساتھ مل کر روزنامہ "خراسان" کا اجراء کیا اس روزنامہ میں ان کی ابتدائی دور کی قومی نظمیں شائع ہوئیں۔ یہ روزنامہ ۱۸؍مارچ ۱۹۰۹ء کو مشہد سے شائع ہوا اور ۱۲؍اگست ۱۹۰۹ء تک جاری رہا۔ اس کے مدیر سید حسن اردبیلی تھے۔ ۵ پھر ۱۹۱۰ء میں مشہد سے روزنامہ 'نوبہار' شائع کرنا شروع کیا۔ یہ روزنامہ بھی زیادہ مدت تک شائع نہ ہو سکا۔ ۶

۱۹۱۷ء میں بہار نے 'دانشکدہ' کے نام سے ایک ادبی انجمن کی بنیاد ڈالی ۱۹۱۸ء میں اس انجمن نے اپنے نام پر ایک مجلّہ نکالنا شروع کیا بہار نے اس کی مدیریت کے فرائض انجام دیئے اس مجلّہ میں جدید فارسی کے ممتاز ادیبوں اور شعراء کا کلام اور تحریریں شائع کی جاتی تھیں۔ ۷

ایران سے شائع ہونے والے ادبی رسالوں میں پہلا ادبی رسالہ 'بہار' تھا جسے میرزا یوسف خان اعتصام الملک نے تہران سے شائع کیا۔ اس کا پہلا شمارہ ۱۲؍اپریل ۱۹۱۰ء کو شائع ہوا تھا۔ اور 'دانشکدہ' دوسرا ادبی رسالہ تھا جو ایران سے شائع ہوا۔ ۸

۲۰۔۱۹۱۹ء/۱۳۳۸ ہجری میں بہار 'ایران' اخبار کے مدیر مقرر ہوئے اور تقریباً دو سال تک اس عہدہ پر فائض رہے۔ یہ نیم سرکاری اخبار تھا۔ بہار رضا شاہ پہلوی کے زمانہ اقتدار میں اپنے سیاسی خیالات کی بنا پر دوبار قید میں رہے۔ ۹

بہار علمی ادبی کارناموں کے ساتھ ساتھ سیاست میں بھی سرگرم حصہ لیتے تھے۔ کئی بار مجلس کے لئے منتخب ہوئے اور چند ماہ وزیر تعلیم بھی رہے۔ ۱۹۵۱ء میں ان کا تہران میں تپ دق کے عارضہ میں انتقال ہوا۔ ۱۰

بہار کی شاعری پر سیاسی اور سماجی رنگ غالب ہے ان کا لہجہ تلخ اور شدید ہے اس رجحان کی عکاسی ان کے قصیدوں "جغد جنگ" اور "دماوندیہ" سے ہوتی ہے۔ ان کا یہ کلام شاہکار کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر "جغد جنگ" میں جنگ کی تباہ کاریوں کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور سرمایہ داری اور سامراجی طاقتوں کی مذمت کی گئی ہے۔ ان کا یہ کلام امن دوستی کے جذبہ کو پیش کرتا ہے۔ جنگ کی تباہی کا ذکر اس انداز سے کرتے ہیں۔

جہان شود چو آسیا و دمبدم   بخون تازہ گردد آسیای او

رونده تانک، ہمچو کوه آتشین   ہزار گوش کر کند صدای او
ہمی خزد چو اژدھا و در چکد   بہر دلی شرنگ جانگزای او
چو پر بگسترد عقاب آہنین   شکار اوست شہر و روستای او
ہزار بیضہ ہر دمی فرو ہلد   اجل دوان چو جوبہ از قفای او

بہار نے امن و صلح کی تلقین ان اشعار کے ذریعہ کی ہے۔

کجاست روزگار صلح و ایمنی   شگفتہ مرز و باغ دلگشای او
کجاست عہد راستی و مردمی   فروغ عشق و تابش ضیای او
کجاست دور یاری و برابری   حیاتِ جاودانی و صفای او
فنای جنگ خواہم از خدا کہ شد   بقای خلق بستہ در فنای او
زہی کبوتر سپید آشتی   کہ دل برد سرود جانفزای او

رسید وقت آنکہ جغد جنگ را
جدا کنند سر بہ پیش پای او[۲]

جدید فارسی شاعری میں پائی جانے والی مایوسی اور افسردگی بہار کی شاعری میں بھی نمایاں ہے۔ مثال کے طور پر بہار کی نظم "افکار پریشان" کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ [۱۳]

بہار کی شاعری روایتی اسالیب کی پابند بھی نظر آتی ہے۔ ان کے دیوان میں متعدد قصائد کلاسیکی شعرا کے قصائد کے جواب میں لکھے گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ رودکی، فرخی مسعود سعد سلمان، منوچہری اور انوری وغیرہ سے متاثر تھے۔ [۱۴] لیکن کہیں کہیں یورپین شاعری کی تقلید بھی نظر آتی ہے ان کے اس قسم کے کلام میں "مرغ شباہنگ" کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ جو انہوں نے اپنی نظر بندی کے زمانے میں لکھا تھا۔

بہار کا شمار جدید شعراء کی فہرست میں کیا جاتا ہے۔

بہار کو زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی اکثر ایسے کلمات استعمال کرتے تھے جو قدیم ہونے کے باوجود معنویت کے حامل تھے۔ "گنج سخن" کا مصنف ذبیح اللہ صفا بہار کے متعلق رقم طراز

ہے "اہمیت وی در شعر بیشتر در آنست کہ: اولاً زبان فصیح پیشینیان را بہترین و دل انگیز ترین صورتی در سخن خود بکار بردوازین حیث سر آمد ہمہ گویند گان دورۂ بازگشت شد؛ وثانیاً از زبان متداول پارسی و مفردات و تعبیرات و اصطلاحات آن برای تکمیل زبان ادبی قدیم وبکار انداختن آن دررفع حوایج روز استفادہ کرد و آنہار انحوی بسیار مطلوب در سخن خود گنجانید؛ وثالثاً از حدود فشردہ وتنگ موضوعات قدیم در شعر بیرون آمد و آن را وسیلۂ سود مندی برائی بیان مقاصد گوناگون و موضوعات مبتکر جدید قرار داد و اندیشہ ھای مختلف فلسفی واجتماعی وسیاسی خود را آزادانہ در آن گنجانید؛ ورابعاً با اطلاع وافری کہ از زبان پارسی و با معرفتی کہ با دبیات پیش از اسلام داشت بخلق ترکیبات جدید ویا وارد کردن بسیاری از لغات متروک لہجہ ھای کہن واحیاء آنہا در آثار خود توفیق یافت وازین راہھا بغنی کردن زبان پارسی یاری فراوان کرد۔" ۱۶

بہارؔ نے شاعری کی تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ مثلاً قصیدہ، غزل، رباعی، قطعہ، مسمط وغیرہ لیکن قصیدہ گوئی میں زیادہ کامیاب رہے۔

بہارؔ بلند اندیشہ اور زبان وبیان پر قدرت رکھنے والے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عمدہ نثر نگار محقق اور اچھے صحافی بھی تھے ان کے ادبی کارناموں کی تفصیل ذیل میں درج ہے۔ (۱) بہارؔ کا دیوان دو جلدوں میں تہران سے چھپا ہے جلد اول ۱۳۳۵ خورشیدی میں چھپی جس میں قصائد، مسمطات، ترکیب بند اور ترجیع بند وغیرہ شامل ہیں دوسری جلد ۱۳۳۶ خورشیدی میں چھپی ہے اس میں مثنویات، غزلیات، قطعات، رباعیات، دوبیتہا، ملحقات، مطایبات اشعار بلہجہ ہای مشہدی اور تصنیفہا وغیرہ شامل ہیں۔ (۲) سبک شناسی یا تاریخ تطور نثر فارسی (تین جلدیں) (۳) تصحیح وتحشیہ تاریخ سیستان (۴) تصحیح وتحشیہ مجمل التواریخ والقصص (۵) تصحیح ترجمۂ تاریخ طبری (تاریخ بلعمی) (۶) شعر در ایران (۷) تاریخ احزاب سیاسی اور متعدد سیاسی، ادبی وتحقیقی مقالات جو روزناموں اور مجلوں میں کبھی بہارؔ کے نام سے اور کبھی بے نام منتشر ہوئے ان کی جمع آوری کے لئے کئی جلدیں درکار ہوں گی۔ ۱۷

مختصر یہ کہ بہار جدید فارسی شاعری کے ایک اہم ستون تھے اور اس کے صف اوّل کے علمبرداروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

منابع

۱۔ منیب الرحمٰن، جدید فارسی شاعری، ادارۂ علوم اسلامیہ، علی گڑھ، اشاعت اوّل، ۱۹۵۹ء صفحہ ۵

۲۔ ذاکرہ شریف قاسمی، فارسی شاعری ایک مطالعہ، دہلی، طبع اول، ۱۹۸۷ء صفحہ ۱۳۸ تا ۱۳۹

۳۔ محمد اسحاق، سخنوران ایران در عصر حاضر، جلد اوّل، چاپ اول، دہلی، ۱۳۵۱ ہجری، صفحہ ۳۵۸۔ و۔ اسماعیل حاکمی، ادبیات معاصر، دانشگاہ پیام نور، ایران، چاپ اول، ۱۳۷۲، صفحہ ۲۹

۴۔ ذبیح اللہ صفا، گنج سخن، جلد سوم، چاپ دوم، تہران، ۱۳۴۰، صفحہ ۳۲۸

۵۔ منیب الرحمٰن، ایضاً، صفحہ ۱۲

۶۔ ایضاً، صفحہ ۱۲ تا ۱۳

۷۔ ذبیح اللہ صفا، ایضاً، صفحہ ۳۲۸۔ و۔ منیب الرحمٰن، جدید فارسی شاعری، صفحہ ۱۳

۸۔ منیب الرحمٰن، جدید فارسی شاعری، صفحہ ۱۳

۹۔ ایضاً

۱۰۔ منیب الرحمٰن، ایضاً، صفحہ ۱۴۔ و۔ ذبیح اللہ صفا، گنج سخن، جلد سوم، صفحہ ۳۲۸

۱۱۔ دیوان اشعار محمد تقی بہار (ملک الشعرا) جلد اول، تہران، ۱۳۳۵ خورشیدی، صفحہ ۱۴۷

۱۲۔ ایضاً، صفحہ ۳۴۷

۱۳۔ منیب الرحمٰن، ایضاً، صفحہ ۸۹

۱۴۔ منیب الرحمٰن، ایضاً صفحہ ۱۹ تا ۲۰۔ و۔ دیوان اشعار ملک الشعرا بہار، مقدمہ، جلد اول، ص دق،

۱۵۔ دیوان اشعار محمد تقی بہار، جلد اول، صفحہ ۵۲۶

۱۶۔ ذبیح اللہ صفا، گنج سخن، جلد سوم، صفحہ ۳۲۷

۱۷۔ ذبیح اللہ صفا، گنج سخن، جلد سوم صفحہ ۳۲۹۔ و۔ اسماعیل حاکمی، ادبیات معاصر، صفحہ ۳۰

بُرہان

جلد: ۱۲۵ | نومبر / دسمبر ۱۹۹۹ء | شمارہ: ۵، ۶

اس شمارے میں

جملہ خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ:

منیجر ماهنامه برهان

4136-اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔110006 فون نمبر:3262815

زرِ تعاون

فی پرچہ ۶ روپے

سالانہ ۷۲ روپے

رحمن کمپیوٹرس دہلی

Ph.:6952082

عمید الرحمن عثمانی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان، اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

بیسویں صدی میں انسان نے وہ حیرت انگیز ترقیاں کی ہیں کہ عقل حیران ہے۔ آج انسان اپنے گھر بیٹھے ہی تمام دنیا کا نظارہ منٹوں سکنڈوں میں کر سکتا ہے ٹیلی ویژن کے ذریعہ دہلی میں بیٹھے ہوئے شخص کو امریکہ، جاپان، جرمن، فرانس، یا کسی بھی من چاہے ملک کی سیر کرتے ہوئے مکمل جانکاری حاصل ہو جائے گی۔ کمپیوٹر کی ایجاد نے انسان کی زندگی ہی بدل دی ہے جو کام انسان مہینوں میں کرتا تھا وہ کمپیوٹر سے گھنٹوں میں ہو جانا ممکن ہو گیا ہے۔ خلاء میں انسان پہنچ ہی چکا ہے چاند سورج تک پہنچنے کے بعد انسانی دماغ اور کیا کیا چیزیں ایجاد کرے گا یہ کہنا ایک عام انسان کے لئے مشکل بات ہے لیکن ایک بات تو صاف ہے کہ انسان نے جو کچھ بھی اپنے بل بوتے پر حاصل کیا ہے اس میں ہمیں خیر کا کوئی بھی تو پہلو نظر نہیں آتا ہے۔ اس بات کے کہنے کے لئے ہمیں معاف کیا جائے۔ ہمیں معلوم ہے کہ بہت سے جدید تہذیب و تمدن سے لیس انسان ہمیں دقیانوسی کے نام سے پکاریں گے لیکن ہم کیا کریں ہم حقیقت پر جب نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں انسان کی اس قدر ترقی دیکھنے کے بعد بھی چاروں طرف تاریکی ہی نظر آتی ہے۔ انسان نے ریل گاڑی ایجاد کی تو ہزاروں انسان ریلوے کی ذرا سی گڑبڑی کی وجہ سے لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔ انسان نے ہوائی جہاز بناڈالا مگر ہوائی جہاز ایک پرندہ سے اگر ٹکرا جائے تو جہاز بھیانک حادثہ کا شکار ہو کر سینکڑوں ہزاروں انسانوں کی موت کا باعث بن جاتا ہے۔ بجلی کی ایجاد نے وقتی طور پر اندھیرے کو اجالے میں بدل دیا لیکن اب بجلی کی پیداوار میں اس قدر کمی آتی جارہی ہے کہ انسان کی عقل حیران ہے کہ اس کا نعم البدل کس طرح تیار کیا جائے جب ہر چیز الیکٹرک کے تابع ہو گئی تو پھر اتنی الیکٹرک کہاں سے لائی

جائے اب انسان کی بے بسی دیکھنے کے قابل ہے۔ بجلی ہوگی تو ریل بھی چلے گی، کمپیوٹر بھی کام کرے گا، الیکٹرک مشینیں بھی بھی چالو رہیں گی پانی بھی ملے گا غرض کہ انسانی روزی کی روز مرہ کی ضروریات پوری ہوتی رہیں گی لیکن اگر بجلی نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں نہ ریل چلے گا نہ کمپیوٹر کام کرے گا نہ انسان کو پانی ملے گا انسان ایک بے بس انسان ہی نظر آئے گا۔

اڑیسہ میں گذشتہ دنوں اس صدی کا سب سے خطرناک سب سے تباہ کن اور سب سے ہولناک طوفان آیا ہے جس میں ہزاروں نہیں لاکھوں انسان بے گھر ہوگئے تباہ و برباد ہوگئے انسانی جانوں کا جو نقصان ہوا ہے اس کا شمار ہی ممکن نہیں ہے ہر طرف انسانی لاشوں کے انبار ہی لگے دکھائی دے رہے تھے جیسے ملبہ اٹھانے والی گاڑیوں نے بالکل اسی طرح اٹھایا جس طرح ملبہ و کوڑا کرکٹ بٹور بٹور کر اٹھاتے ہیں سیکڑوں بلکہ ہزاروں گاؤں کے نام و نشان مٹ گئے۔ جب طوفان آیا تو انسان کی بے بسی دیکھنے کے قابل تھی اس تیز رفتار کے ساتھ طوفان آیا کہ انسانوں کو بچنے کا موقع ہی نہیں ملا ہوا اس قدر شدید تھی کہ درخت اکھڑ کر کئی کئی میل دور جا کر گرے انسان ہوا میں اڑ رہے تھے اور پانی میں بہہ رہے تھے اس طرح جیسے پانی میں مری ہوئی مچھلیاں بہتی ہیں۔ جہاں خوب چہل پہل ہو رہی تھی۔ بچے عورتیں جوان بوڑھے خوب ہنس کھیل رہے تھے وہاں چشم زدن میں سب کچھ ملیامیٹ ہو گیا تباہی و بربادی کا ایسا منظر شاید ہی اس سے پہلے کہیں دیکھنے میں آیا ہو۔ تیز ہواؤں نے پیٹر پودوں کو اکھاڑ کر پھینکا ہی انسانوں کو بھی اڑا اڑا کر برباد کر دیا جانوروں کی چاروں طرف لاشیں ہی لاشیں دکھائی دے رہی تھیں چرند پرند کتے بلیاں سور لومڑیاں، بکریاں اور مرغ مرغیاں سب مرے ہوئے پڑے تھے ہر طرف قہر کا عالم تھا خداوند تعالیٰ کا اسے عذاب ہی کہیں گے کہ انسان جب یہ دعویٰ کرنے لگتا ہے کہ اس کے بس میں کائنات آگئی ہے تو اسی وقت قدرت کی طرف سے ایک ہلکی سی جھلک قہر کی صورت میں نمودار ہو کر انسان کو اس کی بے بسی کا احساس کرا دیتی ہے۔ وہ اپنے کو ایسا بے بس پاتا ہے کہ اسے توبہ ہی کرنی پڑتی ہے اپنی بڑائی پر، اس پر بھی اگر

ماڈرن دنیا کے انسان کی آنکھیں نہیں کھلتی ہیں تو پھر ہمیں یہ کہنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ ماڈرن دنیا کا انسان سائنسی ایجادات سے مالا مال ہونے کے باوجود کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتا ہے۔ اس کی یہ ساری ہی ایجادیں اس کی صرف بے بسی ہی کا اظہار ہے۔

اڑیسہ میں ہولناک طوفان کے سلسلے میں ہمیں دوسرے پہلو کی طرف بھی نگاہ دوڑانی پڑے گی۔ ایک سال کے وقفہ میں دومرتبہ اس قدر طوفان اڑیسہ ہی میں کیوں آیا جبکہ تمام ماہرین موسمیات کی تمام معلومات اور اندازے دھرے کے دھرے رہ گئے انہیں اس کا تصور بھی نہیں تھا کہ ایسا زبردست طوفان آئے گا کہ سینکڑوں ہزاروں گاؤں کے نام ونشان تک مٹ جائیں گے۔

اسی اڑیسہ میں ایک سال پہلے ایک عیسائی پادری اور اس کے دو کمسن معصوم بیٹوں کو بغیر کسی جرم کے، ایک گاڑی میں بند کر کے زندہ جلادیا گیا اور یہ پادری وہ تھا جس نے اڑیسہ کے عوام کی بے لوث خدمت کی تھی اپنی پوری زندگی اس نے خدمت انسانی کے لئے وقف کردی تھی اپنے وطن مولود کو چھوڑ کر ہندوستان کے صوبہ اڑیسہ کے غریب ترین علاقہ میں اپنی بیوی کے ساتھ آکر اس نے سکونت اختیار کی اور پھر اڑیسہ کے لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہو گیا بیماروں کی تیمارداری، ضرورت مندوں کی مدد دکھیاروں غریبوں بے کسوں کی ہر طرح دیکھ بھال ہی ان میاں بیوی کا محبوب مشغلہ بن گیا۔ ان لوگوں میں بیٹھ کر جن لوگوں کو ان کے ہم وطنوں نے نفرت وحقارت سے ٹھکرادیا جن کے پاس بیٹھتے اٹھتے ہم وطن اور ہم مذہب کتراتے تھے نفرت کرتے تھے ان کے پاس یہ عیسائی پادری اور اس کی حسین وجمیل بیوی اپنائیت کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے تھے ان کے میلے کچیلے بچوں کو اپنے ہاتھوں سے نہلا دھلا کر کپڑے پہناتے انہیں پڑھاتے لکھاتے کھلاتے تھے اس طرح انہوں نے خدمت انسانی میں اپنے کو گمن کیا کہ جیسے انہیں خدا نے پیدا ہی ان کی خدمت کرنے کے لئے کیا ہے۔
ان کی فرشتہ صفت خصوصیات کی بدولت ہی اڑیسہ میں وہ جہاں بھی جاتے انسانیت کی شمع روشن ہو جاتی ۳۵ سال کا عرصہ کوئی معمولی عرصہ نہیں ہوتا ہے انہوں نے اپنی کم عمری میں

اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر دور دراز ہندوستان میں آکر خدمت انسانی کا جس طرح بیڑہ اٹھایا وہ خود ایک خوشگوار حیرت ناک واقعہ ہے جس پر انہیں ہندوستانی قوم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے سر کا تاج سمجھ کر ان کی قدر و منزلت کرنے میں کوئی دقیقہ فرد گذاشت نہیں کرتی مگر ہمیں افسوس ہے کہ ہندوستان میں ابھی کچھ سالوں سے کچھ سر پھروں کے سروں پر جو مذہبی جنون یا پاگل پن سوار ہوا ہے اس پاگل پن نے عیسائی پادری کے سارے ہی انسانیت کی خدمت پر مبنی کاموں پر پانی پھیر دیا اور ذلیل و خوار کر کے عیسائی پادری اور ان کے دو کمسن بچوں کو زندہ جلا کر مار ڈالا اور اس طرح ان مذہبی جنونیوں نے انسانیت کا خون کر دیا ہندوستان کی انسانیت، شرافت اور نیک نامی پر بدنما داغ لگا دیا۔ اور اس کے بعد ایسا شرمناک کام انجام دینے والوں کو پولس نے جب پکڑنے کے لئے اپنا جال بچھایا تو کچھ لوگوں نے اس کی مخالفت کی اور مجرموں کو بچانے کے لئے پولس کی راہ میں روڑہ اٹکایا اس سے زیادہ شرمناک بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ اڑیسہ میں حالیہ زبردست طوفان کیا قدرت کی طرف سے اسی واقعہ کی سزا تو نہیں ہے۔ یہ خیال عام لوگوں کے دل و دماغ میں گھومنے لگا ہے چنانچہ مذہبی جنونیوں کی ان شرمناک حرکات ہی کی وجہ سے اڑیسہ میں قدرت نے طوفان کے ذریعہ انتقام لیا ہے ایسی بات ہم نہیں بلکہ نئی دہلی سے شائع ہونے والے ایک مشہور و معروف ہندو اخبار ''پرتاپ'' نے اپنے ایک اداریہ میں کہی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ یہ اڑیسہ کے لوگوں پر قہر خداوندی ہے جو عیسائی پادری اور اس کے دو معصوم بچوں کو زندہ جلا کر مار ڈالنے کی پاداش میں ٹوٹا ہے۔ بہرحال جو بھی ہے یہ تباہی و بربادی اس قدر شدید ترین ہے کہ ابھی تک بیسویں صدی میں اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ہے۔ بے شمار انسان تو مرے ہی ہیں لیکن جو انسان اس طوفان کی زد سے بچ گئے ہیں وہ مرنے والے لوگوں سے بدتر بدحال ہیں ان کے لئے نہ پانی ہے نہ روٹی اور نہ ہی زندگی جینے کا کوئی اور دوسرا سامان میسر ہے۔

دنیا بھر کی تنظیمیں اڑیسہ میں مدد کے لئے پیش پیش ہیں غیر ممالک سے اور اندرون ملک سے اڑیسہ میں طوفان زدگان کی مدد کے لئے اشیائے خورونوش بھیجا جا رہا ہے مالی امداد بھی اکٹھی کر کے

بھیجی جارہی ہیں۔ مگر اس کے باوجود متاثرین اور ضرورت مندوں تک سامان یا مالی امداد پہنچنے میں قدرتی رکاوٹوں کے ساتھ ساتھ اڑیسہ حکومت کی بھی نااہلی کی خبریں اخبارات میں شائع ہورہی ہیں جسے پڑھ کر اڑیسہ کی نکمی حکومت کی نااہلیت پر دکھ افسوس ہے جب انسانوں کے گناہ اس قدر بڑھ جاتے ہیں کہ بنی نوع انسانیت شرمسار ہوجاتی ہے تو قدرت کا قہر طوفانوں زلزلوں خشک سالی وغیرہ وغیرہ کی صورت میں نازل ہوتا ہی ہے اور دوسری صورت قہر خداوندی کی یہ بھی ہے کہ نااہل نکمے خود غرض اور عقل ودانش سے محروم ایسے حکمرانوں کو عوام پر مسلط کردیتا ہے جو ان کے لئے کسی طرح مفید ہونے کے بجائے ان کے لئے زحمت پریشانی دکھ غم مصیبت میں اضافہ کرنے کے باعث ہوں گے۔

اڑیسہ کی حکومت یہ پروپیگنڈہ کرنے میں مصروف ہے کہ اس نے طوفان سے مصیبت زدگان کی پوری پوری مدد کی ہے مگر الیکٹرک میڈیا کے دور میں جھوٹ بولنا بڑا مشکل ہے اور جو جھوٹ بولتا ہے اس کی قلعی فوراً ہی کھل جاتی ہے۔ اڑیسہ میں طوفان زدگان کے لئے مرکزی حکومت نے اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے فوری طور پر کروڑوں روپیوں کی مدد کا اعلان کیا اشیائے خوردونوش کا وافر سامان سپلائی کیا دنیا بھر سے سامان بھی دوائیں بھی اور پیسہ بھی سب بھیجا گیا اندرون ملک سے کھانے کے پیکٹ تیار کر کے بھیجے گئے مگر افسوس ہے کہ مقامی حکومت کی نااہلی سے مصیبت زدگان ضرورت منداب بھی ہاتھ پھیلائے ہوئے ہیں اور وہ آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر قدرت سے اور مانگ رہے ہیں۔

بد کا انجام برا ہی ہوتا ہے۔ ۶/ر دسمبر ۱۹۹۲ء کو تمام دنیا کے الیکٹرک میڈیا کے سامنے بابری مسجد کو جس طرح مسمار کیا گیا وہ بھی بیسویں صدی کا سب سے بڑا بدترین واقعہ ہے اور اس وقت کی مقامی حکومت کے وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ اور مرکزی حکومت کے وزیر اعظم نرسمہاراؤ کی موجودگی میں دنیا کی تاریخ کا یہ بدترین واقعہ رونما ہوا ان دونوں نے اپنی ذمہ داری کو محسوس نہ کرتے ہوئے جس طرح کی تساہلی، نااہلی اور لاپرواہی دکھائی اسے کوئی بھی آسانی سے فراموش نہیں کرے گا۔ کتابوں میں پڑھا ہے اور مذہبی مجلسوں میں بھی بارہا یہ سنا ہے کہ بد کا انجام بھی برا ہی ہوتا ہے۔ جو برا کرتا ہے خدا اس کیساتھ بھی اکثر ایسا ہی سلوک کر کے

دنیا میں اسے ذلیل وخوار کردیتا ہے ہماری آنکھوں نے نرسمہاراؤ کا حشر تو دیکھا ہی تھا کہ کس طرح اسے ذلت وخواری سے دوچار ہونا پڑا۔ اقتدار کی کرسی سے نیچے اترنا پڑا کانگریس پارٹی نے اپنی عبرتناک شکست کا ذمہ دار نرسمہاراؤ ہی کو گردانا۔ اب کلیان سنگھ کا عبرتناک حشر سب لوگوں کے سامنے ہے اسے قدرت نے خود اسی کی جماعت بھارتیہ جنتا پارٹی میں بے آبرو کیا یوپی میں بی جے پی کو حالیہ پارلیمنٹری انتخابات میں جو گذشتہ انتخابات کے مقابلے کم نشستیں ملی ہیں اس کا ذمہ دار بھی کلیان سنگھ ہی کو ٹھہرایا جارہا ہے۔ آج بھارتیہ جنتا پارٹی کے تمام لیڈر یک زبان ہوکر کلیان سنگھ کے بیانات کی مذمت کررہے ہیں اور کلیان سنگھ پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں کے مصداق ہوا میں تیر چلانے کی کوشش میں مشغول ہیں۔ مسجد توڑنے والوں کو قدرت نے دنیا میں خوار کردیا ہے پی وی نرسمہاراؤ ہندوستان کے وزیراعظم تھے دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا سب سے طاقتور وزیراعظم بابری مسجد کے انہدام کے بعد ملک کے عام انتخابات میں کانگریس کو شکست سے نہ بچا سکا جس کی وجہ سے کانگریس کو اقتدار سے محروم ہونا پڑا۔ اور اس کے بعد دو انتخابات میں کانگریس اپنی کرتوتوں کی وجہ سے مسلسل شکست سے دوچار ہوئی ہے۔
بالکل اسی طرح ۶؍ دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد کی مسماری کے بعد یوپی میں کلیان سنگھ کی قیادت میں اسمبلی کے دوبار انتخاب بھارتیہ جنتا پارٹی مکمل اکثریت حاصل کرنے میں ناکام ہی رہی۔ ایک بار بھارتیہ جنتا پارٹی کے کٹر مخالف اور بابری مسجد پر یلغار کرنے والوں پر پولس کی گولی چلانے کو جائز قرار دینے والے ملائم سنگھ کی حکومت قائم ہوئی اور دوسرے انتخاب میں بابری مسجد توڑنے والوں کی مخالفت کرنے والی مایاوتی کی حکومت قائم ہوئی ان کے بعد اگر کلیان سنگھ نے اپنی سرکار بنائی تو ان ہی لوگوں کے ساتھ جوڑ توڑ کر کے جو بابری مسجد کے انہدام کے مخالف تھے اور پھر اس کے بعد ان ہی کی بھارتیہ جنتا پارٹی نے انہیں پائے حقارت سے درکنار کردیا۔ اس پر کلیان سنگھ آپے سے باہر ہیں غصہ سے بے قابو ہیں مگر وہ بھول گئے کہ خدا کے گھر کو ڈھانے کی سازش میں ملوث لوگوں کا حشر ایسا ہی ہوتا ہے عدالت نے انہیں سزا بھی دی تھی اور دو ہزار روپے جرمانہ بھی ان پر عائد کیا تھا اور اب قدرت نے ان ہی کی محبوب رہی پارٹی بھارتیہ جنتا پارٹی کے ذریعہ ذلت آمیز دستبرداری پر مجبور کردیا ہے۔ اسے کہتے ہیں قدرت کا انتقام!

تعزیت نامے

"میرا چھوٹا پیارا بھائی نجیب الرحمٰن عثمانی مرحوم کے انتقال پر ملال سے خاندان مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کو جو صدمہ پہنچا ہے وہ ناقابل تلافی ہے اللہ تعالیٰ مرحوم نجیب الرحمٰن عثمانی کی بال بال مغفرت فرمائے اور کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ہم سب کو صبر جمیل کی توفیق بخشے مگر اس حادثہ وفات پر جن حضرات نے تعزیتی خطوط کے ذریعہ اظہار تعزیت فرمایا ہے ہم سب ان کے شکر گزار ہیں۔

ان میں سے بعض تعزیت نامے اس قابل ہیں کہ اسے "برہان" میں شائع کر رہے ہیں۔ ہمیں یقیناً ان تعزیت ناموں سے بڑا قلبی سکون حاصل ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر دے۔"

عمید الرحمٰن عثمانی

برادر محترم و مکرم عمید الرحمٰن صاحب زیدت عنایتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ سفر سے واپسی پر محترم بھائی نجیب الرحمٰن صاحب مرحوم کے المناک حادثۂ وفات کی اطلاع نے پیکر غم والم بنادیا۔ آپ کے خانوادے سے بزرگوں کے وقت سے جو رابطہ اخلاص و مودت قائم ہے اور اس کو حضرت مفتی صاحب کی بزرگانہ تعلق شناسی نے مزید قربت و محبت میں تبدیل کردیا تھا۔ اس لئے یہ حادثہ فاجعہ نہ صرف احقر کے لئے بلکہ میرے پورے گھرانے کے لئے شدید غم والم کا باعث ثابت ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حق تعالیٰ برادر مرحوم کو جوار رحمت و مغفرت قبول فرمائے اور جملہ اعزائے مرحوم کو توفیق صبر ارزانی فرمائے۔ برادر مرحوم کے لئے وقف دار العلوم میں ایصال ثواب کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

شریک غم

محمد سالم، مہتمم وقف دار العلوم دیوبند

مکرمی جناب عمید الرحمٰن صاحب السلام علیکم

مزاج گرامی؟ بھائی نجیب کے انتقال کی افسوسناک خبر کافی تاخیر سے ملی۔ سخت صدمہ پہنچا۔ اللہ کی مرضی انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر کی توفیق دے۔ آپ کے لئے سخت حادثہ ہے۔ میری تمام دلی ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔ بھائی نجیب مرحوم کے لئے برابر دعائے مغفرت کر رہا ہوں۔ والسلام

ولی الرحمٰن نوری

بروفات نجیب الرحمٰن عثمانی

ابن مفکر ملت حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ

گلستان عتیق کی خوشبو	کچھ سمٹتی ہوئی سی لگتی ہے
غم کی زنجیر پائے ہستی میں	یا لپٹتی ہوئی سی لگتی ہے

قلب افسردہ اور فضا خاموش	بزم جاں پر سکوت کا عالم
ہر طرف اک محیط سناٹا	شام غم کے ثبوت کا عالم

مختصر زندگی کے لمحوں میں	خیر کی راہ کا نجیب رہا
اپنے والد کا لاڈلا بیٹا	پارسائی میں بھی حبیب رہا

ایک بے داغ شخصیت کی کمی	دیر تک کتنوں کو رلائے گی
جب بھی اٹھے گا ذکر نیکوں کا	بے ارادہ بھی یاد آئے گی

عارضی زندگی کی ہر کلفت	اخروی راحتوں کا نور بنے
یہ دعا ہے کہ رحمت باری	ہر نفس ساعتوں کا نور بنے

سوگوار

کفیل الرحمٰن نشاطؔ

مخلص بھائی جناب عمید الرحمٰن صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ آپ کے پیارے بھائی عزیز مکرم جناب نجیب الرحمٰن صاحب کے انتقال سانحہ عظیم کی خبر سن کر رنج وصدمہ ہوا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون ہ

افسوس کہ مجھے یہ خبر مرحوم کے انتقال کے بعد ایسے بے وقت پہنچی جس کی وجہ سے میں تعزیت کے سلسلے میں فوراً حاضری نہ دے سکا۔ اس وقت بھی میں ضعف ونقاہت کی بنا پر بجائے خود حاضری کے مدرسہ کے مدرسین کو تعزیت کے سلسلے میں خدمت میں بھیج رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ میری معذوری کی بنا پر عدم حاضری کو اور مدرسین کو تعزیت کے سلسلے میں قبول فرماویں۔

میں نے چند قرآن شریف پڑھوا کر مرحوم کی روح کو ایصال ثواب کرادیا ہے۔ اور سلسلہ جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اس پڑھنے کو اپنی بارگاہ میں بہت قبول فرماکر مرحوم کی روح کو ہم سب کی طرف سے مسرور وشاداں فرماکر مرحوم کی اس جدائیگی کو آپ کے لئے اور ہم سب کے لئے صبر وشکر کے ساتھ عمل کرنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین

مخدومنا حضرت مفتی صاحب دنیا سے رخصت ہوگئے۔ لیکن ان کا فیض رخصت نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کے ہر چشمہ فیض کو قائم رکھ کر ان کی اولاد وخاندان اور پسماندگان کو مرحوم کی جدائیگی پر پورے پورے صبر وشکر کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ عزیزہ بہن محترمہ اور دیگر اہل خانہ اور تمام بھائیوں کو میری طرف سے صبر وشکر کی تلقین پیش کردیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہم سب کو صبر وشکر کے ساتھ رہنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین، مخدومنا حضرت مفتی صاحب کے لئے الحمدللہ ہر روز ہی ایصال ثواب اور ان کے درجات کی بلندی کے لئے روزمرہ دعا ہوتی رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی روح کو ہم سب کی طرف سے مسرور وشاداں فرماکر ان کے درجات ومراتب بلند فرمائے۔ اور والدہ محترمہ مرحومہ کی بھی بدرجہ اکمل کامل مغفرت فرماکر جنت کے اعلیٰ مقام میں ان کی روح کو ہم سب کی طرف سے مسرور وشاماں فرمائے۔ نیز مدرسہ کے تمام طلباء ومدرسین کی طرف سے سلام مسنون کے بعد مرحوم کے لئے تعزیت قبول فرماویں۔ بس میری معذوری کی بنا پر میری حاضری کے بجائے عریضہ تعزیت قبول فرماویں۔ بس اور کیا عرض کروں۔ دل سے دعا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ تمام بھائیوں اور پورے خاندان کو ہر طرح اپنی امن وسلامتی میں رکھے۔ آمین والسلام

محمد سلیمان خادم مدرسہ تجوید القرآن، دہلی

☆

مکرم ومحترم برادران حاجی نجیب الرحمٰن صاحب مرحوم ومغفور واہلیہ محترمہ صاحبہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد دعائے عافیت واطمینان کے گزارش ہے کہ عزیزم حاجی نجیب الرحمٰن صاحب مرحوم ومغفور کے انتقال کی خبر سے افسوس اور صدمہ ہوا دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرماکر جنت

الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرماویں اور ان کے اہل وعیال اور برادران ہمشیرگان نیز جملہ متعلقین کو صبر جمیل مرحمت فرماویں اور مدد فرماویں آمین۔ ثم آمین۔ میری طرف سے اور سب متعلقین اور عزیزان مدینہ منورہ کی طرف سے تعزیت قبول فرماویں اور سب حضرات کی خدمت میں بعد سلام مسنون قلبی تعزیت فرماویں عنایت ہوگی مشکور ہوں۔ نیز میاں قاری حاجی محمد ادریس صاحب سلمہ کی خدمت میں بھی سلام مسنون اور تعزیت فرماویں مہربانی ہوگی۔ دوسرا عریضہ میاں قاری محمد ادریس صاحب سلمہ کو پہنچا کر مشکور فرماویں۔ ممکن ہو تو خیریت سے مطمئن فرمائیں۔ مرحوم بھائی کے بچوں اور اہلیہ کی خاص طور پر تسلی تشفی فرماویں دعا ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو قلبی اور عملی صبر سے سرفراز فرماویں اور ہر طرح مدد فرماویں آمین۔ زیادہ حد ادب۔ والسلام

طالب دعا رشید احمد

برادر عزیز سلام مسنون!

جس روز برادرم نجیب سلمہ مرحوم کے حادثہ وفات کی خبر "قومی آواز" میں آئی اس دن وہ اخبار دیوبند پہنچا نہیں۔ بھائی اظہر دہلی سے دیر میں واپس ہوئے واپسی پر اس سانحہ کی خبر اور تفصیل معلوم ہوئی۔ آپ کے لئے یہ بڑا سانحہ ہے۔ اولاً تو بھائی پھر معلوم ہوا کہ آپ ان سے کافی مانوس اور قریب تھے۔ یونہی عام طور پر ان کے صوم وصلوٰۃ کی پابندی کا ذکر رہتا۔ مفتی صاحب مرحوم کی نشانیوں میں سے ایک نشانی جاتی رہی۔ مرحوم کے لئے ایصال ثواب کرایا گیا۔ میری طرف سے جملہ متعلقین تک مسنون تعزیت ضرور پہنچا دیجئے۔ خدا کرے آپ عافیت سے ہوں۔

انظر شاہ مسعود

از مولانا محمد عثمان صاحب فارقلیط
اڈیٹر اخبار ''زمزم''

قسط ۱

اسلام اور سائنس

جن مسلمان نوجوانوں نے انگریزی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مغربی طرز کی تعلیم حاصل کی ہے ان میں اور ان کی وساطت سے دوسرے ''تعلیم یافتہ'' مسلمانوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ مذہب اور سائنس میں اصولی اور بنیادی اعتبار سے اختلاف اور تضاد ہے اور گذشتہ تین صدی سے ان میں ایک ایسی جنگ برپا ہے جسے ختم کرنے کی تمام کوششیں اب تک بیکار ثابت ہوئی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ موجودہ زمانہ کے علمی اکتشافات، تجربہ اور مشاہدہ کے اس دائرہ میں آگئے ہیں جہاں مذہب کو قدم رکھنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ ایک طرف سائنس کے حقائق ہیں جو معائنہ کی سطح پر آچکے ہیں۔ دوسری طرف مذہب کے نظریات و مفروضات ہیں جو ایمان بالغیب سے آگے نہیں بڑھتے۔ سائنس کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا جا رہا ہے اور مذہب بنیادی اعتبار سے ترقی اور نمو کی صلاحیت کھوتا جا رہا ہے۔ اس نمایاں فرق کا جو نتیجہ برآمد ہوگا وہ یہی ہوگا کہ ایمان بالغیب کو مشاہدہ اور معائنہ پر قربان کر دیا جائے گا اور مذہب کے لئے علمی سوسائٹی میں کوئی جگہ باقی نہ رہے گی۔ انگلستان کے مشہور سائنس داں پروفیسر اے این وائٹ ہیڈ کو بھی بالآخر اس حقیقت کا معترف ہونا پڑا کہ

> ''مذہب اور سائنس کے درمیان جس نوعیت کا تصادم برپا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ گذشتہ نصف صدی میں ان کے درمیان توافق و تطابق کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکی اب تو لامحالہ یہ فیصلہ کرنا ہی پڑے گا یا تو سائنس کے واضح حقائق کو خیرباد کہہ دیا جائے گا یا مذہب ہی کو اس کے لئے جگہ خالی کرنی پڑے گی۔'' [1]

---

[1] صفحہ ۲۱۰ Science & The Modern World

مذہب اور سائنس کے بارے میں جن دماغوں میں ان خیالات کی پرورش ہو رہی ہے وہ چونکہ اتفاق سے اسلامی دماغ ہیں اس لئے اکتشافات جدیدہ تجربہ اور مشاہدہ سے مرعوب ہو کر سمجھایہ جارہا ہے کہ اسلام بھی سائنس کا حریف ہے اور مذہب وسائنس کی جنگ میں وہ بھی برابر کا حصہ دار ہے اور چونکہ مذہب زیادہ عرصہ تک مشاہدات کے میدان میں کھڑا نہ ہو سکے گا اس لئے انجام کار ''اسلام'' کو بھی شکست کھا کر پیچھے ہٹنا پڑے گا اور کچھ عرصہ کے بعد دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔

بنیادی غلطی: بلا شبہ مغربی علماء اور مفکرین نے یہ اعلان کیا ہے کہ مذہب اور سائنس میں تضاد واختلاف ہے اور سائنس رجعت پسندانہ خیالات اور مابعد الطبیعاتی مسائل کو شکست دے چکی ہے یہ بھی صحیح ہے کہ علمی اکتشافات نے یورپ میں مذہب کو زبردست شکست دی ہے اور وہاں اس شکست کی بنا پر دہریت کو نوے فیصدی ووٹ حاصل ہو گئے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی فراموش نہ کرنی چاہئے کہ مغربی حکماء وفضلا کی اصطلاح میں ''مذہب'' سے مراد صرف عیسائی مذہب ہے، اسلام نہیں ہے۔ یہ فخر صرف عیسائیت کو حاصل رہا ہے کہ اس نے گیارہویں صدی عیسوی سے علوم واکتشافات کا مقابلہ کیا تو اٹھارہویں صدی عیسوی تک اس کا پیچھا نہ چھوڑا، اور مقابلہ بھی اس شدت کے ساتھ کیا کہ آج وہی مقابلہ کلیسا کے لئے روسیاہی کا باعث بنا ہوا ہے۔ چرچ وکلیسا، پاپائے روم کا منصب جلیلہ، عیسوی عدالتیں۔ محکمہ احتساب رجال مذہب غرض عیسویت کا وہ کون سا شعبہ تھا جس نے سائنس کا بے جگری کے ساتھ مقابلہ نہیں کیا اور علماء وحکماء کے خون سے ہاتھ نہیں رنگے؟ آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مغربی علوم واکتشافات کی جنگ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں سے ان کی جہالت سے اور ان کے طریق فکر سے ہے مگر یہ علم اور جہالت کی جنگ ہو گی۔ اسلام اور سائنس کی جنگ نہ ہو گی کیونکہ اسلام خود جہالت کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے علم وحکمت کی راہیں کشادہ کر چکا ہے۔ اور ایک سچے مسلمان کی زبان سے اعلان کرا چکا ہے کہ اعوذ باللہ ان اکون من
الجاهلين

اس کے علاوہ ذرا اس بات پر بھی غور کیجئے کہ کیا یورپ کے کسی سائنس داں اور فلسفی نے طبعیات، معاشیات اور سیاسیات کے کسی ماہر نے علم الحیات اور علم الانسان کے کسی فاضل نے یا مطالعہ مذاہب کے کسی محقق اور مصنف نے معرکہ مذہب و سائنس کے سلسلے میں کبھی اسلام کا نام لیا؟ کبھی کسی کی زبان سے سنا کہ اسلام بھی سائنس کا حریف ہے؟ کیا خود اسلام کے نمائندوں نے اس تصادم کی حقیقت کا اقرار کیا؟ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان تاریخ کے ماہر ہیں کیا وہ بتا سکیں گے کہ اسلام بھی محکمہ احتساب (*) کے نام سے واقف ہے۔ کبھی کسی عالم کو علم و تحقیق اور اکتشاف و اختراع کے جرم میں اسلام کے نام پر زندہ جلایا گیا؟ کیا کسی زمانہ میں بھی کوئی ایسی مخصوص عدالت قائم کی گئی جس میں اسلام نے مستغیث کی حیثیت اختیار کر کے کسی عالم اور مخترع کو جانوروں کے سامنے ڈلوایا ہو یا شکنجہ میں جکڑ کر اس کی جان نکالی ہو؟ سائنس داں نہیں کہتے کہ اسلام اور سائنس میں جنگ ہے۔ اسلام کے نمائندوں نے کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ اسلام حقائق علمیہ کا حریف ہے۔ کوئی شخص اب تک ادنیٰ ثبوت بھی نہ دے سکا کہ اسلام کی سرحد میں انکشافات کا گزر نہیں ہو سکتا، اور نہ یہ کوئی بتا سکا کہ اسلام نے سائنس کے مقابلہ پر کہاں اور کب شکست کھائی؟ اس کے باوجود "مذہب" کے نام سے دھوکہ کھا کر یہ خیال جمالینا کہ اسلام، سائنس کا دشمن اور سائنس اسلام کی دشمن ہے۔ ایک ایسا خیال ہے جس کے اظہار کے لئے جنون کی اور باور کرنے کے لئے حماقت کی ضرورت ہے۔

بلاشبہ چرچ اور علم کا تصادم ہوا۔ نظری اعتبار سے بھی اور عملی اعتبار سے بھی اور عیسائیت کی مشنری مسلسل تین صدی تک اس کے مقابلہ پر متحرک رہی اور اس کا نام رکھا گیا "مذہب اور سائنس کا معرکہ" اور "مذہب" سے مراد وہ خوفناک نظام لیا گیا جو کلیسا کے سہارے اور مسیح اور پطرس کے نام پر علم اور سائنس کی راہ میں صدیوں تک حائل رہا۔ ان حالات میں سائنس کے مقابلہ پر اسلام کا نام لینا اور عیسائیت کا عبرتناک حشر دیکھ کر سہم جانا ایک ایسی مضحکہ انگیز حرکت ہے جسے علم کی بارگاہ سے کبھی معافی نہیں مل سکتی۔

سائنس عیسائیت کا ردعمل ہے: قرآن کریم نے عقل و فہم کے استعمال پر زور دیا ہے۔ آباء واجداد کی اندھی پیروی سے منع فرمایا ہے۔ شک و ریب اور ظن

استعمال پر زور دیا ہے۔ آباء واجداد کی اندھی پیروی سے منع فرمایا ہے۔ شک وریب اور ظن وتخمین کی مذمت فرمائی ہے۔ کتاب الٰہی میں جگہ جگہ عقل وفہم، شعور، تدبر، بصیرت، برہان اور یقین کا نام آیا ہے اور ان کا صحیح استعمال نہ کرنے والوں کو جانوروں سے تشبیہ دے کر انہیں اندھا، بہرا اور گونگا قرار دیا ہے۔ مگر آپ کو یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ ساری بائبل میں ایک جگہ بھی عقل یا اس کے ہم معنیٰ کسی دوسرے لفظ کا ذکر نہیں آیا ہے۔ بائبل کی ڈکشنری اور بائبل کی انسائیکلوپیڈیا موجود ہے۔ اس میں عقل اور فہم کے لئے کوئی لفظ آپ کو نہیں ملے گا۔ کلیسا ہمیشہ عقل کی دشمن رہی ہے تاکہ ''ایک میں تین اور تین میں ایک'' کا نامعقول اور ناقابل فہم عقیدہ اس کی زد سے محفوظ رہے۔ ٹرینٹ (Trent) کی مشہور کونسل میں جو ۱۵۵۱ء میں منعقد ہوئی تھی، پوپ کی صدارت میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں مسیحی عقائد ونظریات کی تائید وتوثیق کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا گیا کہ

> ''یہ کونسل ان متکلمین کی سختی کے ساتھ مذمت کرتی ہے جو مشکلات کو حل کرنے کے لئے عقل کا سہارا لیتے اور دلیل وحجت کا استعمال کرتے ہیں۔''[1]

لیکن اس ''عقل دشمنی'' کا نتیجہ کیا نکلا؟ اے این وائٹ ہیڈ لکھتے ہیں:

> ''بلاشبہ یہ ردعمل عہد وسطیٰ کی بے لگام عقلیت (Rationalism) کے لئے ضروری تھا مگر یہ ردعمل خود اپنی حدود سے تجاوز کر گیا تاہم اس سے ایک صحیح نتیجہ بھی نکل آیا یعنی عصری علوم اور سائنس کی پیدائش عمل میں آگئی۔'' [2]

یعنی سائنس اور علوم جدید، عیسائیت کی بے عقلیت کے عین مخالف سمت میں واقع ہیں اور ان کا ظہور عیسائیت کی علم دشمنی کا کھلا ارتجاعی عمل ہے! اس سے ثابت ہوا کہ معرکۂ مذہب اور سائنس کی داستان صرف عیسائیت کے دائرہ تک محدود ہے اور اسلام کو اس مصارعہ ومجادلہ سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ جو مذہب عقل وادراک فہم وبصیرت اور برہان وبیّنہ کی پختہ چٹانوں پر قائم ہو وہ علم واکتشافات کا معاون ہوگا، مخالف نہ ہوگا اور جہاں یہ تعاون وتعاضد ہوگا وہاں تصادم

---

[1] History of The Council of Trent By Father Paul Sarpi

[2] سائنس اینڈ دی ماڈرن ورلڈ صفحہ ۲۱

واختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔

ڈریپر اور اسلام: مذہب اور سائنس کی جنگ پر یورپ کے مشہور محقق ڈریپر نے ''معرکہ مذہب وسائنس'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس کی ایک ایک سطر میں مذہب کے مقابلہ پر سائنس کی حمایت کی گئی ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ سائنس کے مقابلہ پر مذہب ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں ٹھہر سکتا، مگر خود ڈریپر سے دریافت کرو کہ مذہب سے اس کی کیا مراد ہے؟ اگر سائنس کی دشمنی میں اسلام بھی مسیحیت کا ہمنوا ہوتا تو ڈریپر اسلام پر اسی طرح بمباری کرتا جس طرح اس نے عیسویت کے قلعہ پر کی اور یہ بتاتا کہ سائنس کی مخالفت میں کچھ عیسویت ہی کو اختصاص حاصل نہیں ہے بلکہ اسلام بھی اس میں برابر کا شریک ہے۔ مگر اس نے علوم جدیدہ کی حمایت میں کلیسا پر، پاپائیت پر، کتب مقدسہ پر کونسلوں کے فیصلوں پر، محکمۂ احتساب اور عیسوی عدالتوں پر جس شدت کے ساتھ بمباری کی ہے اسی شدت کے ساتھ اس نے اس امر حق کا بھی اعلان کیا ہے کہ مسلمانوں نے ہمیشہ علوم واکتشافات کی سرپرستی کی اور یورپ کو ضلالت سے نکال کر ذروۂ کمال پر پہنچایا، اس نے بتایا ہے کہ جس زمانہ میں سارا یورپ جہل وضلالت، کوری وحمایت میں مبتلا تھا، اسپین اور بغداد کی یونیورسٹیوں میں علم وتحقیق کی شمع روشن تھی جس کی شعاعوں سے نصف معمورۂ ارضی منور ہو رہا تھا۔ اس نے پوری صفائی سے اعلان کیا کہ جس زمانہ میں پوپ اور محکمۂ احتساب کے حکم سے حرکت زمین کے قائلین کو زندہ جلایا جارہا تھا، اس وقت اسپین کے عرب اساتذہ اور حکماء اسلامی یونیورسٹیوں میں حرکت زمین کی تعلیم دے رہے تھے۔ نیز مسلمانوں نے علم الحیات وعلم الافلاک میں علم مناظر ومرایا میں علم کیمیا اور علم نجوم وطب میں سیاروں کی حرکات وپیمائش اور ان کے مرور وہبوط کی تحقیق میں وہ عظیم الشان کارنامے انجام دیئے جن سے موجودہ یورپ کو مستفید ہونے کا موقع ملا۔

ان حقائق کی موجودگی میں کیا ایک لمحہ کے لئے بھی اس بات کا تصور کیا جاسکتا ہے کہ معرکۂ مذہب وسائنس سے ڈریپر کی مراد اسلام اور سائنس کا تصادم ہے؟ اس کے سامنے مسیحیت ہے، کلیسا ہے، پوپ اور ان کے فیصلے ہیں، محکمۂ احتساب اور ان کے شکنجے ہیں، جبور

ڈانو برونو[1] کی جلی ہوئی ہڈیاں اور گلیلو کا نحیف جسم ہے جو دور بین کی ایجاد کے جرم میں سیکڑوں تازیانے کھا چکا ہے!

محکمۂ احتساب: غرض یورپ کے مورخین اور سائنس و حکمت کے ماہرین کو اس امر کا اعتراف ہے کہ اسلام اور مسلمان علوم و اکتشافات کے مخالف نہیں ہیں اور نہ اسلام اور سائنس میں کسی قسم کا تصادم و تضاد ہے، اگر ان میں تصادم ہوتا تو مسلمان علم و حکمت کی کبھی سرپرستی نہ کرتے اور کبھی اپنی درسگاہوں میں ایسی تعلیم نہ دیتے جس کی بنا پر اٹلی، فرانس، انگلستان، اسپین اور پرتگال میں ہزاروں علماء اور حکماء کو زندہ جلایا گیا، اور بیشمار اشخاص کو اکتشافات کے جرم میں جیلوں اور کوٹھریوں میں گھلا گھلا کر مار دیا گیا۔

تیرہویں صدی عیسوی میں اٹلی میں محکمہ احتساب قائم کیا گیا۔ جس کی نقل انگلستان اور فرانس میں بھی اتاری گئی اور اسپین میں نہ صرف نقل اتاری گئی بلکہ اس پر عمل بھی پوری قوت کے ساتھ کیا گیا۔ اور ایک لاکھ سے زیادہ اشخاص کو اس کی بدولت مشق ستم بننا پڑا رائٹ آنریبل جے۔ ایم رابرٹسن لکھتے ہیں۔

> "محکمہ احتساب کی بدولت تعذیب و تخریب، قتل و خونریزی کا جو مسلسل مظاہرہ ہوا ہے اس کے اعداد و شمار اس قدر ہولناک ہیں کہ جو دہ مہذب دنیا انہیں باور کرنے پر آمادہ نہ ہوگی۔ صرف کاسٹائل میں "چند سالوں کے اندر" دو ہزار اشخاص زندہ جلا دیئے گئے اور جن اشخاص کو مختلف عذابوں اور تکلیفوں میں مبتلا کیا گیا، ان کی تعداد بیس ہزار سے کم نہیں ہے۔"[2]

انگلستان میں علماء و حکماء کو علوم و اکتشافات کے جرم میں اور مذہبی اشخاص کو الحاد و زندقہ کی پاداش میں ۱۴۱۴ء سے ۱۴۶۷ء تک مسلسل پھانسیاں دی گئیں۔ زندہ جلایا گیا اور شکنجوں میں کسا گیا۔ آدم آف ارسک کا بیان ہے کہ ایسے ستم رسیدہ اشخاص کی تعداد ۲۳۰۰۰ ہے مگر اسی کے

---

[1] برونو (Jiordano Bruno) ۱۵۴۵-۱۶۰۰ء پر روم کی مذہبی عدالت نے حرکت زمین کے قائل ہونے کی بنا کر کفر والحاد کا فتویٰ لگایا اور مارے ڈر کے یہ غریب سارے یورپ میں مارا مارا پھرا۔ ۱۵۹۲ء میں اس کی شامت نے دھکا دیا اور اٹلی واپس چلا آیا۔ یہاں محکمہ احتساب کے "تازی کتے" اس کی تاک میں تھے۔ فوراً گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ سات سال تک جیل میں رہنے کے بعد آخر اسے ۱۷ر فروری ۱۶۰۰ء میں زندہ جلا دیا گیا۔ ۱۲ منہ

[2] رابرٹسن صفحہ ۱۷۶ History Of Christianity

ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ ان سب ہی کو پھانسی پر نہیں لٹکایا گیا۔ [1]

اسپین میں ''قانون ایمان'' (Auoto da Fi) کے ماتحت جس شخص کو مجرم گردانا جاتا تھا اسے ارکان سلطنت اور رجال مذہب کے سامنے زندہ جلادیا جاتا تھا۔ چنانچہ جن اشخاص پر اس قانون کی تلوار چلائی گئی ان کی تعداد تیس ہزار سے کم نہ تھی اور ان میں بھی زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی جو آگ کے الاؤ میں جھونک کر خاکستر بنادیئے گئے۔ [2]

یہاں محکمہ احتساب کی تاریخ بیان کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ یہ دکھانا ہے کہ سائنس واکتشافات اور عیسوی مذہب میں نہ صرف نظری اختلاف وتصادم تھا بلکہ مسیحیت نے عملی طور پر علم وحکمت کی بنیادوں کو اکھیڑنے کا عزم کرلیا تھا۔ اگر سائنس استقامت کے ساتھ قائم رہ کر مسیحیت کو ذلت آمیز شکست دینے میں کامیاب نہ ہوتی تو محکمہ احتساب کے شعلے ہمیشہ بلند رہتے اور اکتشافات کا بچہ کبھی اپنے بلوغ کو نہ پہنچتا۔ [3]

اس کے مقابلہ میں آپ نے کبھی نہ سنا ہوگا کہ علم واکتشاف کے جرم میں کبھی کوئی شخص علماء اسلام کے فتوے کی رو سے قتل کیا گیا۔ یا کسی اسلامی حکومت نے کسی شعبۂ علم کو الحاد وزندقہ قرار دے کر اس کے حامیوں کو پھانسی پر چڑھایا یا کسی ملک میں کسی وقت اسلامی محکمۂ احتساب قائم کیا گیا اور اس پر مورخین کو کتابیں لکھنی پڑیں۔ کسی شیخ الاسلام، کسی عالم وامام کا نام لو اور بتاؤ کس نے کب علوم وحکم کی مخالفت کی اور اسے کفر والحاد سے تعبیر کرکے حکماء کو شکنجوں میں کسایا قید خانوں میں گھلا گھلا کر مارا؟ یورپ تک کے مورخین کو اعتراف ہے کہ علم وحکمت کی اشاعت کے جرم میں جس وقت علماء وحکماء کو زندہ جلایا جارہا تھا اس وقت اسلامی درگاہوں میں پوری آزادی کے ساتھ تحقیقات اور ریسرچ کا کام جاری تھا اور اساتذہ اور طلبا اسرار کائنات کی عقدہ کشائی میں لگے ہوئے تھے۔

---

[1] ایچ بریڈلا یوز صفحہ ۱۰ Penalties Upon Opinion

[2] تفصیل کے لئے دیکھو سرالیگزنڈر کاؤ کی کتاب A Shart History Of The inguisition

[3] سائنس اور عیسویت کے تصادم کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل کتاب پر ضرور نظر رکھنی چاہئے:

The Laws Relating To Blasphemy از چارلس بریڈلا

The Past And Present Of Our Heresy Laws از ڈاکٹر ڈبلیو اے ہنٹر

History Of Criminal Law از سر جیمس اسٹیفن

A History Of The Crime Of Blasphemy از جی۔ ڈی نوکس

ہمارا دعویٰ تھا کہ سائنس اور عیسویت میں تصادم ہے اسلام اور سائنس میں کوئی تصادم نہیں ہے اور جن تعلیم یافتہ نوجوانوں کا خیال ہے کہ اسلام بھی علوم وحکم اور اکتشافات کا مخالف ہے وہ یا تو انتہا درجہ کے جاہل ہیں یا پرلے درجہ کے نادان اور بے سمجھ، سو ہمارا یہ دعویٰ صرف ان چند سطور ہی سے ثابت ہو گیا ہے مگر ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ ثابت کریں گے کہ عیسویت کے مقابلہ پر اس جنگ میں سائنس کو فتح مبین حاصل ہوئی ہے اور مسیحیت نے اس بری طرح شکست کھائی ہے کہ یورپ میں کلیسا کی بنیادیں ہل گئی ہیں اور مسیحی ارکان کو نہایت ذلت کے ساتھ اس کا اعتراف کرنا پڑا ہے۔

مسیحیت کی شکست: ایک زمانہ تھا کہ حرکت زمین کے قائلین کو زندہ جلا دیا جاتا تھا اور سائنس واکتشافات کی مخالفت کے لئے رومی کلیسا کو دنیا کا سب سے بڑا ہولناک اور خوفناک محکمہ (احتساب) قائم کرنا پڑا تھا۔ اس کے بعد وہ زمانہ بھی آیا کہ سائنس اپنے ارتقائی منازل طے کرتی رہی اور مسیحیت کو اپنا موقف بدلنا پڑا۔ یہ سائنس کی زبردست فتح ہے کہ کلیسا کو محکمۂ احتساب توڑنا پڑا اور مجبور ہو کر اس نے اعلان کیا کہ مسیحیت پر علمی نکتہ چینی کوئی قابل تعزیر جرم نہیں ہے۔ علماء اور محققین کو حق ہے کہ وہ مسیحی علم کلام کو نقد وتبصرہ کی کسوٹی پر رکھیں اور دنیا کو غور وفکر کی دعوت دیں۔ پروفیسر گور (Gore) جو وارسسٹر، برمنگھم، اور آکسفورڈ کے بشپ رہ چکے ہیں اور جو یورپ میں سائنس کے مقابلہ پر مسیحیت کے زبردست حامی تصور کئے جاتے ہیں، مخالفین کی نکتہ چینی کے متعلق فرماتے ہیں:

> "ہم ایک لمحہ کے لئے بھی اس حماقت کا ارتکاب نہیں کرنا چاہتے کہ مسیحی لٹریچر اور کتب مقدسہ پر نکتہ چینی کا حق کسی کو حاصل نہیں ہے، علم وخرد کا تقاضہ ہے کہ کتب مقدسہ پر سخت سے سخت نکتہ چینی کا حق مخالفوں کو دیا جائے اور پوری اجازت دی جائے کہ ہر شخص تاریخ کی روشنی میں ہماری تاریخی دستاویزات کی جانچ پرتال کرے۔" [۱]

علم الحیات کا مشہور ماہر ہکسلے (Julian Hexley) اس رواداری اور کشادہ نظری کا خیر مقدم کرتے ہوئے لکھتا ہے:

---

[۱] بشپ گور صفحہ ۱۶۸ Belief in God

"علم النفس اور مطالعہ مذاہب کی ترقی نے چرچ کے زاویہ نگاہ میں بہت بڑی حد تک تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ مذہب (یعنی عیسوی مذہب) کی سخت گیری جو نصف صدی پیشتر کلیسائی حلقوں میں موجود تھی وہ آج مفقود نظر آتی ہے۔ ۱

گویا کلیسا نے دار و گیر سے توبہ کر کے سائنس کے لئے میدان صاف کر دیا اور یورپ کے حکماء نے اس وسعت نظری کا بڑھ چڑھ کر شکریہ ادا کیا، لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ کلیسا نے نہ صرف سائنس کے لیے راستہ صاف کر کے شکست کھائی بلکہ اس نے اس حقیقت کا بھی اعلان کر دیا کہ مذہب اور سائنس میں کسی قسم کا تصادم اور کسی نوعیت کا اختلاف نہیں ہے! سائنس نے بلاشبہ کلیسا کی رواداری کا شکریہ ادا کیا، مگر اس نے چرچ کا یہ "ارتداد" گوارا نہ کیا کہ مذہب اور سائنس میں کوئی اختلاف و تصادم نہیں اور ان میں پورا پورا اتفاق ہو گیا ہے! سائنس اپنے مقام پر کھڑی ہے بلکہ آگے بڑھ رہی ہے۔ اس کا اب بھی یہی خیال ہے کہ عیسوی مذہب سے اس کا توافق نہیں ہو سکتا، مگر کلیسا اور اس کے ارکان، سائنس کے خلاف متحدہ محاذ قائم کر کے علماء کو زندہ جلا کر پہلے تو اس منزل میں آئے کہ کتب مقدسہ پر ہر شخص کو نکتہ چینی کا حق حاصل ہے اور پھر اپنی ہزیمت کا کھلا اعتراف کرتے ہوئے اس اعلان پر بھی آمادہ ہو گئے کہ مذہب اور سائنس میں کوئی اختلاف نہیں ہے! کیا اس سے بڑھ کر مسیحیت کی شکست اور سائنس کی کوئی اور فتح ہو سکتی ہے؟ سائنس کا اب تک اعلان ہے کہ مذہب سے اس کی دوستی نہیں ہو سکتی، مگر مذہب (یعنی مسیحیت) نے اس کے سامنے یہاں تک گھٹنے ٹیک دیئے کہ چھ سو سال کی مسلسل معرکہ آرائی کو بھی فراموش کر دیا۔

اس سلسلہ میں اے این وائٹ ہیڈ کا قول نقل ہو چکا ہے کہ یا تو مذہب (مسیحیت) باقی رہے گا یا سائنس کو بقا کی دولت حاصل ہو گی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ مسیحیت اور سائنس دوش بدوش چلتے رہیں اور ان میں اختلاف و تزاحم کی کوئی صورت پیدا نہ ہو۔

ایک تازہ واقعہ: اس سلسلہ میں ہم ایک تازہ واقعہ کی طرف ناظرین کرام کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں۔ گذشتہ اکتوبر ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا ریڈیو بمبئی نے سائنس اور مذہب پر چند تقریروں کا انتظام کیا تھا، چنانچہ اس موضوع پر پہلی تقریر بمبئی کے ایک مشہور ڈاکٹر اور سائنس داں سی ایل ڈی ایوائن (D,Avoine) نے کی اور ثابت کیا کہ "مذہب" سائنس کا

---

۲ بحوالہ صفحہ ۱۳۲ Essays in Popular Seience

دشمن ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے دعوے کے اثبات کے لئے جو دلائل پیش فرمائے تھے ان کا جواب دینے کے لئے بمبئی کے آرچ بشپ رابرٹ کو موقعہ دیا گیا۔ آپ نے اپنی تقریر میں فرمایا۔

"ڈاکٹر ڈی اوائن نے سائنس کے حقائق کا اظہار کرتے ہوئے مابعد الطبیعیاتی مسائل سے انکار کیا ہے مگر یاد رہے کہ مذہب (!) اور سائنس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ۱۹۲۶ء میں فرنچ اکاڈمی آف سائنس کے چند ممبروں کی طرف سے بھی یہ اعلان کیا گیا تھا کہ "مذہب" اور سائنس میں کوئی معرکہ نہیں ہے۔"

ڈاکٹر صاحب کو جنھوں نے اس بحث کا افتتاح کیا تھا پھر جواب الجواب کا موقع دیا گیا۔ آپ نے فرمایا۔

"موجودہ سائنس کی تاریخ کا ہر صفحہ گواہ ہے کہ مذہب اور سائنس میں کس شدت کا معرکہ کارزار گرم رہا ہے۔ چرچ نے گلیلیو (Galieo) کے انکشافات کو غلط قرار دے کر اسے سخت اور سنگین سزا دی۔ کوپرنیکس (Copernicus) کے "نظریہ شمسی المرکز" (Heliocentric Theory) یعنی اس نظریہ کو کہ زمین آفتاب کے گرد گردش کرتی ہے کفر و الحاد اور کتب مقدسہ کی مخالفت سے تعبیر کیا گیا اور اس خیال کی اشاعت کو ممنوع قرار دیا گیا۔ ۵/مارچ ۱۶۱۶ء کو پوپ پال چہارم نے ایک اعلان شائع کیا جس میں کوپرنیکسی نظریہ کو کتب مقدسہ کے خاف قرار دیا گیا اور ہدایت کی گئی کہ اس نظریہ کی کسی جگہ بھی اشاعت نہ کی جائے۔ اس کے علاوہ ہر شخص جانتا ہے کہ "مذہب" نے ڈاردن کے نظریات کی کس شدت کے ساتھ مخالفت کی۔" [1]

آل انڈیا ریڈیو بمبئی کے اس مکالمہ سے دو باتیں صاف طور پر عیاں ہیں۔

(۱) سائنس کا خیال اب تک یہی ہے کہ "مذہب" اس کا دشمن ہے اور ان میں تطابق و توافق کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی مگر چرچ، کلیسا، بشپ اور آرچ بشپ سب ہاتھ جوڑ کر فرمار ہے ہیں کہ عیسوی مذہب اور سائنس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سائنس کے مقابلہ پر کلیسا کی کمر ٹوٹ چکی ہے اور اس نے اپنی شکست اور سائنس کی فتح کا کھلا اعتراف کر لیا ہے۔

(۲) دوسری بات وہی ہے جسے ثابت کرنے کے لئے ہم نے قلم اٹھایا ہے یعنی معرکہ مذہب

---

[1] بمبئی کرانیکل ویکلی ایڈیشن مورخہ ۲۸/جنوری ۱۹۴۰ء ۱۲

وسائنس سے مراد مسیحیت اور سائنس کا معرکہ ہے۔ ڈاکٹر ڈی اوائن نے اگرچہ سائنس کے مقابلہ پر "مذہب" ہی کا نام لیا ہے۔ مگر ان کی عبادت سے صاف معلوم ہو سکتا ہے کہ مذہب سے ان کی مراد صرف مسیحیت اور کلیسائی نظام ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس تصادم کے ثبوت میں چرچ کا نام لیا۔ پوپ پال چہارم کا نام لیا۔ ان کے مذہبی اعلان کی تشریح کی، اور اس شخص کے سامنے کی جو عیسائی ہے۔ عیسائیت کا نمائندہ اور بمبئی کا آرچ بشپ ہے! حالانکہ ڈاکٹر صاحب کے جواب میں ایک مسلمان عالم کو بھی بولنے کا موقع دیا گیا تھا اور ڈاکٹر صاحب نے جواب الجواب میں ان کے دلائل کی طرف بھی اشارہ کیا تھا، مگر وہ سائنس کے مقابلہ پر اسلام کا نام تک نہ لے سکے اور کسی امام، کسی شیخ الاسلام اور کسی مفتی کا ایک قول بھی سائنس کی مخالفت میں پیش نہ کر سکے۔ اور نہ اسلام کے کسی ایسے مسئلہ کی طرف اشارہ فرما سکے جو واقعہ اور مشاہدہ کے خلاف ہو۔ لہٰذا یہ امر پایۂ تحقیق کو پہنچ گیا کہ سائنس کا مقابلہ مسیحیت اور کلیسا سے ہے۔ اسلام سے نہیں ہے، اور "مذہب" سے حکما کی مراد بھی مسیحیت ہے، اسلام سے انہیں کوئی تعلق نہیں ہے۔

عیسانیت پر پہلا حملہ: چونکہ علماء و حکماء کو معلوم تھا کہ سائنس کی راہ میں مسیحی مذہب ایک زبردست خلیج ہے۔ اس لئے انہوں نے پہلے اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی اور جس قلعہ کو ناقابل تسخیر تصور کیا جا رہا تھا اس پر تین محاذ سے اس قدر شدید گولہ باری کی کہ بنیاد تک کی اینٹیں نکل گئیں جس طرح عیسائیت نے کلیسا پر حملہ کرنے کے لئے تین محاذ بنائے اور تینوں محاذوں کو اس کے خلاف استعمال کیا اور ہر محاذ پر اسے نمایاں کامیابی اور فتح حاصل ہوئی۔

عیسائیت پر سب سے پہلا حملہ ڈارون کی طرف سے ہوا۔ جس وقت اس کی کتاب "اصل الانواع" منظر عام پر آئی تو عیسائی دنیا میں ایک کہرام مچ گیا۔ کتاب کے دلائل سے کلیسا نے محسوس کر لیا کہ ڈارون کے نظریۂ ارتقاء نے کتب مقدسہ کی نبیادوں کو ہلا دیا ہے۔ اس نے دیکھا کہ ڈارون کی تھیوری پر جو بھی ایمان لاتا ہے اس کے لئے لازمی ہو جاتا ہے کہ توریت (کتاب پیدائش) کے الہامی حقائق کو غلط اور خلاف واقعہ قرار دے اور ایک کتاب کے بعد تمام کتب مقدسہ کا انکار کر دے۔ نظریہ ارتقاء نے بائبل کی تشریحات متعلقہ تخلیق انسانی اور ہبوط انسانی کی بنیادیں ہلا ڈالیں اور ڈارون ازم نے کلیسا کے حق میں وہ کام کیا جس کا تصور بھی کلیسا کے لئے

ناممکن تھا۔ کتاب پیدائش کی تشریحات اور تخلیق کی داستان کا جو نقشہ مشہور شاعر ملٹن نے اپنی "فردوس المفقود" میں جس انداز کے ساتھ کھینچا تھا وہ مسیحیت کے دل ودماغ پر نقش ہو چکا تھا مگر ڈارون کی بمباری نے یہ سارے نقشے محو کر دیے اور دیکھتے دیکھتے یورپ کا بیشتر حصہ گرجا سے منحرف ہو کر ڈارون ازم کی پناہ میں آگیا۔

نظریۂ ارتقاء کے ذیل میں جب اجرام سماویہ کی تحقیقات شروع ہوئی اور علم الحیات، علم طبقات الارض، علم نسل انسانی کی مدد سے یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ دنیا کی عمر کروڑوں سے گذر کر اربوں سال سے بھی متجاوز ہے تو مسیحیت کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ کیونکہ سائنس داں کہتے تھے کہ دنیا کی عمر اتنی طویل ہے کہ اس کا شمار بھی نہیں ہو سکتا اور کلیسا کا فرمان تھا کہ دنیا کی عمر پر کل سات ہزار سال گزرے ہیں! اے، این وائٹ ہیڈ لکھتا ہے۔

"آج سے ایک سو سال پہلے علم طبقات الارض کے ماہرین نے دنیا کی عمر میں توسیع کا مطالبہ کیا، مگر یہ سنتے ہی پروٹسٹنٹ اور کیتھولک چرچ میں صف ماتم بچھ گئی۔ اسی طرح نظریۂ ارتقاء بھی کلیسا کے لئے سوہان روح بنا ہوا ہے۔" [1]

کچھ دنوں تک تو مسیحیت کے حامی دھینگا مشتی ہی کرتے رہے مگر جب وسیع تحقیقات نے اپنا دامن پھیلایا تو مسیحی دنیا مجبور ہوئی اور "دنیا کی عمر میں توسیع" کا مطالبہ خاموشی سے منظور کر لیا گیا۔

ڈارون اور کلیسا: اگر کلیسا نظریہ ارتقاء کے مقابلہ پر ڈٹی رہتی تو ممکن تھا کہ "مذہب" اور سائنس کا معرکہ کچھ عرصہ تک اور گرم رہتا مگر مسیحیت نے اسی میں خیر سمجھی کہ اپنی ہار مان لی اور ہار بھی ایسی جس نے مادّیین اور متشککین کو دہریت کی دلدل میں پھنسا کر چھوڑ دیا اور ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا کہ وہ خدا، انبیاء، کتب مقدسہ اور مذہب کا انکار کر دیں۔ ڈارون کے حملوں سے بچنے یا کتب مقدسہ کو بچانے کے لئے آباء کلیسا نے پہلی تدبیر تو یہ کی کہ نظریۂ ارتقاء کو تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ بشپ گور لکھتا ہے کہ

> "چودھویں صدی عیسوی میں ڈارون کا نظریۂ ارتقاء مسیحی میں تسلیم کیا جا چکا تھا اس لئے ہمارے لئے اس سے گھبرانے اور سہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ خیال کہ کتاب

---

[1] صفحہ ۲۱۱ Science & The Modern World

پیدائش کے ابتدائی ابواب میں تخلیق کائنات کے مسئلہ میں جو کچھ کہا گیا ہے محض تمثیلی ہے، تاریخی اور واقعی نہیں ہے۔ نہ صرف اسکندری اسکول کے عیسائیوں میں بلکہ ابتدائی صدی کے مسیحیوں میں تسلیم کیا جاچکا تھا۔ سینٹ گریگوری کے بعد سینٹ آگسٹائن نے اس حقیقت کا اعلان کیا کہ آغاز دنیا میں خدا نے زندگی کے صرف جراثیم پیدا کئے جو بعد میں آہستہ آہستہ نشو ونما پاتے رہے اور ایک مدت کے بعد درجہ تکمیل کو پہنچے۔ قدیم ترین عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ خدا نے آغاز میں انسان کو مکمل شکل میں پیدا نہیں کیا کیونکہ یہ عادت اللہ کے خلاف ہے بلکہ اس نے انسان اول میں تکمیل کا وہ درجہ پیدا کیا جس میں ارتقا کی پوری صلاحیت موجود تھی۔ بلاشبہ مسئلہ ارتقاء نے انیسویں صدی میں جو دلچسپی پیدا کی وہ چوتھی صدی میں موجود نہ تھی اور اس وقت نظریہ ارتقاء پر حیرت کا اظہار نہ کیا جاتا تھا۔" [۱]

مطلب یہ ہے کہ کتاب پیدائش میں تخلیق کائنات اور انسانی پیدائش کی جو صورت بیان کی گئی ہے وہ چونکہ ڈاروِن ازم سے مطابقت نہیں رکھتی لہٰذا آسان صورت یہ ہے کہ مسئلہ ارتقاء کا انکار کرنے کے بجائے توریت کتاب پیدائش کے بیان کو غیر واقعی، غیر تاریخی اور تمثیلی قرار دے دیا جائے اور جرأت کے ساتھ اس کا اعلان کر دیا جائے کہ چوتھی صدی کے آباء اور مسیحی علماء خود مسئلہ ارتقاء کے قائل تھے۔

کیا اس بیان کے بعد بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ مسیحیت نے سائنس کے مقابلہ پر شکست نہیں کھائی؟ سائنس اپنی جگہ پر قائم ہے مگر کلیسا اپنا مقام چھوڑ چکی ہے اور اس کے ارکان نہ صرف یہ کہ سائنس کے سامنے سرنگوں ہو چکے ہیں بلکہ اس کی خاطر کتب مقدسہ کے الہامی حقائق کو غیر واقعی اور تمثیلی قرار دے رہے ہیں! کیا سائنس کے علماء عیسائیت کی اس رجعت اور پسپائی سے ناواقف ہیں؟ کیا اس کے بعد بھی ان کے دلوں میں مسیحیت اور کتب مقدسہ کے لئے کوئی جگہ باقی رہ سکتی ہے؟ مسیحیت نے سائنس سے ہمکنار ہونے کے لئے کتب مقدسہ پر ہی ہاتھ صاف کر ڈالا اور سائنس نے اسی بات سے بھانپ لیا کہ مسیحیت نے جس قلعہ کو ناقابل تسخیر قرار دے رکھا تھا اس کی حقیقت بیت عنکبوت سے زیادہ نہیں ہے! (باقی آئندہ)

---

[۱] بشپ گور صفحہ ۱۹ Belief in God

عصمت انبیاء (علیہم السلام)

ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت زینبؓ بنت جحشؓ

(مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی)

برہان کے گذشتہ نمبروں میں عنوان بالا کے نام سے ایک سلسلۂ مضامین تسلسل کے بغیر ہدیۂ ناظرین ہوتا رہا ہے۔ مضمون زیر بحث بھی اسی سلسلہ کی ایک قسط ہے۔

مضامین کا یہ سلسلہ شروع ہی سے چار بنیادی نظریوں پر قائم ہے۔

(۱) عصمت انبیاء علیہم السلام کا مسئلہ اسلامی عقائد میں اساسی مسئلہ ہے اور ضروریات دین میں شمار ہوتا ہے۔

(۲) اس لئے نصوص شرعیہ پر اس کا مدار ہے اور ایک نص بھی ایسی نہیں پائی جاتی جو اس عقیدہ کے تزلزل کا باعث ہو۔

(۳) صحیح روایات واحادیث بھی اسی کی تائید کرتی ہیں، اور جو روایات اس کو کمزور کرتی یا اس کی مخالف نظر آتی ہیں وہ موضوع یہود کی روایات سے ماخوذ اور اسرائیلیات کی پیش پاافتادہ روایات وخرافیات میں شمار ہوتی ہیں اور اسلامیات میں ان کی کوئی وقعت نہیں ہے۔

(۴) جن حاطب اللیل مفسرین نے جرح وقدح کے بغیر ان خرافیات کو کتب تفسیر میں نقل کر دیا ہے انہوں نے سخت مہلک غلطی کی ہے اور اس لئے اس پر تنبیہ از بس ضروری ہے تاکہ عوام وخواص انبیاء علیہم السلام کی پاک اور مقدس زندگی کے بارہ میں ہر قسم کے شک وریب سے محفوظ رہیں۔

اسرائیلیات کے خرافی اور ناپاک سلسلۂ روایات نے دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح ختم المرسلین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو بھی ہدف بنائے بغیر نہ چھوڑا۔ اور یہود کی بہتان طرازیوں، اور طول شب ہجر کی طرح طویل افسانوی روایتوں نے اس مقام پر بھی اپنی دراندازیوں سے دست کشی نہیں کی۔

دراندازیوں سے دست کشی نہیں کی ۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانہ میں

انہوں نے جو کچھ کیا سو کیا حیرت ان حاطب اللیل مگر سادہ لوح مفسرین پر ہے جنہوں نے اس خیال کو سامنے لائے بغیر کہ ان جھوٹی اور گندہ روایات سے انبیاء علیہم السلام کی شان رفیع پر کیا اثر پڑے گا۔ بغیر جرح وقدح کے ان کو روایت کردیا اور اس طرح وہ نقل ہوتی چلی آئیں اور دشمنان دین کو دراندازی کا موقعہ بہم پہنچاتی رہیں۔

ناسپاسی ہوگی اگر اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر نہ کردیا جائے کہ جہاں بعض مفسرین نے اس غلطی کا اقدام کیا دوسرے اہل نقد و تحقیق مفسرین، محدثین اور ارباب سیر مصنفین مسلسل ان روایات کی تغلیط اور اصل حقیقت کو واشگاف اور روشن کرتے چلے آئے ہیں۔ اور دلائل و براہین اور اصول روایت ودرایت سے ان کی خرافیت وہزلیت کا پول کھولتے رہے ہیں۔

پس برہان کے صفحات پر ان ہی ارباب تحقیق کا نقش ثانی مثبت کرنا مقصود ہے تاکہ ہماری زبان بھی اس علمی ذخیرے سے محروم نہ رہے۔ اور اردوداں حضرات اس سے استفادہ کرسکیں۔

زیر بحث مسئلہ میں جس واقعہ کی جانب ہمارا روئے سخن ہے قرآنی تاریخ کا وہ اہم واقعہ ہے جو انسداد تبنیت (لے پالک کی رسم کے انسداد) کے سلسلہ میں حضرت زید بن حارثہ ؓ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا، اور نبی اکرم ﷺ کے درمیان پیش آیا۔

اصل واقعہ

قرآن عزیز اور صحیح احادیث کے پیش نظر اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت زید بن حارثہ ؓ عرب کے ایک مشہور اور معزز قبیلہ کے فرد تھے مگر بچپن ہی میں ڈاکوؤں نے ان کو پکڑ کر حجاز کے بازار میں غلام بنا کر بیچ ڈالا، حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ کے ماموں نے ان کو خرید لیا اور حضرت خدیجہ کو ہبہ کردیا، جب حضرت خدیجہ کو ام المومنین ہونے کا شرف حاصل ہوا تو انہوں نے حضرت زید کو نبی اکرم ﷺ کو ہبہ کردیا، آپ زید سے بے انتہا محبت کرتے اور اولاد کی طرح ان کی پرورش فرماتے تھے حتیٰ کہ آپ نے ان کو آزاد کر کے منہ بولا بیٹا بنالیا تھا اور اس لئے

سب ان کو زید بن محمد ہی کہنے۔ لگے۔

ایک سفر میں جبکہ آپ کے ساتھ حضرت زید بھی تھے۔ اس قبیلہ پر آپ کا گزر ہو جو زید کا قبیلہ تھا، ان کے والدین اور بھائیوں نے سنا تو خدمت اقدس میں دوڑے آئے اور عرض کیا کہ معاوضہ لے کر زید کو ہمارے حوالے کر دیجئے۔ آپ نے ارشاد فرمایا اگر زید اس کو پسند کریں تو بغیر معاوضہ لے جا سکتے ہو۔ ابھی زید نو عمر ہی تھے جب معاملہ ان تک پہنچا تو انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت چھوڑنے اور والدین کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگے جو پیار و محبت کا معاملہ نبی اکرم ﷺ میرے ساتھ فرماتے ہیں مجھے وہ نہ والدین سے نصیب ہو سکتا ہے اور نہ کسی عزیز ور شتہ دار سے۔

بہر حال رسول اللہ ﷺ کے چہیتے حضرت زید سن رشد کو پہنچے تو حضور ﷺ نے چاہا کہ ان کی شادی اپنے خاندان میں کر دیں تاکہ ان کو فرد خاندان ہونے کا شرف بھی حاصل ہو جائے۔

نظر انتخاب حضرت زینب بنت جحش پر پڑی یہ امیمہ بنت عبدالمطلب کی بیٹی اور نبی اکرم ﷺ کی پھوپی زاد بہن تھیں۔ اس لئے خود حضرت زینب اوران کے بھائی کو یہ رشتہ پسند نہ ہوا کیونکہ یہ خانوادۂ ہاشمی و قریشی کی معزز خاتون اور حضرت زید پر داغ غلامی لگا ہوا۔

اسلام اس قسم کے تفاخر کو کب پسند کر سکتا، اور اس موہوم تفوق اور برتری کو کب نظر میں لا سکتا تھا خصوصاً جبکہ خاندان رسولؐ میں یہ بدعت نظر آئے۔ چنانچہ آیت ذیل نازل ہوئی۔

وما كان لمومن ولا مومنة اذا	اور کام نہیں کسی ایماندار مرد کا اور نہ ایماندار عورت
يكون لهم الخيرة من امرهم ومن	کا جبکہ مقرر کر دے اللہ اور اس کا رسول کوئی کام کہ ان
يعص الله ورسوله فقد ضل	کو رہے اختیار اپنے کام کا اور جس نے نافرمانی کی اللہ کی
ضلالا مبينا (سورہ احزاب)	اور اس کے رسول کی سو وہ راہ بھولا صریح چوک کر۔

حضرت زینب اوران کے بھائی کی نارضامندی کا معاملہ خاندانی عصبیت پر مبنی تھا سرکشی پر نہ تھا اس لئے جونہی ان کو یہ معلوم ہوا کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہے صرف مشورہ نہیں ہے تو انہوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور حضرت زید سے حضرت زینب کا عقد ہو گیا۔

اگرچہ برتری و کمتری کے امتیازی خیالات احکام شرع کے سامنے ماند پڑ گئے تھے مگر وہ

حضرت زینب کے دماغ سے بالکل محو نہ ہو سکے۔ اس لئے زن و شو کے درمیان اَن بَن رہنے لگی اور باہمی ازدواجی تعلقات میں خوشگواری نہ پیدا ہو سکی۔

روز روز کی اس کشمکش سے تنگ آکر حضرت زید نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں درخواست کرتے ہیں حضور! اجازت دی جائے کہ میں زینب کو طلاق دے دوں، مگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو ایسا کرنے سے باز رکھتے اور ان کو نصیحت فرماتے کہ وہ اس رشتہ کو قطع نہ کریں جس کو اللہ اور اُس کے رسول کے حکم کے زیر اثر زینب اور ان کے بھائی نے منظور کیا اور اپنی ذاتی مرضی و خواہش کو ارشاد ربانی پر قربان کر دیا۔

واذ تقول للذی انعم الله علیه وانعمت علیه امسك علیك زوجك واتق الله — وہ وقت یاد کرو جب تم اس شخص سے کہہ رہے تھے "جس پر اللہ نے اور تم نے انعام واکرام کیا" کہ اپنی بیوی کو طلاق نہ دے اور خدا کے خوف سے ڈر۔

ادھر تو یہ گفتگو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت زید کے درمیان جاری تھی اور دوسری جانب اللہ تعالیٰ کی وحی نے آپ پر یہ واضح کیا کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اس کی حکمت بالغہ کا یہ تقاضہ ہے کہ منہ بولے بیٹے (متبنیٰ) کو حقیقی بیٹا بنانے اور گود لینے (تبنیت) کی رسم کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے اور اس فاسد رسم کا قلع قمع محض قول و گفتار کے احکام سے انجام نہ پائے بلکہ پیغمبر کے عمل و کردار سے اس کا فیصلہ کرایا جائے۔ اس لئے زید بہر حال طلاق دے گا اور تم کو زینب کو عقد میں لینا ہوگا۔ تاکہ تبنّی کی رسم بد کے خاتمہ کے ساتھ ساتھ زینب کے زخم کا اندمال بھی ہو جائے جو زید کے عقد میں آکر طلاق پانے سے ان کے اور ان کے ذی وجاہت خاندان کے لئے سبکی اور خفت کی شکل میں ظاہر ہوا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ وحی الٰہی کے آگاہی پر اس حقیقت سے آشنا ہو چکے تھے مگر اس پر بھی حضرت زید کو بار بار طلاق نہ دینے کی ترغیب دیتے تھے کیونکہ بہ تقاضائے بشریت آپ کے دل میں یہ قلق واضطراب تھا کہ اگر زید نے طلاق دی اور زینب میرے عقد میں آئیں تو آئین عرب کے مطابق تمام قریش تہمت رکھیں گے کہ محمد ﷺ نے اپنے بیٹے کی بیوی سے نکاح کر لیا کیونکہ ان کی نگاہ میں متبنی تمام احکام میں حقیقی بیٹے کی طرح سمجھا جاتا تھا۔

اس بشری اضطراب کو بھی حق تعالیٰ نے ایسے جلیل القدر رسول کے مرتبہ کے لائق نہ جان کر اور ان کے منصب سے نازل سمجھ کر بمصداق "حسنات الابرار سیئات المقربین" عتاب کی شکل میں یہ ارشاد فرمایا:

وتخفی فی نفسک ماالله مبدیه وتخشی الناس والله احق ان تخشه	اور تم اپنے دل میں اس چیز کو چھپائے ہو جس کو اللہ تعالیٰ ظاہر کر کے رہے گا اور تم لوگوں سے گھبراتے ہو حالانکہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے یہ زیبا ہے کہ اس سے ڈراجائے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں کون سی بات چھپی ہوئی تھی جس کے ظاہر کرنے سے وہ شرماتے تھے مگر اللہ تعالیٰ اس کے ظاہر کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں یہود نے اور ان کی غلط اور اندھی تقلید میں بعض حاطب اللیل مفسروں نے جرح وقدح کئے بغیر خرافاتی ذخیرہ کو روایت کیا، اور العیاذ باللہ اس کو قرآن عزیز کی اس آیت کی تفسیر قرار دیا۔

باطل روایت

دشمنان اسلام جب نصوص قرآنی وحدیثی میں دراندازی کے مواقع نہیں پاتے تو اسلامی عقیدہ کی بنیاد میں تزلزل پیدا کرنے کے لئے ایک دوسری راہ اختیار کرتے رہے ہیں وہ یہ کہ نصوص کی تفسیر وتاویل کے نام سے جھوٹی روایتوں کو گھڑ کر حدیثی روایات کی حیثیت میں پیش کرتے، اور سادہ لوح اور حقیقت ناآشنا راویوں کے ذریعہ ان کی تشہیر کراتے تھے۔ یہی معاملہ اس واقعہ کے ساتھ بھی پیش آیا کہ "تخفی فی نفسک" کی تفسیر میں دجل وزور کی جس قدر نیرنگیاں پیدا کی جاسکتی تھیں پیدا کرنے کی سعی ناکام کی گئی اور ایک من گھڑت افسانہ بنا کر پیش کر دیا گیا۔

بہر حال بمصداق نقل کفر کفر نہ باشد یہودی اور اسرائیلی افسانہ کا حاصل یہ ہے کہ ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زینب کے مکان پر تشریف لے گئے۔ حضرت زینب اس وقت ردا اور خمار میں ملبوس تھیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پہلی بار دیکھا تو ان کو بیحد حسین پایا اور اسی سے دل میں یہ خیال پیدا کر لیا کہ کسی طرح زید اسے طلاق دیدے تو میں اپنے عقد میں لے آؤں مگر زید جب زینب کی شکایت کرتے تو آپ دل کے خلاف ان کو یہی

مشورہ دیتے کہ تم زینب کو طلاق نہ دو آخر اللہ تعالیٰ نے آپ کا یہ راز ظاہر کردیا اور زید نے طلاق دیدی اور زینب آپ کی زوجیت میں آگئیں۔

یہ بیہودہ فسانہ خود آپ اپنی تکذیب کے لئے کافی ہے اور ایک سمجھ دار انسان ایک لمحہ کے لئے بھی اس کو درخور اعتناء نہیں قرار دے سکتا اس لئے کہ حضرت زینب کوئی اجنبی عورت نہ تھیں۔ جن کو آج پہلی بار آپ نے دیکھا ہو وہ تو آپ کی پھوپی زاد بہن ہیں بچپن سے اس واقعہ تک شب وروز آپ کے سامنے آتی رہی ہیں، ان کی زندگی کا ہر پہلو آپ کی نگاہ میں رہا ہے، تو یہ روایت کیسے صحیح ہو سکتی ہے کہ آپ نے حضرت زینب کو آج پہلی بار دیکھا اور ان کے حسن سے متاثر ہوئے۔

صحیح تفسیر

یہی وجہ ہے کہ جمہور محققین علماء تفسیر وحدیث وسیرت نے حجت وبرہان کے ساتھ متفقہ فیصلہ کردیا کہ یہ روایت سر تاپا غلط اور بہتان طرازی کا بدترین نمونہ ہے۔ قرآن عزیز کی آیت کا صاف اور سادہ مطلب یہ ہے کہ انسداد تبنیت کے سلسلہ میں جو اطلاع آپ کو دی گئی ہے وہ اگر آپ پوشیدہ بھی رکھنا چاہیں تو ایسا نہیں کرسکتے۔ یہ تو خدا کا اٹل فیصلہ ہے جو ہو کر رہے گا۔ او[ر] خدا کے خوف کے ساتھ خاندان وبرادری کی ملامت کا خوف ایک پیغمبر کے دل میں جمع نہیں ہو سکتا اس کے روشن قلب میں خوف خدا کے سوا کسی کا خوف نہیں ہونا چاہئے۔ [illegible] اور دشمن طعنہائے دلخراش ہی کیوں نہ دیں لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کا فیصلہ اٹل ہے اور [illegible] جاہلیت کی تباہی آپ کے اس عمل سے ہی پوری کی جائے گی جس کا تصور بھی آپ کے [illegible] باعث صد اضطراب وقلق بنا ہوا ہے۔

مختصر یہ کہ قلب رسول میں صرف وہی اطلاع یا پیشگوئی پوشیدہ تھی وحی الٰہی نے واق[ع] ہونے سے قبل ہی جس کی اطلاع آپ کو دیدی تھی اور آپ بہ تقاضائے بشریت تہمت سے بچنے کے لئے اس کو ظاہر فرماتے ہوئے پس وپیش فرمارہے تھے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ العیاذ باللہ اگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم خدائے تعالیٰ کی وحی کا ذرا بھی کتمان فرماتے تو یہ آیت زیادہ مستحق تھی کہ اس کو آپ ظاہ[ر] [illegible]

فرماتے اور چھپا لیتے مگر ایسا نہیں ہوا۔ اور آپ نے خدا کے اس فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔

پس اخفاء کی اس تفسیر کے علاوہ باقی تمام خرافی روایات گندہ اور نا قابل اعتناء اور کذب وبہتان کا ناپاک ذخیرہ ہیں جن کے لئے اسلامیات میں کوئی جگہ نہیں ہے اور وہ صرف اسرائیلیات کی سحری افسانوں ہی کی زینت بن سکتی ہیں اور بس۔

چنانچہ حافظ عماد الدین ابن کثیر فرماتے ہیں:

اجبنا ان نضرب عنها صفحاً لعدم صحتها فلا نوردها

(ابن کثیر جز ۸)

ہم نے یہی پسند کیا کہ اس قسم کی روایات سے بالکل کنارہ کشی کر لیں اور ان کے بیان کو اس لئے نظر انداز کر دیں کہ وہ قطعاً صحیح نہیں ہے۔ اور نا قابل اعتبار ہیں۔

اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمتہ اللہ فرماتے ہیں۔

لا ینبغی التشاغل بها

(فتح الباری باب التفسیر جز ۸)

ان روایات کی جانب توجہ کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

اور شیخ محمود آلوسی صاحب روح المعانی لکھتے ہیں۔

وللقصاص فی هذه القصة کلام لا ینبغی ان یجعل فی حیز القبول

اور اس واقعہ کے متعلق افسانہ گویوں کی قصہ گوئی ہے جو کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہے۔

اور قاضی عیاضؒ شفاء میں اور اس کے شارح خفاجی نسیم الریاض میں تحریر فرماتے ہیں۔

وقد قال صلی الله علیه وسلم ما کان النبی ان تکون له خاینة الاعین فیکف ان تکون له خائنة قلب

اور رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ نبی کبھی آنکھ کی خیانت کا مرتکب نہیں ہو تا چہ جائے کہ وہ دل کی خیانت کا مرتکب ہو۔

(نسیم الریاض جلد ۴ صفحہ ۲۹۷)

اور اس روایت کو نقل کرنے کے بعد خاص اس واقعہ کے متعلق فرماتے ہیں۔

فاثله وقلة معرفة بحق النبی صلی الله علیه وسلم وبفضله وکیف یقال راها فاعجبة

امام قشیری فرماتے ہیں حضرت زینب سے متعلق یہ روایت قائل کی جانب سے سخت مجرمانہ اقدام ہے اور نبی اکرمؐ کے حقیقی مرتبہ اور فضل سے جہالت پر مبنی ہے۔

(تیسری قسط)

فن

تاریخ گوئی کی ابتداء

از

ڈاکٹر آفتاب احمد خان ڈبل ایم، اے۔ پی، ایچ، ڈی (لیکچرر)
انٹر کالج اٹاوہ ضلع کوٹہ (راجستھان)

"دیگر اعداد کے لئے بھی اسی طرح اعداد مقرر کئے گئے ہیں جیسے (۵) کے لئے تتھ (تاریخ) دن، پکش (۱۶) بھوپ یا بھوپت (مشہور سولہ راجہ) (۲۰) نکھ (ناخن) (۳۲) دنت یعنی دانت (۴۰) نرک یعنی دوزخ [۱] ہزار کے لئے "سرپت" یعنی اندر جو ہزار آنکھوں والا ہے وغیرہ۔ [۲]

रवि, नख, रस

اور شت بمعنی سو یعنی رب شت کے معنی بارہ سو لفظ وہار برائے بیت ہے" کے بعد: "بھاسکر اچاریہ نے اپنی ولادت (شک سمت ۱۰۳۶ مطابق ۱۱۱۴ء) کا سال اپنی مشہور تصنیف "سدھانت شرومنی میں اس طرح لکھا ہے: रस, गुण, पूर्ण, मही

ان الفاظ کو دائیں سے بائیں لکھنے پر

رس گن پورنٹر (پورن) مہی ہوگا

۶ ۳ ۰ ۱ = ۱۰۳۶ شاکا

اور ان کے اعداد ۱۰۳۶ ہوں گے جو شاکا سنہ ہے۔ بھاسکر اچاری نے اپنی یہ کتاب چھتیس سال کی عمر میں مکمل کی تھی جس کا اظہار وہ [۳] रस, गुण سے کرتا ہے یعنی رس گن = ۳۶

۱؎ ان الفاظ معینہ (شبد انک) کے لئے دیکھیے۔ انڈین پیلیو گرافی از جارج بوہلر صفحہ ۱۰۳ تا ۱۰۵ تقسیم کار منشی رام منوہر لال، نئی دہلی ۱۹۸۰ء، بھارتیہ پراچین لپی مالا از گوری شنکر ہیرا چند اوجھا صفحہ ۱۱۹ تا ۱۲۱ نئی دہلی، نیز انڈین ایپی گرافی (اردو ترجمہ) از ڈی، سی، سرکار نئی دہلی ۱۹۸۴ء۔

۲؎ دیکھیے وامن شورام آپٹے لفظ سرپت کے تحت۔

۳؎ بھاسکر آچاریہ از گنشر اس کرلے صفحہ ۲۶ گیان وگیان پرکاشن نئی دہلی ۱۹۹۵ء

"فقرہ مذکورہ بالا طریقے عموماً میں استعمال ہوتے تھے" کے بعد:

لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہمیشہ متذکرہ بالا قاعدے (دائیں سے بائیں لکھنا) پر ہی عمل کیا جائے کبھی براہ راست تفریق یا جمع کے طریقہ سے بھی سنہ مطلوب پیدا کر لیا جاتا ہے۔ نمونۃً قصبہ حاجی پور (بہار) کی "مسجد مقصود" کی درج ذیل تاریخ ملاحظہ ہو:

سرپت لوچن تیئں ہر و من متھ بان بچار
سن مسجد مقصود کی جد ندی پر سار[1]

یعنی سرپت (اندر دیوتا) نے (جو ہزار آنکھوں والا ہے) من متھ یعنی کام دیو (حضرت عشق) کے پانچوں تیر ہر (چھین) لیئے۔ لہٰذا یہی مقصود کی مسجد کا سنہ تعمیر ہے جو قدیم دریا یعنی گنڈک کے کنارے پر ہے۔ سنہ اس طرح بر آمد ہو رہا ہے:

سرپت - من متھ (Cupid)
۱۰۰۰ - ۵ = ۱۰۹۵ھ مطابق ۸۷-۱۵۸۶ء

لیکن ہندی میں بالعموم صوری تاریخیں کہنے کا رواج ہے مثلاً گوبردھن (متھرا) میں سوامی برجانند کے مٹھ کے ڈیگ دروازہ پر یہ تاریخی کتبہ کندہ ہے:

سمت سترہ سواڑ یشٹھا وکرم ور سوچھ سجان لکھ کر پری پورنٹر کیے شبھ بالا نند مہان ۱۷۶۸ء بکرما/ ۱۷۱۱ء ہندی کے عظیم شاعر تلسی داس کی وفات کا سنہ تقریباً ہر ہندی داں کی زبان پر رہتا ہے:

سمت سولہ سواسی ڈاسی گنگ کے تیر　سراون شکلا اشٹمی تلسی تجیو سریر[2]　سمت ۱۶۸۰/ ۱۶۲۳ء

اسی دریائے گنگا کی معاون ندی کا نام ہے مراد دونوں کے سنگم سے ہے جہاں تلسی کی کٹیا ہے۔ تلسی نے اپنی اس شاہکار رزمیہ نظم رام چرت مانس جو برج بھاشا میں ہے، کی ابتدا کرنے کا سال بھی صوری (Figural Date) انداز ہی میں حاصل کیا ہے:

سنبت سو را سو اکتیا، کرو کتھا ہری پد دھر سیسا　۱۶۳۱ بکرما
نومی بھوم وار مدھو ماسا، اودھ پوری یہ چرت پر کاسا[3]

---

[1] "کارپس آف عربک اینڈ پرشین انسکرپشنز آف بہار" از پروفیسر قیام الدین احمد صفحہ ۱۴۹، کے پی جایسوال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، پٹنہ ۱۹۷۳ء　[2] سری رام چرت مانس گیتا پریس گورکھپور

[3] ملاحظہ ہو "راماین بھاکا (اردو) صفحہ ۱۴ مطبع منشی نول کشور، کانپور، اساڑھ ۱۹۵۰ء بکرمی/ ۱۸۹۳ء بار اول

یعنی بسنت ۱۶۳۱ میں خدا کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہوئے چیت ماہ کی نویں تاریخ کو سوموار کے روز اودھ پوری (ایودھیا) میں اس کام (تصنیف) کی ابتداء کر رہا ہوں۔

لیکن ایک تاریخ گو کو صرف ان الفاظ سے معاملہ ہوتا ہے جن کی تعداد صفر سے نو تک ہوتی ہے۔ کیونکہ دیگر تمام اعداد ان ہی بنیادی دس ہندسوں سے ترکیب پاکر بنتے ہیں۔ مگر یہ اعداد ناگری رسم الخط کے برخلاف دائیں سے بائیں لکھے جاتے ہیں یعنی سب سے پہلے اکائی کا کلمہ لکھا جاتا ہے۔ پھر دہائی، سیکڑہ اور آخر میں ہزار والا لفظ[1] جیسا کہ کلیاتِ منیر کی طباعت کے سال کی درجِ ذیل تاریخ سے ثابت ہے، جو پنڈت بیج ناتھ مالک مطبع ثمر ہند کی طبع موزوں کا نتیجہ ہے:

دِگ کلیاتِ منیر شر، رہت شتر و من ہار		بت سرس گن گرہ ششن رس نورب شت دھار
سن فصلی شا کر پھر بت سر دو اد س جگت		ہوت عیسوی، انت میں ہجری، پانچوں اگست[2]

واضح ہو کہ مذکورہ دوہرے سے پانچ سنین بر آمد کئے گئے ہیں لیکن خوف طوالت یہاں صرف دو سنین کا حل درج کیا جاتا ہے:

مصرع نمبر ۲ کے پہلے جزو میں "رس، گن، گر اور ششن" کا ذکر آیا ہے انہیں دائیں سے بائیں اس طرح لکھا جائے گا: शशि (۱) ग्रह (۹) गुण (۳) रस (۶) = سمت ۱۹۳۶ بکرمی

ہجری سنہ بر آمد کرنے کے لئے مذکورہ مصرع ثانی کے مندرجہ ذیل الفاظ لئے گئے ہیں:

रवि (۱۲) नव (۹) रस (۶)		۱۲۹۶ھ

اور "شت" بمعنی سو یعنی "رب شت" کے معنی بارہ سو۔ لفظ دہار برائے بیت ہیں۔ اس صنعت کو اردو، فارسی تاریخ گوئی میں "صنعتِ مقطعاتِ ترتیبی" سے موسوم کیا گیا[3] لیکن سنسکرت میں اس طریقہ سے اعداد ظاہر کرنے کو اصطلاح میں "بھوت سنکھیا" (شمار موجودات) کہتے ہیں۔ یہاں اس جانب اشارہ کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ تاریخ گوئی کے مذکورہ بالا طریقے عموماً نظم میں استعمال ہوتے تھے[4] لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہمیشہ مذکورہ طریقے (دائیں سے بائیں) پر ہی عمل کیا جائے۔ بعض دفعہ براہِ راست تدخلے یا تخرجے کے ذریعہ بھی سنکیت ودیا

---

[1] مقالہ "صنادید تاریخ گوئی" ص ۲۲۱		[2] ملہم تاریخ ص ۵۸ نیز غرائب الجمل ص ۲۰۸
[3] غرائب الجمل ص ۲۰۹		[4] مقدمہ ابن خلدون ۱: ۲۲۴ حساب نیم کے تحت، منشی انوار حسین تسلیم نے اسے "کسی شوخ" کی ترتیب کردہ بتلایا ہے۔ دیکھئے: ملہم تاریخ ص ۱۰

اور "شہد انگ" سے مطلوبہ سنین حاصل کر لئے جاتے ہیں بطورِ مثال حاجی پور (بہار) کی مسجد مقصود کی درج ذیل تاریخ ملاحظہ ہو:

سرپت لوچن تیئں ہر و من متھ بان بچار ۹۹۵ھ
سَن مسجد مقصود کی جدی ندی پُر سار [1]

یعنی سرپت (اندر دیوتا) نے جو ہزار آنکھوں والا ہے، من متھ (Cupid حضرت عشق) بان (تیر) جو پانچ ہوتے ہیں، چھین لئے یعنی ۱۰۰۰۔۵:۹۹۵ھ یہ کتبہ مسجد مذکورہ پر تاحال موجود ہے۔

علم نجوم کے ماہرین نے بھی ابجد کے نو درجے مقرر کئے اور ایک جداگانہ ابجد رائج کی ہے جسے "امہات جامعہ ابجدی" نام دیا گیا ہے۔ ممکن ہے یہ سنسکرت کے "کا، ٹا، پا، یا" طریقہ سے ماخوذ ہو۔ اس ابجد کو مشرقی ترتیبِ ابجدی کی رو سے "ایقغ" کہتے ہیں جس کے کلمات یہ ہیں:

کلمات	ایقغ	بکر	جلش	دمت	ھنث	وسخ	زعذ	حفض	طصظ
اعداد	۱۱۱۱	۲۲۲	۳۳۳	۴۴۴	۵۵۵	۶۶۶	۷۷۷	۸۸۸	۹۹۹

"صاحب شمس المعارف علامہ بونی کا قول ہے کہ ایقغ، بکر، جلش..... " کی اصطلاح حکیم ہمساء نے بنائی ہے۔ [2]

ان نو کلمات میں پہلا کلمہ چار حرفی ہے اور باقی آٹھ کلمات سہ حرفی ہیں۔ چونکہ گنتی کی مکمل حد نو تک ہے اور ہر عدد خواہ کسی قیمت کا ہو اسے نو (۹) کا عدد دہرانا ہی پڑتا ہے، اس لئے اس طریقہ میں تقسیم کے لمبے عمل سے نہیں گزرنا پڑتا صرف وہ حروف یکجا کر لیے جاتے ہیں جو اکائی پر دلالت کرتے ہیں، یعنی الف جو اکائی پر دلالت کرتا ہے، "ی" جو دہائی (۱۰) کی اکائی ہے۔ "ق" جو سیکڑے کی اکائی ہے اور "غ" جو ہزار کی اکائی ہے۔ لہٰذا اب یہ لفظ "ایقغ" بن گیا۔ اسی طرح دو اکائیوں پر دلالت کرنے والے حروف "ب، ک اور ر" ہیں۔ جن کا مجموعہ "بکر" بنے گا۔ اب تین اکائیوں والے حروف کو مرتب کیا گیا تو وہ "جلش" ہوگا۔ باقی چھ الفاظ بھی اسی طریقہ سے ترتیب دیئے جائیں گے۔ اس میں پہلے چاروں حرف ایک (۱) عدد کی علامت ہیں اور آخری

---

[1] ملاحظہ ہو: کارپس آف عربک اینڈ پرشین انسکرپشنز آف بہار ص ۱۶۹ مصنفہ ڈاکٹر قیام الدین احمد ناشر کے پی جائسوال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، پٹنہ ۱۹۷۳ء

[2] شمس المعارف (اردو ترجمہ) ۳:۷۹ ۳

تینوں حرف (طصظ) نو(۹) کے ہندسہ کو ظاہر کرتے ہیں، نیز درمیانی کلمات کے حروف ۳ سے ۸ تک کے اعداد کے مظہر ہیں۔ [1] گویا ہر مجموعے کے حروف کی قیمت یکساں ہوگی، جس طرح سنسکرت کے "کا، ٹا، پا، یا" میں ہے۔

شمالی افریقہ اور جزیرہ نمائے اسپین و پرتگال کے عاملوں نے بھی مغربی ابجد کو اسی خاص ترتیب کے تحت رکھتے ہوئے اپنی ابجد کے حساب سے درج ذیل کلمات بنائے ہیں:

ایقش، بکر، جلس، دمت، ھنث، وصخ، زعذ، حفظ اور طضغ۔ یہ ابجدی طریقہ مغرب میں ایقش کہلاتا ہے۔ جسے ٹونے ٹوٹکے کے بعض عملیات میں استعمال کرتے ہیں۔ اس عمل کے ماہر کو دیسی زبان میں یقاش (Yakkash) کہتے ہیں۔ [2] مشرق میں بھ عامل اس ترتیب کو تعویذوں کے نقش بنانے میں استعمال کرتے ہیں۔ [3] "اس ترتیب کو تعویذوں کے نقش بنانے میں استعمال کرتے ہیں" کے بعد ذیل کی عبارت کا اضافہ ہے: لیکن بسطِ ترفع میں تاریخیں اسی ابجد نجوم کے ذریعہ برآمد کی جاتی ہیں، چنانچہ تاریخ گوئی کے لئے بھی یہ کار آمد ہے [4] لیکن بسط ترفع کی صنعت میں تاریخیں اسی "ابجد" کے ذریعہ آمد کی جاتی ہیں۔ جس کا ذکر آئندہ آئے گا۔

عربی حروف تہجی کی مروجہ ابجد کے علاوہ متعدد دوسری ابجد بھی بنائی گئی ہیں جن کے ذریعہ تاریخیں حاصل کی جاتی ہیں۔ ان ابجاد کا ذکر صنائع کے ذیل میں کیا جائے گا۔ یہاں اس بات کا اعادہ ضروری ہے کہ حروفِ ابجد کے دیگر فوائد، جن کی جانب گذشتہ اوراق میں اشارہ کیا جاچکا ہے، سے قطع نظر اس کا اصل استعمال عربی الاساس رسم الخط والی زبانوں، خصوصاً فارسی و اردو میں منظوم قطعاتِ تاریخ نیز کتبوں کی شکل میں کیا جاتا ہے، جو دنیا کی دیگر زبانوں حتٰی کہ عربی زبان میں بھی رائج نہیں۔ [5]

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے مقدمہ ابن خلدون ۱: ۳۲۴ نیز ملہم تاریخ ص ۱۰

[2] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ۱: ۹۷ مطبوعہ ۱۹۶۰ء اور اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ جلد اول ص ۳۳۷ مدیر شیخ نذیر حسین زیر اہتمام دانش گاہ پنجاب لاہور طبع اول ۱۹۶۴ء۔

[3] دیکھئے عجائب الجمل ص ۴۲ نیز نوشتۂ تاریخ ص ۶۴

[4] برائے تفصیل ملاحظہ ہو غرائب الجمل صفحہ ۴۲ نیز نوشتۂ تاریخ صفحہ ۶۴ غرائب الجمل میں اس ابجد کے ذریعہ مختلف خوبصورت تاریخوں کے نمونے بھی مع حل دیئے گئے ہیں۔ صفحات ۲۲۹ سے ۲۸۸ اس سلسلہ میں قابل مطالعہ ہیں۔

[5] ملاحظہ ہو مقالہ علم الکتابت یا ابجد کی تاریخ از مولانا عبدالرزاق مشمولہ ماہنامہ "زمانہ" کانپور، جوبلی نمبر بابت فروری ۱۹۲۸ء ص ۲۷، دائرہ معارف اسلامیہ ۱: ۳۳۷ نیز غرائب الجمل ص ۲۳

حساب جمل: تاریخ گوئی کی اصطلاح میں اسے (حساب ابجد کو) حساب جمل بھی کہتے ہیں۔ مگر جمل اصلاً تاریخ گوئی کا نعم البدل نہیں ہے جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا۔ یہاں لفظ جمل کی معنویت واضح کر دینا ضروری ہے لفظ جمل کے تلفظ و معنی کے بارے میں مولانا عبدالرشید ٹھٹوی اپنی مشہور لغت منتخب اللغات شاہجہانی میں لکھتے ہیں کہ:

"جمل بضم جیم و بہ تشدید و فتح میم حساب ابجد و بتخفیف (میم) نیز آمدہ چنانچہ مشہور است"[۳]

یعنی لفظ جمل جیم مضموم و میم مفتوح مشدد حساب ابجد کو کہتے ہیں۔ یہ بہ تخفیف میم یعنی بلا تشدید بھی آیا ہے جیسا کہ مشہور ہے۔ تقریباً یہی بات صاحب غیاث نے بھی لکھی ہے: جمل.... بضم جیم و تشدید و فتح میم بمعنی حساب اعداد و حروف ابجد و بایں معنی بتخفیف میم نیز آمدہ[۴] یعنی جمل میں جیم مرفوع اور میم (جُمل) بھی آیا ہے۔ ان وضاحتوں سے اندازہ ہوگا کہ اس عربی لفظ کے معنی حروف تہجی کو اعداد کے مقابل قائم کرنے کے ہیں، جیسے الف مساوی ایک اور "ب" مساوی دو اور جیم مساوی تین وغیرہ کے علی ہذا القیاس۔

جمل اور تاریخ گوئی میں فرق: تاریخ گوئی اور جمل میں فرق ہے جیسا کہ لفظ جمل کے معنی سے ظاہر ہے۔ یعنی اس (جُمل) میں ہندسوں کا کام حروف سے اور حروف کا کام ہندسوں سے لیا جاتا ہے، مثلاً رصد گاہوں میں ہندسوں میں ہندسوں کا کام حساب جُمل (حروف ابجد) سے ہی لیا جاتا ہے تاکہ ہندسوں کے محو یا مشکوک ہونے کا امکان نہ رہے۔ چنانچہ ہیئت داں ہر زیچ (Astronomical Tables) میں ستاروں کی گردش کا حساب حروف سے لکھتے ہیں یعنی انہیں اگر "۲۳" درجے اور "۲۷" دقیقے لکھنا ہوں تو "کج" اور "کز" لکھ دیا جاتا ہے تاکہ غلطی کا احتمال نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ اسے ہم تاریخ گوئی نہیں کہہ سکتے۔ اس کے برعکس تاریخ گوئی کسی واقعے کے فقرہ، جملہ یا مصرع اور بعض اوقات صرف ایک یا دو لفظ میں بیان کر دینے کو کہتے ہیں، خواہ وہ حساب جمل کے مطابق ہو یا نہ ہو، مثلاً صوری تاریخ، لیکن کسی لفظ، فقرہ، جملہ یا مصرع کے اعداد بر آمد کرنے سے کسی واقعہ کا سال ظاہر ہو تو یہ فقرۂ تاریخ یا مصرعہ تاریخ حساب

---

۳ بحوالہ غرائب الجمل صفحہ ۱۶

۴ غیاث اللغات صفحہ ۱۲۷، مطبع اودھ اخبار کانپور مارچ ۱۹۰۴ء

جمل کے مطابق قرار پائے گا۔ یعنی جس فقرہ یا مصرع میں حدوث زمان یا واقعہ وحادثہ کا وجود ہو تو اسے تاریخ گوئی کہیں گے۔ تاریخ گوئی کے تعلق سے مناسب ہوگا کہ یہاں لفظ "تاریخ" کے معنی اور اساتذہ فن کی بیان کردہ بعض تعریف ہائے تاریخ کا ذکر بھی کر دیا جائے۔

معنی و تعریف تاریخ: لفظ تاریخ عربی مصدر باب تفعیل سے ہے جس کا مادہ "ارخ" یا "ورخ" ہے عربی میں کہتے ہیں "ارّخ، یورخ، تاریخاً" یعنی تاریخ نکالنا اور "التاریخ" بمعنی وقت کا بیان کرنا یا تاریخ الشی یعنی کسی چیز کے واقع ہونے کا وقت۔[1] بعض کہتے ہیں کہ فارسی لفظ "ماہ روز" سے "مورخ" بنا اور مورخ سے "تاریخ" یا شاید "یرخ" سے[2] یہ لفظ سامی زبانوں میں مشترک ہے مثلاً عبرانی زبان کے لفظ "یارے اح" کے معنی چاند اور "یرح" کے معنی مہینہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ کے معنی کسی عصر خاص کی ابتدا کی تعیین (Era) حساب زماں، حوادث کے وقت کی دقیق تعیین [3] (Date) یا کسی واقعہ اور حادثہ کا سال بحساب جمل نکالنا یا کسی واقعہ کا ایسے لفظ یا عبارت میں ظاہر کرنا جس کے اعداد ابجد سے اس کی تاریخ نکلے یا علم کسی واقعہ اور حادثہ کا نیز کسی امر عظیم سے مدت کا تعین کرنا یا کسی چیز کے ظہور کا وقت وغیرہ یعنی اہل لغت کے نزدیک کسی چیز کے وقت پیدا کرنے کو تاریخ کہتے ہیں۔[4] اس مقام پر بعض ماہرین کی پیش کردہ تعریف ہائے تاریخ کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

(۱) صاحب ہفت قلزم کا قول ہے کہ:

(۱) "تاریخ عبارت ست ازاں کہ جہت حدوث واقعہ لفظے و مصرعے یا زیادہ کہ بحسب حروف مکتوبہ از روئے حساب جمل موافق تاریخ سال ہجری آں باشد تاریخ آں کنند"[5]

یعنی تاریخ عبارت ہے اس سے کہ اظہار واقعہ کے واسطے ایک لفظ مصرعہ یا زیادہ (الفاظ) میں

---

۱ مصباح اللغات صفحہ ۹۳۱ تا ۹۴۰ مرتبہ مولانا عبدالحفیظ بلیاوی، مکتبہ برہان دہلی طبع نہم ۱۹۹۲ء۔

۲ ملاحظہ ہو مقالہ "واقعات نبوی میں توقیتی تضاد اور اس کا حل" از اسحق النبی علوی رامپوری مشمولہ ماہنامہ "برہان" دہلی جون ۱۹۶۴ء صفحہ ۳۳۰/۱۰ بحوالہ تاریخ طبری۔

۳ دائرۂ معارف اسلامیہ ۶: ۷۳ مدیر شیخ نذیر حسین زیر اہتمام دانش گاہ پنجاب لاہور طبع اول ۱۹۶۴ء۔

۴ رک: لغات کشوری، جامع فیروز اللغات، لغات ہیرا، مہذب اللغات ۳: ۲۱ گلبن تاریخ از میر مہدی حسین رضوی الم حیدر آباد دکن ۱۳۱۳ھ، عندلیب تواریخ مؤلفہ و مصنفہ سید مسعود حسن مسعود ادارہ انیس اردو الہ آباد اول ۱۹۶۳ء وغیرہ

۵ ہفت قلزم مرتبہ اوحدالدین بلگرامی بحوالہ غرائب الجمل صفحہ ۱۴۵

حروف کتوبی کی رو سے حساب جمل کے موافق تاریخ سال ہجری میں بیان کرے، یہی تاریخ ہے۔

(۲) صاحب معدن الجواہر مولانا نجم الدین حسن افضل مدراسی کے بقول

"تاریخ نام صنعتی ست از صنائع علم بدیع وایں عبارت ازاں کہ متکلم بیان کند سال ہجری یا سال دیگر را برائے وقوع امرے بلفظے یا فقرۂ یا مصرعے یا زیادہ ازاں کہ اعدادش بحسب موافق سال مذکور باشد۔[۱]

یعنی تاریخ علم بدیع کی صنائع میں سے ایک صنعت کا نام ہے اور یہ عبارت ہے اس سے کہ متکلم (تاریخ گو) سال ہجری یا کسی دیگر سال (سنہ) میں کسی امر کے وقوع کے لئے ایک لفظ یا فقرہ یا ایک مصرع یا زیادہ (الفاظ کے مجموعے) کے اعداد بحساب جمل سال مذکور کے مطابق ظاہر کرے۔

(۳) طائس ولیم بیل تاریخ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

باید دانست کہ تاریخ صنعتی است کہ آں تعین بسال است خواہ آں سال ہجری باشد خواہ عیسوی یا فصلی یا ہندی یا سال الہی۔۔۔[۲]

یعنی جاننا چاہئے کہ تاریخ ایک صنعت ہے جو سال کے ساتھ معین ہے چاہے وہ سال ہجری ہو عیسوی یا فصلی یا جلالی یا سال الہی۔۔۔۔۔

(۴) مولوی حکیم میر نادر علی رعد حیدر آبادی کہتے ہیں کہ:

بداں کہ در لغت اظہار وقت وقوع شئے را گویند ودر اصطلاح مورخین انعقاد ابتدائے مدت وقائع وسوانح روزگار مثل تہنیت وتعزیت را نامند۔[۳]

یعنی معلوم ہو کہ تاریخ لغت میں کسی چیز کے واقع ہونے کے وقت کے اظہار کو کہتے ہیں اور تاریخ گویوں کی اصطلاح میں زمانے میں رونما ہونے والے واقعات وسانحات جیسے تہنیت (مبارکباد دینا) وتعزیت (ماتم پرسی کرنا) کے وقوع کی ابتدا سے مدت کے تعین کے نام کو (تاریخ) کہتے ہیں۔

(۵) محمد نجف علی خاں مراد آبادی کے نزدیک:

۱۔ بحوالہ غرائب الجمل صفحہ ۱۴۴

۲۔ مفتاح التواریخ دیباچہ صفحہ ۳ مطبع منشی نول کشور کانپور نومبر ۱۸۶۷ء

۳۔ مرآۃ الخیال صفحہ ۳، مطبع فخر نظامی حیدر آباد دکن ۱۳۱۳ھ / ۱۸۹۵ء

موت و تولد و جنگ وغیرہ امور عظام کے سن یاد رکھنے کو کوئی جملہ یا مرکب ایسا بنا لیتے ہیں جس کے حروف کے اعداد مل کر سن معلوم کے برابر ہو جائیں[1] تاریخ کہلاتی ہے۔

(۶) حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی کے مطابق:

"تاریخ گویوں کی اصطلاح میں تاریخ کسی امر عظیم اور واقعہ قدیم و مشہور مانند کسی بادشاہ کی سلطنت یا کسی فتنہ یا فساد و جنگ و کارزار یا شادی و مرگ یا بنائے عمارت و باغ وغیرہ دیگر سوانح روزگار کی ابتداء کی مدت کے متعین کرنے کو بولتے ہیں۔[2]

(۷) مولانا غلام امام شہید الہ آبادی کے بقول:

"تاریخ اوسکو کہتے ہیں کہ ایک لفظ یا فقرہ خواہ مصرعہ یا شعر ایسا تجویز کیا جائے کہ اس کے مکتوبی حروف کے عددوں سے سنہ اور حال کے واقعہ وفات اور نکاح خواہ تولد فرزند یا تصنیف کتاب خواہ لڑائی کی فتح بادشاہ کے جلوس یا کسی امر کے وقوع کا زمانہ سمجھا جائے۔"[3]

تقریباً ان ہی الفاظ میں تاریخ کی تعریف میر مہدی حسین رضوی الم، شمس العلما نواب عبدالعزیز والا مدراسی، منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی، مولوی نجم الغنی، محمد عبدالقادر بنارسی اور مولانا میر نذر علی درد کاکوروی وغیرہ نے بیان کی ہے۔[4] یہاں ان سب کا ذکر موجب طوالت ہوگا البتہ دورِ حاضر کے ایک ناقد ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے درج ذیل اقتباس کا مطالعہ ضروری ہے وہ لکھتے ہیں:

"اصطلاح میں کسی لفظ، لفظوں کے مجموعے، فقرے، عبارک، مصرعے، شعر، عبارت کے کسی ٹکڑے یا اشعار یا شعر کے کسی جزو کی مدد سے سن (سنہ) ہجری یا عیسوی میں کسی واقعہ کے ظہور میں آنے کی تاریخ نکالنے کو تاریخ گوئی یا فنِ تاریخ گوئی کہتے ہیں۔[5]

(باقی آئندہ)

---

[1] رسالہ قواعد فارسی (صرف و نحو) صفحہ ۱۹

[2] افادۂ تاریخ صفحہ ۸ مطبع جعفری لکھنو ۱۳۰۳ھ / ۱۸۸۵ء

[3] انشائی بہار بے خزاں صفحہ ۱۶ مطبع جوہر ہند چپل مہادیو [illegible]

[4] ملاحظہ ہوں: تلبین تاریخ صفحہ ۴، غرائب الجمل صفحہ ۱۲۳، ملہم تاریخ صفحہ ۶، بحر الفصاحت صفحہ ۹۱۵ مطبع منشی نول کشور لکھنو ۱۳۳۵ھ / ۱۹۱۷ء، رہنمائے تاریخ اردو (علم تواریخ) صفحہ ۹ معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۳۸ء اور مقالہ فن تاریخ گوئی مشمولہ "شاعر" آگرہ بابت ۱۵ اگست ۱۹۳۱ء صفحہ ۸ / ۱۳۵۷ھ

[5] فنِ تاریخ گوئی اور اس کی روایت از ڈاکٹر فرمان فتحپوری صفحہ ۵، سنگ میل پبلکشنز لاہور ۱۹۸۴ء

R.N.I REGN. NO. 965/57 Price Single Copy :Rs.6/= Nov.Dec.1999

BURHAN (Monthly)

Edited by Amidur Rehman Usmani

4136, Urdu Bazar ,Jama Masjid Delhi-110006 Phone : 3262815